(الیکسا ندر سرگے یئ وچ پوشکن کی زندگی اور فن کا مطالعہ)

ظ انصاری

ترقّی اُردو بورڈ، نئی دہلی

پہلا ایڈیشن 1976 (1898)

A.C. PUSHKIN

قیمت: 12 روپے

سرِورق کی پُشت: پوشکن کا مکان، لینن گراد

پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اُردو نے راکیش پریس A-7 نرائنا انڈسٹریل ایریا، فیز II نئی دہلی
سے چھپوا کر ترقی اُردو بورڈ، ویسٹ بلاک 8 راما کرشنا پورم نئی دہلی 110022 کے لیے شائع کیا۔

پوشکن

ترتیب

پیش لفظ

کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں مختلف سائینسی، علمی اور ادبی کتابیں لکھی جائیں اور دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے شائع کیے جائیں۔ یہ نہ صرف زبان کی ترقی کے لیے بلکہ قوموں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اُردو میں اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابوں، بچّوں کے ادب، لغات اور سائینسی کتابوں کی ہمیشہ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ حکومتِ ہند نے کتابوں کی اس کمی کو دور کرنے اور اردو کو فروغ دینے کے لیے ترقیِ اردو بورڈ قائم کر کے اعلا پیمانے پر معیاری کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے، جس کے تحت مختلف سائینسی و سماجی علوم کی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کے ساتھ لغات، انسائکلوپیڈیا، اصطلاحات سازی اور بنیادی متن کی تحقیق و تیاری کا کام ہو رہا ہے۔

ترقی اردو بورڈ اب تک بہت سی نصابی کتابیں، بچّوں کے ادب، علمی، ادبی اور سائینسی کتابیں شائع کر چکا ہے جنھیں اردو دنیا میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے، یہاں تک کہ بعض کتابوں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی شائع ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی اشاعتی پروگرام کا ایک حصّہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسے بھی علمی اور ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

(ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عباس شارب)
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اردو،
وزارتِ تعلیم اور سماجی بہبود، حکومت ہند

پہلا ورق

موجودہ روس کو سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ روس کے اُس دَور سے جانکاری حاصل کی جائے جو نئی اُمنگوں کا دَور ہے، جب روس نے جدید تہذیب کی آغوش میں کُلبُلانا اور پھر مُسکنا شروع کیا۔ جب اُس نے اپنا رنگ رُوپ نِکالا۔

نہ کوئی سماجی نظام کسی قوم یا مُلک کو جنم دیتا ہے، نہ کوئی قوم کسی سماجی نظام کو بے سبب اور ناگہاں اپناتی ہے۔ روس کارل مارکس کی تعلیمات سے پہلے ہی تاریخِ عالم میں اہم رول انجام دینے کے قابل ہو چلا تھا؛ زمین ہموار ہو رہی تھی اُس دن کے لیے جب مارکسی فکر زبردست عالمی عمل کی شاہراہ یہاں تعمیر کر سکے۔ اور جب وہ تعمیر ہونے لگی تو اس میں ۱۹ ویں صدی کے روسی دانش وروں، شاعروں، ادیبوں، انقلابیوں، آزاد خیالوں اور رجعت پسندوں کا لہو پسینہ بھی مِلا۔ قومی عادتوں، خوبیوں اور خامیوں، ارادوں اور تمنّاؤں کی کنکریٹ بھی رِل مِل گئی۔

شاہراہیں، بہر حال، کاغذ پر کے نقشے سے نہیں، اس کچّے مال سے، اس سامگری سے بنتی ہیں جو کسی مقام پر پہلے فراہم ہو چکا ہو یا فراہم کیا جا سکے۔

کسی انقلاب کو، جس طرح محض معاشی یا مادّی اسباب کی چھان بین کے ذریعے پُورے طور پر نہیں سمجھا جا سکتا، اس کے لیے افراد کے شعوری عمل، تہذیبی اور فنّی کارناموں کی رَو کو بھی جاننا ضروری ہے۔ ٹھیک اسی طرح روس میں اور روس پر، ۱۹۱۷ء کے انقلابِ عظیم کے وقت اور اس کے بعد جو کچھ گزری، اس کی تہیں سَو برس پہلے ٹٹولنی ہوں گی۔

پوشکن کی مختصر سی، لیکن بھرپور، رنگا رنگ، بیقرار اور مردانہ وار زندگی کے ساتھ اس کے فن کا، کاوشوں، رنجشوں اور سازشوں کا مطالعہ کرتے وقت دراصل ہم پورے ایک دَور کی تہذیبی زندگی اور ذہنی پیچ و تاب سے روشناس ہو جاتے ہیں؛ ہم ایک بڑے شاعر یا اُس کی شاعری اور طرزِ بیان سے ہی آگاہ نہیں ہوتے ــــــ بلکہ اُس پسِ منظر میں جھانک لیتے ہیں جس پر اگلی نسلوں نے سوانگ رچایا۔ خاص انھی معنوں میں بڑا فنکار اپنے وقت کا ترجمان اور آنے والے عہد کا اعلانچی ہوتا ہے ــــــ کوئی اہم تاریخی دَور ایسی ہستی سے خالی

نہیں جاتا۔ پوشکن ایک نام نہیں، گویا ایک علامت ہے اس تاریخی ادبی کارنامے کی۔

اُردو ہی نہیں، بلکہ کسی بھی ہندوستانی زبان میں ابھی تک پوشکن کا کلام یا اس کی حیات و فن پر قابلِ ذکر کام سامنے نہیں آیا ہے۔ اس اعتبار سے (الفضلُ لِلمتقدِم) جیسا کچھ مسودہ تیار ہوا۔ اِسے نقشِ اوّل ہی سمجھنا چاہیے۔ پروفیسر محمد مجیب نے اپنی اہم اور قابلِ قدر تصنیف روسی ادب (جلد اوّل) میں پوشکن پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا، اسی کو پڑھ کر ۲۰ برس پہلے مجھے بھی شوق ہوا۔ شوق میں غیر علمی مصروفیات بھی حائل ہوتی گئیں اور بے دلی بھی؛ وہ تو کہیے ماسکو نے مجھے ضمناً ایسے اسباب فراہم کر دیے تھے جو ۸ ہزار مصرعوں کا منظوم ترجمہ کرسکا۔ اور انھی میں کمی بیشی کرکے یہاں کام نکال لیا۔ ورنہ ہماری خوبصورت، رسیلی اور جاندار زبان میں شعری ترجمہ جتنا کمیاب ہے، اُتنا ہی بے وقعت بھی شمار ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ یہاں شکسپیر اور ملٹن کب سے پڑھے اور پڑھائے جارہے ہیں —— مگر اُن کے کتنے منظوم تراجم موجود ہیں، نہیں ہیں تو کیوں؟ اور ہو جاتے تو ہماری زبان کی کتنی ہی بے سبب، نام نہاد "تخلیقات" سے بہتر اور کارآمد ثابت ہوتے۔ دعوا تو نہیں، البتہ یہ جتادوں کہ ایک آدھ مقام چھوڑ کر کہیں بھی مجھے پوشکن کے خیال، مصرعے، الفاظ کے پہلو اور رنگِ سخن کو کترنے یا بدلنے کی مجبوری پیش نہیں آئی اور اپنی منظوم زبان کے بل پر شاعر کے ساتھ سائے کی طرح چلتا گیا ہوں۔ (سائے اور اصل ہستی کا فرق تو ظاہر ہی ہے!)

میں اپنی اس چھوٹی سی، مگر چہیتی کتاب کو "پوشکن شناسی" کا نام دینا چاہتا تھا اور ان کشمیری دوستوں اور مہربانوں کے نام انتساب کرنے کا آرزومند تھا جنھوں نے ۷۴ء کی گرمیوں میں اپنے یہاں گوشہ اور توشہ مہیا کرکے برسوں کی محنت کا خلاصہ یکجا کرنے کی سہولت عطا کی، لیکن یہ دونوں باتیں اشاعتی ادارے کے مقررہ اصول اور پالیسی کے خلاف ہیں۔ مجبوری! تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر ترقی اُردو بورڈ کا وجود یا اصرار نہ ہوتا تو نہ ان صفحات کے لکھنے کی باری آتی، نہ چھپنے کی۔

جن صاحبوں کو کتاب کے دسوں باب پڑھنے کی فرصت یا ہمت نہ ہو، اگر وہ پہلا اور دوسرا ضمیمہ ہی دیکھنے پر اکتفا کریں تب بھی اپنی توجہ کا مناسب صلہ پائیں گے، کیوں کہ تصنیف کا کچھ نہ کچھ مقصد یوں پورا ہو جاتا ہے۔ اور مقصد یہ کہ شاعر، اس کے ذہن، دور، تخلیقی عمل، دوست، دشمن، اثرات، پابندیوں اور آزادیوں کی ایسی رُوپ ریکھا دے دی جائے کہ پڑھنے والا ایک فنکار کی معرفت تمام کھلی اور ڈھکی فضا کا صحیح اندازہ کرلے۔ بس!

ظ انصاری

پہچان

.... بعض اوقات گھوڑا سواری کرتے دیکھا گیا اور منزل پر پہنچ کر اپنے آدمی سے کہتا ہے کہ "گھوڑے کو کھلا چھوڑ دو .... ہر ایک حیوان کو آزادی کا پورا حق حاصل ہے ...."

(پوشکن کے چال چلن کے بارے میں ۱۸۲۶ء میں سرکاری مخبر کی خفیہ رپورٹ کے جملے)

پوشکن کا خود اپنے قلم سے بنایا ہوا اسکیچ
جب فکر کے دوران کاغذ پر اُترا

پہلا باب

پیدائش خاندان بچپن ماحول مشقِ سخن

جمعرات کو ۲۵ اور ۲۶ مئی (۱۷۹۹ء) کی درمیانی شب میں ماسکو کے ایک پُرانے منصب دار خاندان میں سرگے ئی لووِچ پوشکن کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا[1]۔ محلّہ، نی متیسکایا اولِتسا[2] میں جو پُرانے ماسکو میں اشراف کا محلّہ شمار ہوتا تھا[3]۔ باپ کا خاندان اگرچہ بکھر چکا تھا اور زیادہ تر مقروض رہتا تھا —— اب بھی ہزار کیروں کی جاگیر اس کے تصرف میں تھی[3] اور "پوشکن" نام روس کی تواریخ میں درج تھا۔ ماں نے ٹیراداسی یوونا جہیز میں

---

[1] ۱۹ ویں صدی کی کتابوں میں ۲۶ مئی لکھا ہے۔ پرنس میرسکی نے ۲۵ مئی لکھی ہے۔ زیلینسکی نے ۱۹۰۲ء کی شائع شدہ تحقیقی تالیف میں ۲۶ مئی لکھنے کے بعد یہ بھی بتایا کہ وہ مذہبی تیوہار کا دن تھا۔ نئے اور موجودہ کیلنڈر کے مطابق یہ تاریخ ۶ جون ۱۷۹۹ء ہے، چناں چہ اسی روز پوشکن کا جشن منایا جاتا ہے۔

[2] "نی متسکایا" یعنی جرمن۔ روس میں والگا دریا کے کنارے اور بڑے شہروں میں جابجا جرمن آباد تھے۔ کاروباری، ڈاکٹری پیشہ اور کاری گر۔ "نی موئے" مِنی گو نگا (بکم) جرمن چوں کہ اپنے لہجے میں ٹوٹی پھوٹی روسی بولتے تھے، روسیوں نے انھیں نیم تسی (عجمی) لقب دیا۔ اور ان سے نسبت رکھنے والی ہر چیز "نی متیسکی" کہلائی۔ آجکل "نی متیسکا یا سڑک کا نام کمیونسٹ لیڈر "باؤمن" سے منسوب ہے اور اب بھی اس علاقے میں بڑے بڑے شاندار مکان کھڑے ہیں۔

[3] "کیرے" کے لیے اُردو میں رعایا، نیم غلام کسان اور انگریزی لفظ Serf بھی لکھا جاتا ہے۔ ہندوستان کے جاگیرداری نظام میں اس طرح کے کیرے نہیں ہوتے تھے جنھیں زمین یا جاگیر کے ساتھ، بال بچّوں سمیت خریدا بیچا جاسکے، اس لیے کوئی صحیح لفظ موجود نہیں۔ کیرے بھی گویا جائداد کا ایک حصّہ تھے اور انھی "نفوس" یا "جانوں" کی گنتی کے حساب سے ریاست کی حیثیت اور مالیت مقرر ہوتی تھی۔

Sertdom کا یہ نظام روس میں ۱۶۴۹ سے باقاعدہ قانونی اختیارات کے ساتھ قائم ہوا اور بغاوتوں، سازشوں اور احتجاجوں کے دو صدی طویل سلسلوں کے بعد ۱۸۶۱ء میں منسوخ کیا گیا۔ کھیت مزدور، کاشتکار اور جاگیردار ایک دوسرے سے آزاد ہونے لگے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی کی راہ کھُلی۔

"میخائیلوفسکی" گاؤں لے کر اس خاندان میں آئی تھی، ماں اور نانی اس جاگیر کی دیکھ بھال کرنے کے لیے زیادہ تر وہیں دیہات میں رہا کرتی تھیں۔ پوشکن کے پرنانا، ماں کے دادا ابراہیم ہنی بال، ابی سینیا سے لائے ہوئے کوئی سیاہ فام غلام تھے جو ترکوں کی طرف سے شہنشاہ پتیر اوّل (پیوتر پیروی) (Пётр червый) کو تحفے میں بھیجے گئے تھے۔ شہنشاہ نے انھیں اپنے دامنِ تربیت میں پروان چڑھایا اور جرمن نژاد روسی خاندان میں ان کی شادی کر دی۔[5] پے در پے تین نسلوں میں خون کی آمیزش سے اگرچہ رنگ نکھر گیا تھا۔ خد و خال میں ایک دلکشی ابھر آئی تھی۔ تاہم گھونگھریلے بالوں کی سیاہی، آنکھوں کا رنگ اور ہونٹوں کی دبازت، مزاج کی حدت اور پسند ناپسند کی شدت ماضی کے آثار محفوظ کیے ہوئے تھی۔ خاندانی پادری اور اہلِ ذوق دوستوں کی ایک گھریلو محفل میں بچے کا نام رکھا گیا —— الیکساندر۔ یہی الیکساندر سر گے ئی وچ پوشکن، اس کی زندگی اور کارنامے ان اوراق کا موضوع ہیں۔

ماں ایک خرچیلی اور تنک مزاج خاتون تھیں جنھیں اپنی پہلوٹی کی لڑکی "اولیا" سے زیادہ پیار تھا۔ باپ کا رکھ رکھاؤ، بزم آرائی، اور نفاست پسندی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ بے پروائی سے بڑی ہوئی جاگیر کی آمدنی کفالت نہ کرتی تھی۔ عمر کے ساتھ وہ چڑچڑے ہو گئے اور بچوں کے معاملے میں بے فکر۔ گھر بار نوکر چاکر کے ہاتھ میں تھا۔ بچوں کی پال پوس ایک دیہاتی ملازمہ "اریناردیونوانا" کے ذمے۔ جسے گھر میں سب "اریشا" کہتے تھے۔ اسی اریشا نے الیکساندر کی ماں کو بھی پال کر بڑا کیا تھا۔

گھر میں نہ کسی نوکر پر مار پڑتی تھی، نہ کسی کا حساب کتاب رکھا جاتا تھا۔ نانی کبھی کبھی دیہات سے شہر آتیں تو تحفوں سے لدی پھندی آتیں اور رقم خرچ کر کے چلی جاتیں۔ "ارلیشا" کے بعد دونوں بچے اگر کسی سے مانوس تھے اور گرمیوں میں کسی کے پاس جانے کی ضد یں کرنے لگے تو وہ یہی نانی تھیں ماسکو سے ۳۰ کوس پر "زخاروف" گاؤں کی جاگیر دار —— جن کی زندگی شوہر کی طرف سے دکھی اور اداس گزری۔

پوشکن کے چچا وسیلی لووچ بڑے ٹھسے کے امیر تھے۔ انھیں شعر و شاعری کا، جملہ بازی، پھبتی، لطیفہ گوئی کا بھی شوق تھا اور اوپر کے ادبی حلقوں میں رسم و راہ رکھنے کا بھی۔

---

[5] پوشکن کا کہنا ہے کہ وہ ایک شہزادے تھے جنھیں ترکوں نے شاہی تحفے کے طور پر نذر کیا۔ پوشکن نے اسی تخیل یا نیت سے ایک نیم تاریخی ناول لکھنا شروع کیا تھا "پتیر اعظم کا خادمِ خاص"

اسی لیے انھیں پوشکن ابراہام فیوترووچ لکھا ہے، یعنی ابنِ پیوتر۔

بھر میں فرانسیسی ادبیات، شاعری، فلسفے اور تاریخ یوروپ کی کتابوں سے الماری بھری پڑی تھی۔
الیکسانڈر ــــــ جسے گھر میں پیار سے "ساشا" کہتے تھے، ابھی ڈیڑھ سال کا تھا۔ پورا خاندان پیٹرسبورگ میں اس کی نانی کے ہاں مہمان آیا ہوا تھا۔ "اریشا" بچے کو گود میں لیے شاہی باغ میں گھومنے نکلی۔ اتفاق کی بات، سامنے سے بادشاہ سلامت پاول اوّل ٹہلتے ہوئے چلے آئے۔ بوڑھی دیہاتی خادمہ بادشاہ کو دیکھ کر ایسی سٹ پٹائی کہ خود تو سر جھکا کر وہیں رہ گئی لیکن ایک ٹوپی سر سے نہیں اُتری۔ دودھ پیتے بچے کے سر کی ٹوپی۔ بادشاہ نے یہ ننھی سی رنگین ٹوپی جھٹک کر گرادی۔ آیا لجاجت سے کہتی رہی:
حضور بے ادبی معاف کیجیے، حضور خطا ہوگئی، سرکار اس کی ٹوپی اُتارنا بھول گئی۔ بڑی بی کی زندگی کا یہ ایک ایسا تاریخی واقعہ تھا جو وہ بار بار گھر والوں کو سُناتی تھی ــــــ اور بچے کے ذہن میں یہ کہانی ــــــ اور اس کہانی میں "بے ادبی" کا پہلو، خلاف ورزی کی سزا، ٹوپی کا جھٹک کر گرایا جانا ایسا نقش بیٹھا کہ جیسے جی نہیں مٹا۔

چچا سے ملنے جلنے والوں میں ایک پختہ عمر کا شاعر ژوکوفسکی اور کانستن تین باتیوشکوف اور نوجوان شاعر اور یوروپی ادب و تاریخ پر نظر رکھنے والا سنجیدہ شخص، ایک اور نوعمر شاعر پرنس ویازیمسکی اکثر آیا کرتے تھے۔ ادب، فلسفے اور تاریخ کی باتیں چلتی تھیں۔ باتوں باتوں میں پتہ چلتا کہ ژوکوفسکی ایک عاشقِ ناکام ہے اور مختصر غنائی نظموں میں "کسی" کو خطاب کیا کرتا ہے۔ ویازیمسکی کی زبان پر مولییر، روسو اور والیتر کا نام آتا اور "سلاویان" کے ذکر پر بحث چھڑ جاتی۔ روس کے پہلے اور مستند مورخ کرامزین ایک روز مدعو تھے۔ گھر کے چھوٹے بڑے سب جمع ہوگئے۔ ان کا بڑا احترام کیا گیا۔ انھوں نے اپنی تاریخ کا ایک باب پڑھ کر سُنایا (اس تاریخ میں ایک باغی منصبدار پوشکن کا بھی ذکر آیا ہے) سب نے ادب سے سُنا[1]۔
اس زمانے کی ایک مشہور شخصیت ایوان ایوانووچ دمیتروف تھے، شاہی وضع قطع کے آدمی ــــــ شیخ سعدی کے طرز کی حکایات لکھا کرتے اور آخر میں کوئی اخلاقی نتیجہ نکالتے۔ پاٹ دار آواز، بھاری بھرکم، سرپرستانہ انداز، شہنشاہ تک ان کی رسائی تھی۔
ان کی حکایات کے مقابلے میں کری لوف کی سادہ، بے تکلف حکایتیں الیکسانڈر کو زیادہ پسند آتی تھیں۔
گھر کا فراش نکیتیا بھی جھاڑ پونچھ کرتے وقت کچھ نہ کچھ گنگنایا کرتا تھا۔

---

[1] ناموں اور شخصیتوں کے لیے دیکھیے ضمیمہ ۱

"کیوں رے نکیتیسا، آج کوئی نئی تک بندی کر ڈالی کیا؟" باپ یا چچا اپنے اس پرانے ملازم سے چھیڑ خانی کیا کرتے۔ الیکساندر کو مردنوکروں میں یہی خوش مزاج "شاعر" پسند تھا۔

گُل گوتھنا، کم سخن، لیبیچڑ سا الیکساندر اس ماحول میں سات برس کو پہنچا تو اس کے ایک بھائی پیدا ہوا، جس کا نام رکھا گیا لیو اور سب اسے پیار سے "لیوشکا" (Лёшка) کہنے لگے۔ الیکساندر کو گھر میں اپنی "بزرگی" کا احساس ہونے لگا۔ اس کی زبان کھُل گئی، اسے نت نئی شرارتیں سوجھنے لگیں۔

معزز ہستی ویترووف نے ایک روز گھونگھریالے بالوں کے اس سانولے لڑکے کو نظر بھر کے دیکھا تو بے ساختہ بولے: دیکھنا ذرا، سچ مچ کا عرب بچہ ہے!

الیکساندر نے جھٹ سے جواب دیا "عرب بچہ سہی، ریا بچہ تو نہیں ہوں[1]!

نہ معلوم کب اور کیسے الیکساندر نے آپ سے آپ پڑھنا لکھنا سیکھ لیا۔ باپ کی انگلی پکڑ کر جب "یوسوپوف" کے تھیٹر میں تماشا دیکھنے گیا تو خود بھی اسی وضع کے "تماشے" لکھنے لگا۔ گھر آکر ایک بڑے کمرے میں اسٹیج تیار کیا، پردہ کھینچا، پردے کے سامنے کرسی پر دو سال بڑی بہن کو "حاضرین" کی جگہ بٹھایا اور خود پردے سے باہر آکر، ہاتھ چلا چلا کر ایکٹر کے مکالمے ادا کیے۔ بہن نے بھی "معزز حاضرین" کی طرح خوب داد دی اور تالی بجا کر کہا: Fora[2] ایک بار، جن دنوں وہ شب و روز "مولیئر" کی تصانیف کی ورق گردانی کر رہا تھا، خود اسی کے ایک ڈرامے "چور" (L'escamota deMoliere) سے چُرا کر خانہ ساز اسٹیج پر پیش کر دیا۔ اور تعریف وصول کر لینے کے بعد خود ہی اقرار بھی کر لیا کہ یہ چوری کا مال تھا ——— گرمی، سردی، ہر موسم میں اسے شام کو نو بجے سونے کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا جہاں "اریشا" پرانی روسی کہانیاں سُنا سُنا کر، تھپک کر سُلا دیتی۔ لیکن ۸ برس کی عمر سے اس معمول میں خلل پڑ گیا۔ وہ سب کی نظر بچا کر، باپ کے ذاتی کتب خانے سے قصے کہانی، ڈرامے اور شاعری کی کتابیں نکال لیتا اور رات رات بھر جاگ کر انھیں پڑھا کرتا۔

۱۹ ویں صدی کے آغاز تک روس کی تعلیم یافتہ اور خوش حال سوسائٹی میں فرانسیسی زبان و ادب کا عام چلن تھا۔ گھروں، محفلوں اور رسمی موقعوں پر فرانسیسی لہجے میں فرنچ بولنا تمیز داری کی علامت شمار ہوتا تھا۔

---

[1] روسی میں یہ لفظ "اَراپ چک" (Арапчик) لکھا گیا ہے جو دراصل عرب یعنی سانولے (غلام) بچے کے لیے موزوں ہے۔ ریاب چک (Рябчик) جس کے منھ پر چیچک کے داغ ہوں۔ ویترووف کے چہرے پر تھے۔

[2] اطالوی لفظ یعنی واہ وا، بہت خوب۔

یہاں تک کہ روسی نام یا الفاظ بھی فرنچ انداز سے ادا کیے جاتے۔ بچّوں کی نگہداشت کے لیے فرانسیسی خدمتگاروں کو اچھی تنخواہ دے کر ملازم رکھا جاتا اور پھر یہ اتالیق یا آیا ئیں اسی خاندان کا ایک لازمہ بن جاتیں۔

۹ سال پورے ہونے آئے تو شرفا کے دستور کے مطابق ایک فرانسیسی پناہ گزیں گراف منفور کو الیکساندر کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ یہ مہذب شخص غالباً انقلابِ فرانس سے بچ کر ادھر آیا تھا، اور اپنے خاندانی ناک نقشے، ادب آداب پر فخر کیا کرتا تھا۔ ایک روز گراف منفور نے اپنے کمسن اور ہوشیار شاگرد کو باپ کی الماری سے والیتر کی کتابیں نکالتے، ورق پلٹتے دیکھ لیا۔ اور اُسے ڈانٹ دیا —— شام کو کھانے پر، جب الیکساندر بستر میں جا چکا تھا، فرنچ اتالیق نے ماں باپ سے شکایت کی کہ اوّل تو بلا اجازت باپ کا کتب خانہ چھونا غلط، اور پھر والیتر کا مطالعہ غلط در غلط۔ اس مصنّف نے بے دینی اور بد اخلاقی پھیلانے کے سوا نئی نسل کو اور کیا دیا؟

سرگے ئی لووِ وِچ نے کاندھے جھٹکے اور سُنی اَن سُنی کر دی۔ پھر یہ سوچ کر کہ بچّوں کی تربیت کے معاملے میں وہ خود والیتر کی آزاد خیالی کے حامی ہیں، اُلجھ پڑے۔ فرانسیسی بگڑے نواب نے بھی لہجہ سخت کیا تو روسی منصبدار کو یاد آگیا کہ چھ مہینے سے اس کی تنخواہ ادا نہیں ہوئی، یہ گرمی اِسی لیے ہے۔ گرما گرمی یہاں تک ہوئی کہ کھڑے کھڑے گراف منفور کا حساب پاک کر دیا گیا —— نقد نہیں بلکہ واجب الادا کی دستاویز لکھ کر —— الیکساندر کو یہ کاغذ آزادی کا پروانہ معلوم ہوا۔

گراف منفور کا پاپ کٹا تو جنیوا کا ایک فرانسیسی رُسلو الیکساندر کا اتالیق مقرر ہوا۔ یہ شخص آتے ہی اخلاقیات پر زور دینے لگا۔ لمبی لمبی نصیحتیں کرتا اور تمام حرکات و سکنات پر نظر رکھتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی بیاض تھی اپنے طبع زاد اشعار کی —— جس میں تعلیم و تربیت کے اصول منظوم کیے گئے تھے۔

دینیات کی تعلیم کے لیے الگ ایک پادری مقرر تھا —— بیلی کوف، جو مذہبی قصّوں کے لیے علمِ حساب بھی سکھایا کرتا تھا۔ جاڑوں کی ایک روشن صبح کو، جب بیلی کوف تختۂ سیاہ پر ارتھمیٹک کا

لہ نپولین اوّل کے حملے (۱۸۱۲ء) سے پہلے تہذیبی زندگی پر فرانس کی گہری چھاپ تھی۔ اور ٹیکنیکی علم و تجربے پر جرمنوں کی۔ روسی شرفا اپنے بچّوں کو روسی زبان و ادب پڑھانا گری ہوئی بات سمجھتے تھے۔ بیلے اور اوپیرا اٹلی سے، ڈرامہ اور کارخانہ جرمنی سے، ادب آداب فرانس سے اور فیشن انگریزوں سے سیکھے جاتے تھے۔

سبق دے رہے تھے، بارہ برس کی اُولیا اسے لفظ بلفظ نقل کر رہی تھی، الیکساندر اپنی کاپی پر، سوچ سوچ کر کچھ لکھتا جا رہا تھا۔ بچّوں کی نیم انگریز مس بیلی نے تاڑ لیا۔ جھپٹ کر آئی اور لڑکے کے ہاتھ سے کاپی چھین کر موسیو رُسلو کو دکھا دی۔

رُسلو نے کاپی کے ورق پلٹے، منھ بنایا۔" اچھا، بالشت بھر کے لڑکے، اور ابھی سے مذہب و اخلاق کا مذاق اڑاتے ہو ـــــ شاعری بگھارتے ہو!"

کاپی چولھے میں جھونک دی گئی۔ اور الیکساندر برآمدے میں ایک پرانے صندوق پر بیٹھ کر رونے اور دانتوں سے اپنے ناخن کترنے، انگلیاں چبانے لگا۔ باپ کو شکایت گئی۔ انھیں افسوس ہوا کہ نہ جانے اس شاعری میں کیا کچھ ہوگا۔ پہلے دیکھ لینا چاہیے تھا۔ ماں نے بیٹے کو بلا کر ڈانٹا کہ لکھنے پڑھنے میں دل نہیں۔ اوپر سے شاعری جیسی فضولیات میں پڑے ہو۔ بڑوں کا ادب نہیں کرتے۔ اُستاد عاجز ہیں۔

موسیو رُسلو مایوس ہو کر چل دیے۔

تیسرے اتالیق کسی عالی خاندان کی سفارش پر بلائے گئے موسیو شیدیل۔ انھوں نے آتے ہی روک ٹوک اٹھا دی۔ لاطینی کے سبق بند کر دیے۔ فرانسیسی گرامر کتاب دیکھ کر پڑھانے لگے۔ لکھنے پڑھنے سے خود اتالیق کو بھی کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔

الیکساندر تو اس بے تکلف اور بے نیاز اُستاد سے خوش رہتا لیکن ایک واقعے نے سارے معاملے کی پول کھول دی۔ ہوا یوں کہ دیواری گھڑی بگڑ گئی۔ اس سے پہلے کہ مستری بلایا جائے، موسیو شیدیل اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئے اوزار کا تھیلا نکالا اور گھڑی کے کل پرزے درست کر دیے۔ ہنر چلا کہ تعلیم تو برائے نام پائی لیکن گھڑی سازی جانتے ہیں۔ بچّوں کے بجائے، اب تک گھڑیوں کی مرمّت کرتے رہے ہیں۔ یہاں کبھی فرصت کے اوقات میں نوکروں سے تاش کھیلا کرتے تھے۔ ہاتھ کے ہاتھ ان کی چھٹی کر دی گئی۔ (د۔ک ۱۸۔ باب اوّل و دوم)

تین رنگا رنگ اتالیقوں کی سرپرستی سے گزر کر اب الیکساندر خود مطالعے میں، اور جو کچھ پڑھتا، سنتا یا سمجھتا، اس کے تقلیدی رنگ لے کر کچھ نہ کچھ لکھ لینے میں محو ہو چکا تھا۔ چچا اُسے شوق سے اپنا کلام دیتے، پڑھنے کی مشق کراتے اور حوصلہ بڑھاتے۔

ایک روز گھر کی ادبی محفل میں، جب ژوکوفسکی موجود تھے، چچا نے اس کی "حکایت نویسی" کا راز افشا کر دیا:

لیجیے! یہ بچہ ابھی سے حکایات لکھتا ہے، وہ بھی اُستادانہ رنگ میں، اخلاقی نتیجے پر تمام ہوتی ہیں اس کی حکایتیں ____ سُنیے!

الیکساندر کو شرارت سوجھی۔ اس نے خود تصنیف حکایت سُنانے کے بجائے شاعر چچا کی ایک نظم دھڑتے سے، شان سے، پورے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ سُنا دی۔ تمام حاضرین نے داد دی۔

باپ خوش تو ہوئے مگر شکایتی لہجے میں بولے:

بہت خوب! مگر دیکھیے، روز شکایتیں آتی ہیں۔ سبق یاد نہیں کرتا۔

ژوکوفسکی، باپ اور چچا کے ہم عمر اور ہم عصر اس لڑکے کی جرأت سے، اداکی سے خوش ہوئے۔ قیافے سے اس کا شعری ذوق دریافت کر لیا اور رخصت کرتے ہوئے بولے:

صاحب زادے، لکھا کرو۔ ضرور لکھا کرو۔ مگر دیکھو، اپنے چچا کے نقشِ قدم پر چلنا، میرے مال پر ہاتھ نہ ڈالنا۔ یہاں کیا دھرا ہے، بھوت پریت، آسیبی روحیں!

عمر اور علم میں پوشکن سے ایک نسل آگے کے یہی ژوکوفسکی آخر میں اس کے ہم قلم اور بہترین دوست ثابت ہوئے۔

فرانسیسی ادب محض آزادہ روی اور روشن خیالی سکھانے والا نہیں، ہیجان انگیز اور جنسی کُرید لگانے والا بھی تھا۔ الیکساندر کو یہ کُرید قبل از وقت لگ گئی۔ مزاج کی شدت پہلے سے اس کے لیے آمادہ تھی۔

باپ اور چچا ماسکو کے امرا کی محفلوں میں خاص طور سے بُلائے جاتے تھے۔ انھیں دس گیارہ برس کے بچے کی نصابی تعلیم سے زیادہ اُسے آدابِ محفل سکھانے کی فکر رہتی تھی۔ بال روم ڈانس کی تربیت دینے میں "یوگل" نام کا ایک اُستاد ماسکو بھر میں مشہور تھا۔ الیکساندر ہر جمعرات کی شام بہن اُولیا کے ساتھ وہاں ڈانس سیکھنے لایا جاتا۔ مہینوں یہ مشق چلتی رہی۔ لڑکا چُست اور ہوشیار ہو گیا، لیکن "والز" ناچ کا غنائی آہنگ اس کی شاعرانہ طبیعت کو زیادہ راس آیا، اور وہ اپنے ہم عمروں میں "والز" خوب ناچنے لگا۔

بال روم ہو یا گھر کی لائبریری، فرنچ گفتگو، فرنچ آداب، فرنچ تکلفات میں رس بس جانے کے بعد بظاہر ہونا یہی چاہیے تھا کہ وہ فرنچ میں طبع آزمائی کرے۔ ہوا بھی یہی، لیکن دو اور روشندان تھے۔ اس کی گھریلو زندگی میں، جن سے گرمی اور روشنی چھن کر آتی تھی: ایک تو بوڑھی "اریتا" کہانیاں، گیت اور

پُرانے قصّے اپنی سادہ دیہاتی روسی زبان میں سُنانے والی "اریشا" جسے الیکساندر پیار سے "ماموشکا" (پیاری میّا) پکارتا تھا ـــــ دوسرے نانی جن میں افریقی خون کی حدّت، ماماتا کی صداقت باقی تھی اور جن کی جاگیر "زخاروف" میں کسانوں اور قصباتی شرفا کے بچّے روسی بولتے اور گاڑھے روسی مذاق کیا کرتے تھے۔ جب تک الیکساندر ماں باپ کے گھر میں رہا، ہر سال نانی کے گاؤں جاتا رہا۔[۵] اسکول کی عمر آنے تک اس میں روسی زبان کی موسیقی، سادگی، قوت اور ضرورت کا شعور پیدا ہو گیا۔

گھر کا فراش نکتیا بھی اس شریر اور ذہین لڑکے سے خاص طور پر مانوس تھا اور فارغ البال، بے اہل وعیال چچا کی نظرِ عنایت بھی کم از کم والدین سے کچھ زیادہ ہی تھی، جو بھتیجے کے شاعرانہ جوہر کی قدر کرنے لگے تھے۔ یہ ارضی کشمش بالآخر فیصلہ کُن ثابت ہوئی۔ اور الیکساندر پشکن نے منظوم پھبتی (ایپی گرام) کامیڈی اور ابتدائی نظموں کے لیے اسی زبان کو چُنا جو دو نسل پہلے تک دو کوڑی کی سمجھی جاتی تھی۔

---

[۵] بعد میں یہ گاؤں بک گیا، اور پشکن کو عمر بھر اس کی یاد ستاتی رہی۔

دوسرا باب

شاہی بورڈنگ اسکول

درسی نظام　　　　نئی روشنی

الیکساندر بارہ برس کا ہوا تو ماں باپ نے سوچا کہ اُسے اور "شریف زادوں" کی طرح مسیحی مِشن (Jesuit) اسکول میں داخل کر دیا جائے، لیکن انھی دنوں تعلیمی دُنیا میں ایک ایسا واقعہ ہوگیا جو آج تک پوشکن کے سوانح نگاروں میں بحث اور تحقیق کا موضوع بنا ہوا ہے۔ یہ واقعہ تھا شاہی گرمائی محل "زار سکوئے سَلُو"[1] کے پہلو میں خاص بورڈنگ اسکول (Лицей یا Lyceum) کا قائم ہونا۔ جہاں چھ سال کے دوران ثانوی اور اعلا تعلیم مکمل کرنے کا نصاب بنایا گیا تھا۔

۱۳ اگست ۱۸۱۰ء کو سرکاری اعلان شائع ہوا تھا کہ شاہی خاندان اور امرا کے بچوں کو اعلا تعلیم دینے کی غرض سے ایک ایسا اسکول قائم کیا جاتا ہے جہاں صرف چُنے گئے طالب علم لئے جائیں گے اور چھ سال کا کورس مکمل کر لینے کے بعد وہ اعلا انتظامی عہدوں کے امیدوار ہوں گے۔

گھر میں طے پایا کہ پائے تخت پیٹرسبورگ میں بارسوخ دوستوں کو خط لکھے جائیں اور وزیرِ تعلیم سے سفارش کرا کے وریز الیکساندر کو وہاں داخلہ دلوایا جائے۔ چند مہینے بعد جواب آگیا۔ داخلہ مل گیا۔ گھوڑا گاڑی پر پالش ہونے لگی، صندوق صاف کیے جانے لگے۔ باپ کے بجائے چچا وسیلی لووِچ نے ذمہ داری لی کہ وہ بھتیجے کو لیزیم میں داخل کرا کے، سب ٹھیک ٹھاک کر کے آئیں گے۔ دراصل انھی دنوں موصوف نے ایک مزاحیہ نظم لکھی تھی، جس میں "سلاویان" والوں پر کچھ اس قسم کے رکیک حملے کیے گئے تھے جو صرف بڑی عمر کے لوگوں کو سرگوشی میں سنائے جا سکیں۔

---

[1] Царское Село یعنی شاہی گاؤں یا شاہ دیہہ۔ یہ شاہی بستی پیٹرسبورگ سے چند میل باہر کھلے محلوں، باغوں اور سنہرے فواروں کا دلکش مقام ہے۔ اب تک وہ عمارات باقی ہیں اور ان کے پہلو میں ڈیڑھ سو برس پہلے کی یادگار، ایک بینچ پر لڑکپن کے پوشکن کا مجسمہ نصب ہے۔

"دیکھنا . . . . یہ نظم پتیرسبورگ میں پھیلتے ہی "سلاویان" والوں کا ستیاناس ہو جائے گا . . ."

الیکساندر شہر بھر میں سب عزیزوں سے ملتا پھرا۔ نانی اور "اریشا" سے گلے ملا۔ گلا رُندھ گیا۔ ماسکو سے پتیرسبورگ، گھوڑا گاڑی کا لمبا سفر، بارش کا موسم!

اس گھر میں صرف بہن اُولیا سے جُدائی کا غم تھا اور ساتھ کی کھیلی ہوئی "سونچکا" کے چھوٹنے کا صدمہ ——— اسے یہ خیال ہو چلا تھا کہ میں "سونچکا" سے محبت کرتا ہوں۔ گھر چھوڑنے سے پہلے، روسی رسم کے مطابق، سب عزیز اقارب لمحہ بھر خاموش بیٹھے تو الیکساندر سرگے ییچ پوشکن کا چہرہ گمبھیر ہو گیا تھا۔

وہ بارہ برس میں پہلی بار اپنے پرانے خاندان سے نکل کر انجانے لوگوں میں جا رہا تھا ——— پورے چھ سال کے لیے۔

پوشکن کی زندگی اور شاعری میں شاہی بورڈنگ اسکول کے اس چھ سالہ دَور کا اتنی بار ذکر آتا ہے، اس کی اتنی اہمیت ہے جتنی خود بچپن اور خاندان کی نظر نہیں آتی، اسی لیے شاعر کے بارے میں ایک ایک نکتے کی تفصیل دریافت کرنے والوں نے "لیزیم" کی بنیاد، اس کے ماحول، انتظام، سرکاری پالیسی، ذہنی فضا پر کم و بیش ایک درجن کتابوں اور مضامین کا انبار لگا دیا ہے۔[1]

یہ اسکول جو ۱۹ اکتوبر ۱۸۱۱ء کو باضابطہ کُھلا اور خود بادشاہ سلامت الیکساندر اوّل نے جس کا افتتاح کیا، پچاس سال چلا۔ حکماً بند کیے جانے سے پہلے اس نے زندگی کے دو دَور دیکھے۔ پہلا دَور گیارہ سال چلتا رہا۔ الیکساندر پوشکن کے تعلق سے یہی دَور ہمارے لیے اہم ہے۔

ایک عالمانہ رائے یہ ہے کہ الیکساندر اوّل ملک میں جو اصلاحات نافذ کرنا یا ان کا شوشہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ انھی میں سے "نئی تعلیم و تربیت" کا یہ ایک نمونہ تھا۔

دوسری رائے، جو انقلابِ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے بعد عام ہو گئی، یہ کہ بادشاہ کی نیت کچھ بھی رہی ہو، لیکن حسنِ اتفاق سے ایسے روشن خیال استاد اور آزادی پسند طالب علم یکجا ہو گئے کہ "لیزیم" انقلابی تحریک کا اچھا خاصا خفیہ اڈا بن گیا تھا۔

---

[1] یہ سلسلہ ۱۹۷۲ء تک چلتا رہا اور اس کی اکثر تصانیف اور ریکارڈ راقم کی نظر سے گذر چکے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ مستند اور قابلِ یقین کام Б-Мамсах کا ہے۔ کُ نمبر ۲، صفحات ۶۹۵۔

اس پرلطف اور سبق آموز بحث میں جو تعلیمی اور تدریسی نکتے ابھرتے ہیں، آج صرف انھی کی افادیت باقی رہ گئی ہے۔ (ظ ا)

واقعہ یہ ہے کہ جن ۳۰ طالب علموں کو پہلی کھیپ میں داخلہ ملا تھا، ان میں سے اکثر تو اعلا عہدیدار بنے، کئی وزارت کی کرسی تک پہنچے ——— بیک وقت ۸، طلبا میں سے صرف ۸ نے آگے چل کر ——— انقلابی تحریک میں حصہ لیا اور انھی کے نام سے "لیزیم" انقلابی گہوارہ شمار ہونے لگا۔ یہاں تک کہ وزیرِ داخلہ نے اسے اپنی نگرانی میں لے لیا۔

روس کے روشن خیال درمیانی طبقے میں یہ خیال ۱۸۰۰ء کے آس پاس عام ہو چلا تھا کہ ملک کو آئینی بادشاہت اور نئے طرزِ حکومت کی فوری ضرورت ہے۔ تبدیلی صرف آئین میں نہیں، آئین کے چلانے والے سرکاری افسروں میں، ان کے طور طریق اور تربیت میں بھی ہونی چاہیے۔ خاص اسی غرض سے ایسے ایسے تعلیمی ادارے کا خاکہ تیار کیا گیا جو تین سال کی مختصر مدت یونی ورسٹی سے پہلے کے مضامین اور بعد کے تین سال میں یونی ورسٹی (گریجویشن) کے مضامین سے آشنا کر دے۔ کسی خاص مضمون کی گہرائی میں اُترے بغیر طالب علم اپنے گرد و پیش کی دُنیا سے مالیات، معاشیات، سیاسیات، قانون، تاریخ اور اخلاقیات سے باخبر ہو جائے۔

ایک سنجیدہ ریفارمر سپرانسکی نے بڑی محنت سے اس ملے جُلے اسکول یونی ورسٹی کا خاکہ ۱۸۰۹ء میں تیار کیا۔ مشورے میں ولادیمیر مالی نوفسکی اور قانون و حقوق کے پروفیسر کونتسین بھی شریک تھے۔ یہ درسی مرکز وزارتِ تعلیم کی ماتحتی سے آزاد رکھا گیا تاکہ آئندہ کے لیے ایک ماڈل پیش کر سکے۔ خاکہ تیار کرنے والوں نے یہ گنجائش رکھی تھی کہ شاہی خاندان اور امرا کی اولاد کے علاوہ عام رعایا کے ہونہار اور لائق بچّوں کو بھی داخلہ ملے تاکہ "نئے روس" کو چلانے والی ایک روشن خیال اور باخبر نسل یہاں سے اُبھرے۔ تاریخ، فلسفہ اور قانون کے عالمی ارتقا پر نظر رکھنے والے نوجوان سامنے آئیں۔

روشن خیالی اور سیاسی باخبری پر اس پروجیکٹ میں اتنا زور دیا گیا تھا کہ پُرانے کرسی نشینوں کا ماتھا ٹھنکا۔ وزیرِ تعلیم رازاؤموفسکی کو حکومت کے ایک مشیرِ خاص جوزف دی مسٹر نے اس دستاویز کی سیاسی تہیں کھول کر دکھائیں اور جتایا کہ نئی تعلیم، خصوصاً سائنس کی تعلیم نے جو نسل اُٹھائی تھی اس نے بادشاہوں کے تاج اور عبادت گاہوں کے چراغ فرانس میں اُتار لیے۔ خاکہ تیار کرنے والوں کی نیت میں فتور ہے، وہ نوجوانوں کی تربیت اپنے ہاتھ میں لے کر اسٹیٹ کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ دی مسٹر نے ایک سرکاری خط میں یہ جتایا کہ

کسے معلوم، روسیوں کو سائنس (جدید) کے لیے پیدا بھی کیا گیا ہے یا نہیں! کم از کم اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا (کہ یہ سائنس انھیں راس آئے گی)

دی مسٹر نے وزیر تعلیم کو اور وزیر نے شہنشاہ کو یہ پٹی پڑھائی کہ روحانیت، خیالات و نظریات اور دنیا کے ارتقا پر سائنسی کتابیں پڑھانا فی الحال روسی ذہن کے لیے مناسب نہ ہوگا، اس سے گمراہی اور نظریاتی شکوک ابھریں گے ـــــ یہ بھی نامناسب ہے کہ شاہی خاندان اور امرا سے باہر کے بچّے داخل کیے جائیں۔

آخری دونوں نکتے حکومت نے مان لیے؛ لاطینی اور فرنچ ابتدائی کورس ہیں، انسان اور شہری کے حقوق، اخلاقیات اور فلسفے کی تاریخ کے مضامین اوپر کی کلاسوں میں شامل رکھ کر اسکول کا خاکہ منظور ہوگیا۔ مالی نوفسکی اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ کونتسین نے قانون کی اور گالیچ نے فلسفے کی پروفیسری سنبھالی۔ پروفیسر کوشانسکی نے روسی ادب اور خطابت (علمِ بیان) اپنے ذمّے لیا۔ یہ اپنے وقت کے روشن خیال، قوم کا درد رکھنے والے، ترقّی پسند علما صرف کلاس روم میں پڑھانے نہیں آتے تھے بلکہ اپنے برتاؤ، شفقت اور برادرانہ ماحول کے ساتھ ساتھ علم کا ذوق پیدا کرنے میں فرصت کے اوقات بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ طلبا کے کمروں میں جاتے، سوالات کا جواب دیتے، خیر خبر رکھتے، کھانے کے وقت طلبا کے ساتھ رہتے۔ ان کے ذاتی مسائل سے دل چسپی لیتے اور دُکھ بٹاتے۔ جسمانی سزا اور سکول سے نکالے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ ماحول کے اثر سے طلبا تھوڑا بہت ڈسپلن کا خیال رکھنے لگے۔

۱۹ اکتوبر ۱۸۱۱ء کو لیزیم کے دروازے کھلے۔ ۳۰ طالب علم داخل ہوئے۔ انھیں ایک سی یونی فارم اور الگ الگ کمرے دیے گئے[ل۵]۔ مارچ ۱۸۱۴ء میں مالی نوفسکی کا انتقال ہوا۔ تین سال سے کم کے عرصے میں یہ لوگ اس تعلیمی ادارے کو ایک واضح رُخ دینے میں کامیاب ہوگئے۔ طلبا میں بحث مباحثہ، آزادانہ میل جول، علم کا شوق، استادوں سے یگانگی، غلطیوں اور شرارتوں پر ہلکی سی تنبیہہ، اور بھری کلاس میں روٹوک سوال کرنے کا دستور، یہ تھا وہ رُخ جو وزیرِ داخلہ ارکچائیف کے خاص آدمی اینگل گارڈٹ کی ڈائرکٹری کے زمانے (۱۸۱۴-۲۲ء) میں بھی چلتا رہا! یہ تھا وہ ماحول جس نے طلبا کو گھروں کی محبت بھلا دی اور اندرونی تحریروں، خطوں اور رسالوں میں اس کا نام پڑ گیا۔ لیزیم ریپلک۔ (Лицейская Република) پوشکن کے بعد کے خطوں اور نظموں میں یہاں کی دوستیوں کو "مقدس برادری" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ ایسے ذہین، بے تاب، حسّاس اور شرارتی نوجوانوں کی برادری تھی۔ جس کے رشتے عمر بھر نباہے گئے۔ اور یہ رشتے جو ہم مذاقی، ہمنوائی اور ہم عمری نے جوڑے تھے، "جذبِ باہم" کی بدولت افکار و اشعار میں بھی اپنا جلوہ دکھا گئے ہیں۔

ل۵ یہ کمرے اتنے بڑے تھے کہ وسط ۱۹۶۱ء میں راقم اور ایک تُرک پروفیسر ایک ہی کمرے میں ہفتوں آرام سے رہے۔

چھ سال کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے دس مضامین پر صرف ہوتا تھا: عالمی تاریخ، روسی تاریخ، پولٹیکل سائنس کا ارتقا، پولٹیکل اکانومی، حقوق کا عالمی جائزہ، اعداد و شمار (Statistics) مالیات، روسی زبان و ادب، جمالیات (فلسفہ، آرٹ اور اخلاقیات) کا تعارف، خطابت و بیان۔ مہینے میں ایک بار سمی نار رکھا گیا جس میں ڈائرکٹر اور پروفیسر سب شریک ہوں۔

الیکساندر پوشکن کے بارے میں اس کا ایک ہم جماعت پلیت نیف (Плетнев) لکھتا ہے کہ:

بظاہر وہ کھویا کھویا اور بے پروا لگتا تھا لیکن پروفیسروں کے لکچر سے غافل نہیں رہا۔ اور ساتھیوں سے کچھ زیادہ ہی حاصل کر لیتا تھا . . . . قدرت کی طرف سے غضب کا حافظہ اور بات کی تہہ میں اُتر جانے کا مادّہ ملا تھا۔ کسی چیز کا کوئی مطالعہ، کوئی گفتگو، غور و فکر کا کوئی لمحہ زندگی بھر اس نے رائگاں نہیں جانے دیا . . . .

پانچویں اور چھٹے سال کونتسین کے لکچر خاص طور سے کارآمد ثابت ہوئے۔ منطق، نفسیات، جمالیات کے علاوہ قدرتی حقوق (Natural Law) فرد کے، سماج کے، عوام کے، روسی شہریوں کے حقوق، قوانین، دیوانی (Civil) اور فوجداری (Criminal) قوانین کے مضمون پر لکچر دیتے دیتے وہ اپنے طلبا میں تقلید اور ضابطہ پرستی سے بیزاری اور انسانی حقوق میں انصاف کی طلب جگا دیا کرتے تھے۔ یہ بات بے وجہ نہیں کہ پوشکن نے بعد کی زندگی میں انھیں بڑے احترام اور محبت سے یاد کیا ہے۔

"انھوں نے ہمیں جنم دیا، ہمارے شعلے کو سانچے میں ڈھالا۔"

خلاصۂ کلام یہ کہ: آخر کچھ شعلے اشعار کے سانچے میں ڈھلے اور کچھ علی الاعلان بغاوت کے نعروں میں۔

"نوعمر پوشکن کی فکر و نظر لیزیم کے درسی نظام کے اثر میں ہی پروان نہیں چڑھی، بلکہ شاعر کی اٹھان میں خود زندگی کا نقشہ بھی، تیز قوت مشاہدہ، حقیقت کے اندرونی تضاد پر گہری سوچ، روسی اور غیر ملکی ادیبوں کا وسیع مطالعہ، ماضی اور حال دونوں کے ترقی یافتہ علمی خیالات کی رسائی پر مستقل نظر رکھنا ——— ان باتوں کی بنیادی اہمیت ہے . . ."

. . . عام معلومات کے شوق اور وسیع مطالعے سے اور جو بھی حاصل ہوا ہو تاہم لیزیم کی چھ سالہ تعلیم میں جو بنیادی خیالات بخشے وہ کسی نہ کسی صورت میں بہر حال پوشکن کے نظریات اور اس کی تصانیف میں صاف نظر آتے ہیں . . . (ک نمبر ۵ و ۲۷)

آخری امتحان کا نتیجہ آیا تو الیکساندر سرگے یچ پوشکن کے سرٹیفکٹ میں لکھا تھا:

فقہ اور دینیات میں بُرا نہیں۔ نیچرل لا، پرسنل اور پبلک لا میں، روس کے دیوانی اور فوجداری قوانین میں اچھے نمبر لیے۔ روسی اور فرانسیسی ادبیات میں، خصوصاً شمشیر زنی میں امتیاز پایا۔ تاریخ و جغرافیۂ اعداد و شمار، علمِ حساب اور جرمن زبان بھی اختیاری مضمون کے طور پر سیکھی۔ (علمِ حساب میں وہ کمزور ہی رہا)

لیزیم کے درسی نظام سے اتنا کچھ سیکھنے کے بعد پوشکن سیر نہیں ہوا۔ ۸ سال بعد اس نے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا! آجکل مطالعے میں ڈوبا ہوا ہوں، اپنی ادھ کچری تعلیم کے گڑھے بھرنے میں مصروف ہوں۔

(ب)

سیاسی اور ادبی فضا

تاریخی ہنگامے   پَر پرواز

ابھی بارہ برس کے "عربچے" کو درسی کتابوں سے رُوشناس ہونے کا موقع نہ ملا تھا کہ مغربی یوروپ میں نپولین بونا پارٹ کا غلغلہ اٹھا۔ جون ۱۸۱۲ء میں چھ لاکھ کی فوج لیے ہوئے یہ پستہ قد فولادی سپہ سالار روسی لشکر کی دیوار توڑتا ہوا ماسکو کی طرف بڑھا۔ ستمبر میں بورودی نو میدان کی شہرۂ آفاق جنگ ہوئی۔ روسی آبادی جنگلوں میں نکل گئی اور فرانسیسی فوج شہر میں بھر گئی۔ ماسکو رات بھر آگ کے شعلوں میں جلتا رہا۔ صبح تک نہ مکان سلامت تھے، نہ گودام، نہ غذائی سامان۔ ادھر وردیاں کسے ہوئے، ہتھیار چمکاتے ہوئے روسی نوجوان پیٹرسبورگ اور ماسکو کی سڑکوں پر مورچہ جمانے کے لیے رَپ رَپ کرتے گزر رہے تھے، ادھر بورڈنگ اسکول خالی کرانے کی تیاریاں جاری تھیں۔ بچّوں کے دل و دماغ پر وطن کی حفاظت کا ولولہ، نوجوان افسروں کے شانہ بشانہ میدان میں نکلنے کا جوش اور فوجی شکست کا غم طاری ہو گیا۔

پوشکن کا ایک ہم جماعت اور عزیز دوست پوشچین ان دنوں کے بارے میں لکھتا ہے:

> ہماری درسی زندگی قوم کی سیاسی زندگی میں ضم ہو گئی۔ ۱۸۱۲ء کا طوفان چڑھا۔ ہمارے بچپن پر ان واقعات کا گہرا اثر پڑا۔ شروعات یہاں سے ہوئی کہ گارڈ پلٹنیں لیزیم کے برابر سے ہو کر گزرتی تھیں اور ہم دوڑ دوڑ کر انھیں رخصت کرتے تھے۔ جب بھی وہ نظر آجاتے، اگر ہم کلاس میں ہوتے تب بھی باہر نکل آیا کرتے تھے۔
>
> جنگی سرگرمیاں شروع ہوتے ہی ہر اتوار کوئی نہ کوئی رشتہ دار ملنے آجاتا اور جنگی خبرنامے لے آتا۔ کوشانسکی بآواز بلند ہال میں پڑھ کر سناتا۔ لکچروں سے فرصت ہوتے ہی ہم اخباروں کے ریڈنگ روم کا رُخ کرتے۔ روسی اور غیر ملکی رسالے پڑھے جاتے، بحث ہوتی، مطلب سمجھائے جاتے۔۔۔" (ک نمبر ۲۸)

خاص انھی معنوں میں بعد کے دسمبری انقلابی مورا ویوف اپوسٹل نے لکھا ہے:

"ہم ۱۸۱۲ء کی گود کے پالے ہوتے ہیں"

واقعے پر واقعہ بڑھتا چلا گیا۔ نپولین کی ۲۱ زبانوں اور چھ لاکھ کی عظیم الشان فوج بے سروسامانی کے عالم میں ماسکو سے واپس ہوئی۔ راستے میں بارش، برفباری اور سردی۔ جنگلوں سے نکل نکل کر روسیوں نے[1] چھاپے مارے، سڑکیں اور پل توڑ دیے۔ خزانہ لُوٹا گیا۔ اور ۱۸۱۳ء میں لائپزگ کے مقام پر یوروپ کے بچے کھچے جاگیرداروں اور بے تاج بادشاہوں نے روسی فوج اور شہنشاہ کی مدد لے کر نپولین سے لوہا لیا۔ نپولین کی شکست۔ ۱۸۱۴ء کے موسم خزاں میں "یوروپ کا نجات دہندہ" روسی شہنشاہ اتحادی فوجوں کے سالار کی حیثیت سے مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا پیرس میں داخل ہوا۔ ۱۰ اپریل ۱۸۱۴ء کو نپولین نے ہتھیار ڈال دیے۔ جزیرہ ایلبا میں قید کیا گیا اور پھر چند مہینے بعد پھر فرانس پہنچا۔ طاقت ہاتھ میں لے کر فوجوں کی تنظیم کی ـــــ تاریخ یوروپ کے یادگار سَو دن۔ انگریزوں اور جرمنوں کا پکیٹ۔ واٹرلو میں انگریزوں کی آخری شکست۔ بحرِ اوقیانوس کے جزیرہ سینٹ ہلینا میں اس کی آخری جلاوطنی۔ یوروپ میں روسی علم لہرائے گئے۔

یہ تھے ظاہرا واقعات ـــــ جنھوں نے اُمنگوں سے بھرے سینوں میں ہلچل مچا دی۔ روس کی ایک تاریخی علمی شخصیت ہیرتسن (Герцен) نے اپنی یادداشت میں درج کیا ہے کہ :

> فتح کے شادیانے یوں بھی بچپن سے اس کو لبھاتے رہے تھے، ۱۴/۱۸۱۳ء کی گونج بالکل ہی روح میں سما گئی . . . .

ایک اور دسمبری انقلابی الیکساندر بستیوژوف (А-Бсетyxceв) ان واقعات کی سماجی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :

> نپولین کا روس پر فتح پانا تھا کہ روسی جنتا کو پہلی بار اپنی قوت کا احساس ہوا۔ ہر ایک دل میں آزادی کی اُمنگ جاگ اُٹھی۔ اوّل سیاسی اور پھر قومی شعور پیدا ہوا۔ بس یہ تھی روس میں آزاد خیالی کی شروعات۔

آزاد خیالی کی اس باغیانہ لہر کو سمجھنے کے لیے ـــــ جس نے ۱۹ ویں صدی کے روس کو سماجی، سیاسی، ذہنی اور فنی ہنگاموں سے دوچار کیا، یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ :

---

[1] احمد شاہ ابدالی کی دہلی سے فاتحانہ واپسی (۱۷۶۱ء) پر بھی پنجاب کے چھاپہ مار دستوں نے بھی اسی طرح سے بربادی پھیلائی تھی۔ خزانہ اور لشکر تاخت و تاراج کر دیا تھا۔

شکست و فتح کے ان برسوں میں" یہ تضاد خوب ابھر کر سامنے آیا کہ ایک تو روسی قوم ہر طرح کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے اور دوسرے یہی روسی جنتا اختیارات سے محروم، پسی ہوئی اور تباہ حال ہے مطلق العنانی اور غلام داری (Serfdom) نظامِ حکومت کے پاؤں تلے ۔ قومی آزادی اور خودی و خودداری کے خیالات، جو ۱۸۱۲ء کی جنگ کے دنوں میں پھلے پھولے، وہ جڑ پکڑ گئے ۔ زبردست اہمیت اختیار کر گئے ۔ روس کے تمام تر سماجی زندگی میں، انقلابی تحریک میں، تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کے پروان چڑھنے میں۔" (ک نمبر۲۰۔ ۱۹۴۹ء صفحہ ۱۵)

یہ خیالات صرف شکست و فتح کا نتیجہ نہیں تھے، بلکہ روس کے نوجوان افسروں، انتظامیہ کے دانش وروں کا پیرس تک پہنچ جانا، وہاں شان سے گھومنا، مغربی یوروپ کی مادی اور تہذیبی ترقیوں کا براہِ راست مشاہدہ کرنا، اُن سے متاثر ہونا بڑا سبب بن گیا ۔ یوروپ کے کسی ترقی یافتہ ملک میں سَرفڈم کا نام و نشان نہ تھا؛ کسان زمیندار کی غلامی سے آزاد اور اپنی محنت بیچنے میں مختار ہو چکا تھا؛ نئی صنعتیں اُٹھ رہی تھیں؛ اوسط درجے کے مکانوں میں مشرق و مغرب کا نفیس سامان موجود تھا؛ جاگیرداری پر سرمایہ داری کا، اور سرمائے میں آزادانہ مقابلے کا پلّہ بھاری ہو رہا تھا؛ اخباروں میں آزادانہ تنقید نکلتی تھی ۔ پارلیمنٹوں کا وقار بڑھتا جا رہا تھا ـــــ لیکن روس، فتحمند روس میں کسانوں کی اِکّا دُکّا بغاوتیں تک بے رحمی سے کچلی جا چکی تھیں، کسان، بہو بیٹی سمیت، زمین کے ساتھ نیلام کیے یا رہن رکھے جاتے تھے ۔ وزیرِ داخلہ ارکچائیف نے دانش وروں کا آزادانہ سانس لینا دشوار کر رکھا تھا ۔ انگلینڈ، بلجیم، ہالینڈ وغیرہ ملکوں کو آس تھی روس کی زرعی منڈی سے ــــ اناج، معدنیات اور لکڑی سے، لیکن اس بکھرے ہوئے، بچھڑے ہوئے پیداواری نظام میں نہ یہ منڈی اس قابل ہو سکتی تھی کہ یوروپ کے بازاروں کو بھر دے، نہ فرانس اور انگلینڈ کی طرح صنعتی اور تجارتی سرگرمی بڑھائی جا سکتی تھی ۔ من مانا شاہی نظام اور سخت گیر پولیس کا اہتمام روشن خیالی کے تمام مظاہر کو یا تو کچل ڈالتا تھا، یا خفیہ سرگرمی پر مجبور کر دیتا تھا، یا اپنی سرپرستی میں لے کر ان کا ڈنک نکال لیتا تھا ۔

پوشکن کو ان تینوں حالتوں سے پے در پے سابقہ پڑا ۔

مگر جب ساری قوم اپنے شہنشاہ کی فتح مندانہ واپسی پر شادیانے بجا رہی ہو ۔ ۱۵ برس کا جوشیلا لڑکا بھلا کہاں ان حقیقتوں کی گہرائی ناپ لیتا! اس نے دو نیم پختہ نظموں سے اس قومی جشن کا استقبال کیا :

"شہنشاہ عالی جاہ کی پیرس سے واپسی پر"

"نپولین جزیرہ ایلبا میں"۔

دونوں نظموں میں الیکساندر کو یوروپ کا نجات دہندہ کہا گیا ہے اور نپولین کو "غارت گر"۔ یہ نظمیں قوم پرست نوجوان حلقے کی وقتی ترجمانی ضرور کرتی تھیں، شہرت بھی وقتی ملی، بلکہ اُمید سے بڑھ کر۔ اسی سال اس کی ایک اور نظم "الیکساندر سے خطاب" اسکول میں مشہور ہوئی جس میں روسی سُورماؤں کو دادِ شجاعت دی گئی ہے۔ تاہم "لیزیم" سے فارغ ہوتے وقت اس کا شعور اپنی پچھلی قصیدہ خوانی سے مُکرنے قابل ہوگیا اور ۱۸۱۹ء میں اس نے "الیکساندر" کی مدح کے مصرعے بدل ڈالے۔

مگر یہ کوئی پہلا "شعری کارنامہ" نہیں تھا۔ اسکول کے رسالوں میں، پرائیویٹ نشستوں میں، رومانی، عاشقانہ (واقعی عاشقانہ۔ مثلاً "نتاشا کے نام") اور مزاحیہ نظموں میں چمکنے کے بعد پہلی بار ۱۸۱۴ء میں اس کی ایک نظم "شاعری گر دوست کے نام" روس کے مشہور اور باوقار رسالے نقیب یوروپ (Вестник Эвропы) میں شائع ہوئی جس پر شاعر کا نام یوں لکھا تھا:

Алексвдр -Н-К-Щ-Л ان دو برسوں میں اس نے یکے بعد دیگرے بارہ نظمیں کہیں اور ہر ایک میں اپنے کسی نہ کسی ہم عصر بزرگ، مثلاً درژاوین، ژوکوفسکی یا باتیوشکوف کے انداز، آغاز اور بندش کی پیروی کی، سوائے ایک نمایاں فرق کے ــــــ جہاں بھی کوئی منظر بیان کیا، خاص اسی منظر کو اُبھارا۔ گاؤں کا ذکر ہے تو "زخاروف" گاؤں (جہاں نانی کے پاس جایا کرتا تھا) اور "لیزیم" کا بیان ہے تو خاص وہی پارک، جس میں بچے کھیلا کرتے تھے۔ "عام" سے ہٹ کر "خاص" پر توجہ مرکوز رکھنے اور اسی کو اُبھارنے کی یہ خصوصیت لڑکپن سے ہی اس کے شاعرانہ مشاہدے کی باریکی اور شہادت پر گواہی دیتی ہے اور یہی بعد کی پختہ شاعری میں اس کے کلام کا ایک وصف بن گئی۔

تین سال کا پہلا کورس دسمبر ۱۸۱۴ء میں مکمل ہوگیا۔ ۸ جنوری ۱۸۱۵ء کو سالانہ امتحان کے بعد نتیجے سُنائے جانے والے تھے، خاص اجلاس تھا، باہر کے بہت سے مہمان مدعو تھے، خبر پھیلی کہ پتیرسبورگ کا، بلکہ اپنے وقت کا عظیم کلاسیکی شاعر درژاوین (Дерхсавик) بھی شریک ہوگا۔ اساتذہ نے الیکساندر کو راضی کیا کہ اس موقع پر ایک یادگار نظم ہو جائے۔ نظم لکھی اور پڑھی گئی تو یہ واقعہ بھی یادگار ہوگیا:

"..... درژاوین بہت بوڑھے ہو چکے تھے ..... ہمارے امتحان نے انھیں تھکا ڈالا، ہاتھ پر سر ٹیکے

ئـہ شاعری گر بروزن کاری گر۔ پوشکن نے سچے شاعر اور مصنوعی شاعر کا فرق ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے۔

بیٹھے رہے؛ چہرے پر بے خیالی، آنکھیں دھندلی، ہونٹ آدھ کھلے.... جب تک روسی ادبیات کا امتحان شروع نہیں ہو گیا، وہ برابر اونگھتے رہے۔ اس مضمون پر چونکے، آنکھوں میں چمک آگئی۔ ایک دوسرے آدمی نظر آنے لگے۔ ظاہر بات ہے کہ خود ان کا کلام پڑھا، دہرایا، سمجھایا اور بار بار سراہا جا رہا تھا۔ چاق چوبند بیٹھے سُنتے گئے۔ آخر میرا نام پکارا گیا۔ میں نے درژاوین سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو کر اپنی نظم "شاہ دیہہ کی یادیں" (Воспоминания в царкомсеае) سنائی۔ بیان نہیں کر سکتا کہ میرے دل کی کیا حالت تھی۔ جب میں اس شعر پر پہنچا جہاں درژاوین کا نام آتا ہے تو میری آواز لڑکپن کے انداز میں کھنکھنائی۔ شدتِ کیفیت میں دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یاد نہیں کہ نظم خوانی کیسے تمام کی؛ یہ بھی یاد نہیں آتا کہ بھاگا تو کدھر بھاگا۔ درژاوین بہت لطف اندوز ہوئے۔ انھوں نے مجھے بلوایا، گلے لگانا چاہتے تھے.... ہر طرف ڈھنڈیا مچی مگر میں ہاتھ نہیں آیا...."

یہ خود اس ہونہار شاعر کے الفاظ ہیں۔ اخبارات میں یہ واقعہ بھی چھپا اور چند روز بعد اہم رسالے "روسی عجائب خانہ" (Русский Музей) میں نظم شائع ہو گئی۔ شام کو وزیرِ تعلیم گراف رازوموفسکی کے یہاں معززین اور بچوں کے سرپرست ڈنر پر مدعو تھے۔ وزیر نے پوشکن کے والد سے کہا: میں چاہتا تھا کہ آپ کے صاحب زادے نثر نگاری میں پڑتے...."

درژاوین نے ذرا گرم ہو کر کہا: بس، آپ اُسے شاعر ہی رہنے دیجیے!"

بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ درژاوین نے یہاں تک کہہ دیا کہ "اب مجھے مرنے کا غم نہ ہوگا، میرا جانشین پیدا ہو گیا"۔[1]

لیکن، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، الیکسانڈر پوشکن نے، ان بزرگوں کے ورثے کو اپنانے، ان سے سیکھنے، انھیں ازبر کرنے کے باوجود ان کا جانشین بننے کی سعادت گوارا نہیں کی۔ "درباری" اور "کلاسیکی" روش کی بندشوں سے نکل کر اسے اپنی سڑک کے پتھر خود ڈھونے، خود کوٹنے تھے۔ اس کی دُنیا کے تقاضے کچھ اور تھے۔

اوّل تو اس "لیزیم" میں ہی جن گھرانوں کے بچے رہتے تھے، وہاں تعلیم، بیداری، قومی مسائل کا چرچا تھا، دوسرے یہاں کے باخبر اور ہوشمند اُستادوں نے ذوق صیقل کیا، پھر باہر جا کر جن نوجوانوں کی آنکھیں کھلیں

---

[1] یہی درژاوین مخالف ادبی نظریات والوں کے سرغنہ بنائے گئے اور پوشکن کے ہمنواؤں کا حلقہ ان کے خلاف صف آرا ہو گیا۔

انھوں نے ۱۶-۱۸۱۵ء میں وابسی پر ہاتھ پاؤں نکالے۔ پرچار اور تقسیم کا کام خفیہ ہی ہو سکتا تھا۔ چناں چہ یکے بعد دیگرے دو سوسائٹیاں قائم ہوگئیں: انجمنِ فلاح اور انجمنِ رفاہِ عام۔

انھی دنوں شاہ دیہہ (زارتسکوئے سلو) کیڈٹوں کی پلٹن کا پڑاؤ ہوا۔ اس پلٹن میں ایک نوجوان تھا پیوتر چادئیف، پوشکن سے صرف پانچ سال بڑا، لیکن یوروپ گھومے ہوئے، حالاتِ حاضرہ سے باخبر اور قومی صورتِ حال سے دردمند کویرین اور رائیفسکی بھی ہم خیال تھے۔ (ان تینوں سے ہم پھر ملیں گے)

نوجوان شاعر فرصت کے اوقات میں وہاں چھپ چھپ کر جانے لگا اور اتنا احساس ہوگیا کہ کہیں کچھ خفیہ انقلابی سرگرمی جاری ہے۔ یہ احساس دبا نہیں رہ سکتا تھا۔

"لیزیم" میں ایسے لڑکے بھی تھے جنھیں امتیاز کے ساتھ امتحان پاس کرکے عہدے سنبھالنے اور باعزت، پُرسکون زندگی بسر کرنے کی لگن تھی۔ مثلاً جرمن نژاد کورف (Korff) اور روسی نواب زادہ پرنس گورچاکوف اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ ایسے "پڑھاکو" لڑکوں سے الگ پوشکن کی ٹولی تھی۔ مثلاً پوشیچن (Пущен) جرمن نژاد ولیہم کوخل بیکر، رئیس زادہ انتونی ڈِلوِگ (Дельвиг) ایلی چیوسکی۔ (جن میں سے ہر ایک روسی ادبی تاریخ میں اپنا نام چھوڑ گیا) اس ٹولی کو سیاست اور ادب میں نئے رجحانات کا چسکا لگ گیا۔ (د۔ ضمیمہ)

پائے تخت پیٹرسبورگ میں ادبی محاذ پر کئی معرکے چل رہے تھے —— اور اہلِ قلم دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ بظاہر یہ روسی زبان و ادب میں قدامت اور جدّت کی کش مکش تھی۔ درحقیقت آگے پیچھے کی دو نسلوں اور ادبی ارتقا میں دو مخالف رجحانوں کا مقابلہ تھا۔

سلاف وضعداری کے حامیوں نے "حلقۂ اربابِ ادب روسی" (Беседа любителей Русского слова) بنا رکھا تھا، اس میں نمایاں شخصیت ایڈمرل شِشکوف کی تھی جن کی سماجی حیثیت ادبی صفات پر حاوی تھی۔ یہ لوگ روسی ادبیات کے ارتقا میں غیر ملکی اثرات کو "مغرب زدگی" کا الزام دیتے تھے، اور زبان میں کلاسیکی نوک پلک، نفاست پسندی، شاندار اور محتاط لب و لہجہ کے قائل تھے۔ آج اس تحریک کے سربراہوں کے نام بھی یوں یاد آجاتے ہیں کہ ۱۵، ۱۶ برس کے لڑکے پوشکن نے "شاعری گر دوست سے خطاب" عنوان کے تحت، اور "حلقۂ ارباب" کے نام سے دو نظموں میں اُن پر طنز کیا ہے، پھبتیاں کسی ہیں، مثلاً:

اینٹھے ہوئے تین گوتیوں کی "ترونیکا" (گھوڑا گاڑی) میں تین جُتے ہیں —— شیخ ماتوف، شاخوفسکی، شِشکوف۔

۱۸۱۵ء میں ان "سلاویان" کا متحدہ جواب دینے کے لیے چند اہلِ قلم نے ایک انجمن بنائی؛ نام طے پایا "ارزماس" اس انجمن میں رنگارنگ ترقی پسند شامل ہو گئے۔ کرامزین تاریخ نویسی میں جو فرنچ رنگ لیے ہوئے سادہ، عام فہم روسی زبان استعمال کر رہے تھے، وہ گویا ایک نمونہ بن گئی؛ ژوکوفسکی کی آزادانہ بحریں، رومانوی نظمیں سنگِ میل قرار دی گئیں؛ لبرل خیالات، اسٹیٹ میں سیکولرزم کے حامی، گراف اُوواروف، نکولائی تورگینف (عظیم روسی افسانہ نگار کے بزرگ) نکیتا موراویوف، میخائیل ارلوف، ـــــ اور "مغرب زدہ" قوم پرست ویازیمسکی اور باتیوشکوف اپنی جداگانہ تقدیروں سمیت "ارزماس" میں شامل ہو گئے۔ پوشکن کم عمر طالب علم کو ـــــ (جسے ژوکوفسکی "Сверчок" جھینگر کہا کرتا تھا) باقاعدہ ممبر تو نہیں بنایا گیا، تاہم اپنوں میں شمار کیا جانے لگا۔

ویازیمسکی نے بہت بعد کی تحریر میں "ارزماس" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"... یہ ایک اسکول بن گیا تھا ادب کے باہمی مطالعے کا، اچھا خاصا ادبی پنچ۔ خاص بات یہ کہ "ارزماس" کی نشستیں سر جوڑ کر بیٹھنے کا ایسا ٹھکانا ہو گئی تھیں جہاں مختلف سن و سال کے لوگ، بلکہ بعض اوقات تو ادب کے علاوہ اور مسائل پر قطعی مختلف خیالات رکھنے والے بھی رل مل کر، ادب کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے؛ اپنی کہتے، اوروں کی سنتے، اپنی تحریروں اور تجربوں پر بات کرتے، چھیڑ چھاڑ ہوتی، جملے کسے جاتے، جی ہلکا کرنے اور اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کا لطف اٹھایا جاتا۔"

یوں پوشکن کا ذہن بیک وقت سیاسی اور ادبی معرکوں کی سان پر چڑھا اور ۱۸۱۵ء کی وہ نظم منظرِ عام پر آئی جس سے عموماً "انتخاب کلام پوشکن شروع ہوتا ہے" "Лицаню" (یعنی لتیینا سے خطاب) ۲، مصرعوں کی یہ نظم "روسی عجائب خانہ" رسالے میں چھپی تو اس کا ضمنی عنوان تھا "لاطینی سے ترجمہ" طبع زاد نظم کو "ترجمہ" بتانے کی غرض یہ تھی کہ سنسر کی قینچی سے محفوظ رہے۔

"مجھے غلامی ایک آنکھ نہیں بھاتی، سینے میں آزادی کی آگ لگی ہے۔" بظاہر یہ نظم روم قدیم کے غلام داری سماج اور عہدِ غلامی کے زوال پر درد بھرا طنز ہے، لیکن سطروں کے درمیان سے تب کا روس جھانک رہا ہے؛ آخر میں روم سے خطاب کر کے شاعر کہتا ہے کہ تیرے بے بس غلاموں کے صبر کا پیمانہ چھلکنے والا ہے۔ وہ ہولناک دن قریب ہے جب تجھے کرموں کا پھل چکھایا جائے گا۔ دہشت انگیز عظمت کے خلتے کا وہ لمحہ مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ طرۂ دستار زمین پر ٹھوکریں کھائے گا؛ نوجوان تلواریں سونت کر نکل پڑیں گے، دریا اُبل پڑیں گے اور راہگیر عظمت کے ان کھنڈروں کو ویران دیکھ کر پکارے گا:

لو دیکھو، ”روم آزادی سے سر بلند ہوا تھا، غلامی سے دفن ہوگیا۔“

اپنی پُر جوش سیاسی نظم کو ”ترجمے“ کا بہروپ دینا، روم قدیم کی تاریخی اور اصنافی اصطلاحوں میں چھپانا اور پیش گوئی کے لہجے میں کلام کرنا ـــــ صرف پوشکن کی ذہانت، جوش اور ہوشمندی کا ہی نہیں سیاسی اور ادبی ماحول کی اس جوہر شناس تربیت کا بھی پتہ دیتا ہے، جس نے شعلے کو سانچے میں ڈھالا تھا۔

چھ سال کی اس تعلیمی مدّت میں پوشکن نے ۱۲۰ نظمیں کہیں، جن میں سے کم از کم رومانوی، ذاتی اور سیاسی نظمیں ملک کے تین باوقار رسائل میں چھپ گئیں۔ بعض افسروں پر منظوم پھبتیاں اور ہجویں سینہ بہ سینہ گشت کرتی رہیں۔ ایک ہجو اخلاقی نگراں پر ایسی چپک گئی کہ ہنگامہ کھڑا ہوا اور اسے ”لیزیم“ سے بھاگنا پڑا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ادارے کے اندر وہ خفیہ پولیس کا مخبر تھا۔

۱۷ برس کی کچّی عمر تک آتے آتے پیتر سبورگ کے ادبی حلقوں میں کُھلے عام، اور خفیہ، انقلابی ٹولیوں میں ڈھکے چُھپے اس نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ تاہم اس چُلبلے وجود میں خاموش مطالعے اور گہری سوچ کی لَو بھی اُونچی ہوتی گئی جو تنہائی اور بے ہمگی کا تقاضا کرتی ہے۔ اور والتیئر جیسے ہنگامہ خیز شاعر کو نثری کارناموں پر متوجہ رکھتی ہے۔

پوشکن کی اُبھرتی ہوئی شاعرانہ شہرت بھی اُسے بچپن کے ذوقِ نثر نگاری سے بے نیاز نہ کرسکی۔ اسکول کے روزنامچے میں ۱۰ دسمبر ۱۸۱۵ء کو یہ الفاظ درج کیے ہیں:

”فاطمہ یعنی انسانی معقولیت: نیچرل لا (زیرِ تصنیف) کا تیسرا باب میں نے لکھ ڈالا . . . .“

دوستوں کے ذاتی خطوط اور مصوروں کے تصوّر میں اس دَور کے پوشکن کی تصویر یوں اُبھرتی ہے: گھونگھر یالے بال، چوڑا ماتھا، سانولا رنگ، قد اوسط سے کچھ کم، بدن گٹھا ہوا ہونٹ آگے کو بڑھے ہوئے، بھویں اٹھی ہوئی، آنکھیں بے چین۔ داہنا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے، اسکول کی بنچ پر درخت کے نیچے بیٹھا، اپنی سوچ میں گم ہے۔ دین دُنیا سے بے خبر[۱]

انھی دنوں (۱۸۱۶ء) جب وہ اپنی کامیڈی ’فلسفی‘ (Философ) لکھ رہا تھا، ایک ہم جماعت دوست ایلی چیوسکی نے کسی دوست کو لکھا کہ ”پوشکن نے نقشہ بڑا کامیاب جمایا ہے۔ پہلا باب لکھ چکا۔ خدا کرے یہ کام پورا کر ڈالے . . . ۔ اس کی شہرت کی شعاعیں دوستوں کو بھی جگمگاتی رہیں گی۔“

---

۱ (Illustration) مجسّمے کی تصویر سامنے کے صفحے پر۔

۱۸۱۷ء کی گرمیوں میں جب "لیزیم" کی پہلی کھیپ امتحان سے نمٹ کر، نتیجہ سُن کر، نئی اُمنگیں لیے ہوئے زندگی کے کانٹوں بھرے میدان میں اُترنے والی تھی، مستقبل کے ترجمان نے دو نظمیں سُنا کر اسے رخصت کیا!

ایک "ساتھیوں کے نام"

سان پر چڑھانے جانے کے سال اب ختم ہونے آئے۔ جُدائی کا لمحہ دروازے پر کھڑا انتظار کر رہا ہے۔ دُنیاداری کا شور غُل ہمیں دور سے آواز دے رہا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک، اپنے شباب کے خواب و خیال لیے ہوئے آگے کی راہ دیکھ رہا ہے۔

۴۴ مصرعوں کی نظم خاتمے کی طرف بڑھتی ہے: دوستو! تمھاری نوازش ہوگی اگر میری یہ سُرخ کلاہ کچھ اور میرے سر پر جمی رہے —— جب تک کسی قصور پر اس کی جگہ سرکاری وردی کا ٹوپ نہ آجائے . . . .

"سُرخ کلاہ" انقلابِ فرانس (آخر ۱۸ویں صدی) کے علمبرداروں نے اپنائی تھی۔ اور یہ بات بے سبب نہیں کہ "سُرخ کلاہ" سنبھالنے کی آرزومند یہ نظم شاعر کی موت کے چار سال بعد پہلی بار شائع ہوئی۔

دوسری نظم انقلابی خیالات کے ہم جماعت اور ہمنوا کوخیل بیکر سے خطاب ہے۔ اس میں جذبے کی شدّت، رفاقت کا احساس، اور اس "نئے خاندان" سے وابستہ رہنے کی اُمنگ ایسے گھُل مِل گئے ہیں کہ خود شاعر کا چہرہ اور "ساتھیوں" کی صورتیں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ یہ نظم جو ڈیڑھ سو برس پہلے کی روسی شاعری کے عام جذباتی انداز کا نمونہ پیش کرتی ہے، کوخیل بیکر کو گمراہ کرکے، گویا سیاسی اور ادبی انقلاب سے اپنے عہدِ وفا کا یقین دلا رہی ہے:

روس نگر میں ڈنکا باجے

گھومے راج سواری

پھوٹ پھوٹ کے عیسیٰ روئے،

۱؎ امتحان کا یہ نظام آج بھی اسی طرح چل رہا ہے کہ سوالات کے پرچوں کی کھیپ سامنے رکھ دی جاتی ہے، طالب علم جو پرچہ چاہے اپنے لیے چُن لے۔ جوابات کی کاپی تبھی جانچ لی جاتی ہے اور امتحان کا نتیجہ وہیں، ورنہ دو چار دن کے اندر سُنا دیا جاتا ہے۔ اگر کسی مضمون میں طالب علم فیل ہوجائے یا تیاری کرکے دوبارہ امتحان دینا چاہے تو ممتحن سے تاریخ طے کرلیتا ہے —— اور پھر اپنی سہولت سے امتحان دے سکتا ہے۔

روئیں سب نر ناری

بی بی مریم ننھے کو بہلائے، کبھی دھمکائے:
"چُپ ہو جا، اے راج دُلارے، زار ہے روسی راجا
ہوّا آیا، ہوّا آیا، سُن لے ڈنکا باجا"
زار نے یوں فرمان سُنایا:

روسی جنتا، جان لے تو بھی، جانے سب سنسار
آسٹریا، پروشیا والے
سب نے مان لیا ہے ہم کو؛
ہم نے کمر کس لی ہے اپنی، وردی ہے تیّار۔

دھوم مچاؤ، دیکھو، ہم ہیں پیٹ بھرے مُسٹنڈے
اُونچا نام ہمارا، مالا جپتے ہیں اخبار
کھا پی کر اک قول دیا ہے
قول سے خوش ہو جاؤ لوگو، خوب بجاؤ ڈنڈے

سُن لو، آگے کیا کرنا ہے
جو سُن لے وہ جانے:
"لاوروف" کو باہر کر کے
"سوس" کو پاگل خانے؟

"گورگولا" کی کرسی پر اب بیٹھے گا قانون
جنتا اپنا حق پائے گی (رال بہے نہ خون)
رحم کیا پرجا پر ہم نے، کرتے ہیں احسان
عام ہوا فرمان

جھولے میں یہ سُن کر بچّہ
خوش خوش اُچھلے کُودے
"کیا سچ مچ اب ایسا ہوگا؟
یا ہے یہ بھی غچّہ؟"

بی بی مریم پیار سے تھپکے "سو جا راج دُلارے
رات ہوئی اب، آنکھیں میچ لے، سو جا میرے پیارے،
سُن راجہ باپو کی زبانی
کہتا ہے اچھی سی کہانی"

تیسرا باب

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مئی ناب و سفینۂ غزل است
(حافظ[1])

سرکاری نوکری جھنجھلاہٹ بے اعتباری

آخری سالانہ امتحان کچھ بڑے امتیاز سے پاس نہیں کیا تھا، طرّہ یہ کہ چال چلن مشکوک، جس درجے میں پاس ہوا، اس کی صرف سند نہیں، بلکہ اسی درجے کی ملازمت کا پروانہ مل گیا۔

وزارتِ خارجہ میں سیکشن افسر کا عہدہ[2] ــــــ چند روز کے اندر "کلاہِ سُرخ" سرکاری وردی کے ٹوپ نے ڈھک لیا۔

پِتیرسبورگ میں ۱۸ برس کے بے لگام شاعر نے کیسے ہنگامے گرم کیے، اس کا چشم دید حال جاننے کے لیے ہمیں صرف دو فریقوں کا بیان چھاننا ہوگا ــــــ ایک پوشکن کا سات سال چھوٹا بھائی لیو ــــــ دوسرا پوشکن سے چِڑنے والا ہم جماعت اور ہم عصر "پاکباز" کورف ([illegible]) یہ کورف اپنی یادداشت میں لکھتا ہے :

> بورڈنگ اسکول کے دنوں سے ہی اس نے گلچھرّے اُڑانے میں اپنے ساتھ والوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں تو اور بھی کھُل گیا، ہر طرح کی رنگ رلیوں میں پڑ گیا۔ شب و روز مستقل دادِ عیش دینا، جام لنڈھانا اور آفت مچانا۔ تعجب ہے کہ اس کی صحت اور ذہانت دونوں نے یہ بار کیسے برداشت کرلیا، جس کا لازمی خمیازہ یہ تھا کہ بار بار شرمناک بیماریوں میں مبتلا ہوتا اور موت کے منھ تک پہنچ جاتا . . . .

---

[1] حافظ شیرازی کی مشہور غزل کا مطلع۔ ترجمہ: ان دنوں ایسے رفاقت کرنے والے جن میں کوئی کھوٹ نہیں، دو ہی میسّر ہیں؛ ایک خالص شراب کی صراحی اور دوسرے غزل کی بیاض۔ لفظ "سفینہ" اشعار کا مجموعہ بھی ہوتا ہے اور کشتی بھی؛ خوبی یہ کہ غزل یعنی شاعری بھی سفینے میں سجائی جاتی ہے اور صراحیِ مئی ناب بھی کشتی میں لگا کر لاتے ہیں۔

[2] پِیٹرِ اعظم کے وقتوں سے سرکاری ملازمتیں ۱۴ درجوں میں تقسیم تھیں۔ پوشکن کو دسواں درجہ ملا۔ (ک نمبر ۲۹۔ ص ۲۵)

پوشکن پر دو حالتیں طاری رہتی تھیں: یا تو نفسانی خواہشات میں ڈوبا ہوا ہے یا شاعری میں؛ اور دونوں میں بے پناہ۔ اسے نہ مذہب کا پاس تھا، نہ احساس، ننگ و ناموس کی ذرہ بھر پروا نہیں رہتی تھی۔ بلکہ مذہب و اخلاق نام کی ہر شے کا مذاق اڑانے میں فخر محسوس کرنے لگا تھا۔ جیب میں کوڑی نہیں، ہمیشہ اُدھار کھاتے پر گزر بسر، اکثر اوقات شام کی پوشاک تک سلیقے کی نہیں ہوتی تھی۔ ایک سلسلہ تھا بدنامیوں، رسوائیوں، پستیوں کی لڑائیوں (ڈوئل) کا، . . . .

اس یک طرفہ تاثر کی تصدیق چھوٹے بھائی کے بیان سے ہو جاتی ہے:

لیزیم سے نکلنے پر پوشکن نے اپنی نوجوانی اور آزادی کا جی بھر کے استعمال کیا۔ اوپر کی سوسائٹی ہو یا ہنگامہ خیز ناؤ نوش کی محفلیں، دونوں ہی باری باری اس کا دامن کھینچتی رہتی تھیں . . . .

بے صبری سے دیوانہ وار وہ ہر قسم کی رنگ رلیوں میں کود جاتا تھا۔

لیکن یہ سب "نزدیکان بے بصر" کی ناسمجھی ہے۔ پوشکن کا والہانہ مزاج اُسے طوفانِ شوق میں کودنے پر اُکساتا ضرور تھا، لیکن ڈوبنے سے بچا بھی لیتا تھا۔ کھلتا ہوا سیاسی اور ادبی شعور بہ حقیقت اس کی در پردہ سرگرمیوں، خطوں اور تصنیفوں سے بھی ثابت ہے۔

ملازمت ملنے کے مہینہ بھر بعد وہ چھ ہفتے کی چھٹی لے کر ماں کی جاگیر میخائیلوفسکوئے گاؤں چل دیا۔ وہاں خاموشی کے ساتھ لکھنے پڑھنے اور آزاد گھومنے پھرنے میں وقت گزارا۔ سوچا، اور اب تک کے اپنے ادبی اور سماجی رویّے پر گہری نظر ڈالی۔ یہ قیاس اس لیے درست ہے کہ ۱۸۱۷ء کے آخری مہینوں سے اس کا شعور اور فنی برتاؤ بڑی تبدیلی سے گزرتا نظر آتا ہے۔

زمانہ وہ ہے کہ فرانس کا بورژوا انقلاب، روسی، انگریز، پروشیائی رجعت پرستی کی متحدہ طاقت سے کچل ڈالا گیا۔ روسی شہنشاہ اس "پاک اتحاد" (Holy Alliance) کا رکھوالا قرار پایا۔ اور ایک ایک ملک میں سیاسی بغاوت یا انقلاب کی کونپل مسلی جانے لگی۔ مگر نظریے (آئڈیالوجی) کا مقدر یہ ہے کہ جب ایک بار ذہنوں میں جڑ پکڑ لے اور متحدہ عمل پر آمادہ کر دے تو ناکام ہو کر بھی مرتا نہیں، مخالف قوتوں کے پاؤں تلے کی ریت اندر اندر کاٹتا رہتا ہے۔ انقلابِ فرانس کے لائے ہوئے خیالات یورپ کی نوجوان نسل کا ایمان بنتے چلے گئے اور شخصی بادشاہت کے خلاف مطالبے، مظاہرے اور دہشت پسند سرگرمیاں جاری رہیں۔ ان کی گونج روس میں اور شدت سے ہونے لگی۔ اور پوشکن کی تازہ نظمیں دست بدست گشت کرنے لگیں۔

جب وہ گاؤں سے پیٹر سبورگ واپس آیا تو چند روز بعد اس کے لبوں پر ایک نظم تھی "من مانی"[1]....
یہ نظم کئی حیثیتوں سے سوانح نگاروں کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔

اس کا بے باک لہجہ اور تاریخی تجربے کا انداز "رادیش چیف" کی نظم (Ode) "من مانی" کے زیر اثر، مگر اس سے ہٹ کر اپنے طرز پر کہنے کی کامیاب کوشش، روم، فرانس اور روس کے سنگ دل شہنشاہوں کو ایک لڑی میں پرونے اور ذہنوں میں ہلچل برپا کرنے کا سلیقہ، بادشاہوں کی نیت اور انجام دونوں کا شعور، کٹیلے الفاظ کی جاندار بندش، کلاسیکی اصولوں سے قطعی بے نیازی، Ode کی سی جذباتی کیفیت کے باوجود لفظوں کی تیزئ طراری، اس تیزی میں شاعر کی اپنی شخصیت کا، غم و غصّہ کا اُبھرنا، پھر پوشکن کے پڑھنے کا انداز: بیقرار آنکھیں، بے چین ہاتھ، کھڑے ہوکر اس نے اپنی مترنّم، نوجوانی سے سرمست آواز میں نظم سُنائی تو اس کی تاثیر اور بڑھ گئی:

> حسن و عشق کی کمزور دیوی دُور ہو، آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جا؛
> اور آزادی کی خوددار مغنیہ، شاہوں کو دہلانے والی، کہاں ہے تو، ادھر آ،
> میرے سر سے یہ سہرا اُتار پھینک، سُریلے راگوں کا ساز چھین کر تار تار کر دے۔
> دُنیا کی آزادی کا وہ نغمہ سر کرنا چاہتا ہوں کہ (سمراٹوں کے) سنگھاسن ڈول جائیں....
> دُنیا کے سفاکو، تھرّاؤ! اے سرنگوں بندو، سر اُٹھاؤ،
> ہمّت باندھو، کمر کسو، غور سے سُنو!
> واحسرتا، جدھر نظر ڈالتا ہوں، ہنٹر، ہتھکڑی اور بیڑیاں، جان لیوا تذلیل کے قانون،
> حسرت و بے بسی کے آنسو، ظلم کا شکنجہ کسا ہوا....

پانچواں بند یوں تمام ہوتا ہے:

> اے اربابِ اقتدار! تمھارے یہ تاج و تخت، قدرت کے نہیں، قانون کے عطا کیے ہوئے ہیں؛ تم رعایا سے برتر و بالا براجمان ہو (مگر یاد رکھو) ابدی قانون تم سے بھی زبردست ہے....

روم قدیم کے ظالم شہنشاہ، کلی گولا، شاہِ فرانس لُڈوگ (جسے ۱۷۹۳ء میں پھانسی دی گئی اور روس کے پاول اوّل (جسے ۱۲ مارچ ۱۸۰۱ء کو سازشیوں نے جان سے مار ڈالا) ان کا نام لینے کے بعد، سرتاجوں

---

[1] لفظ ہے: Вольность (وول نست) اس کا انگریزی ترجمہ Freedom کیا جاتا ہے۔ فریڈم کے لئے دوسرا مکمل لفظ "سوبودا" موجود ہے۔ یہاں ہونا چاہیے "من مانی"۔

کے تاج اُڑتے دکھا کر شاعر اپنی نظم یوں تمام کرتا ہے :

اے تاجورو ! نہ سزا تمھارے کام آئے گی ، نہ جزا ، نہ جیلیں ، نہ نذر نیاز ، اب خیریت اسی میں ہے کہ قانون کے آگے گردن جھکا دو[1]۔ قوموں کو آزادی اور چین نصیب ہو گا تو وہ خود تمھارے تاج و تخت کی حفاظت کے لیے کمربستہ رہیں گے ۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ روس میں نظم شائع نہیں ہونے والی ، پوشکن نے آئینی پابندیوں کے ساتھ شہنشاہ اور رعایا کا رشتہ اور اس سے اپنی آس بنائے رکھی ——— مگر کب تک ؟

شہر میں دو ادبی رجحان پل رہے تھے ، ایک محض ادبی اصلاح ، لسانی بیداری اور ترقی کا حامی ، اور دربار کا حاضر باش ۔ اس میں پوشکن کے خیر خواہ اور بااثر قلمکار بزرگ شامل تھے ۔ مثلاً ۱۷۶۶ء کی پیدائش کرامزین ۔ کہ ۱۸۱۸ء میں اُن کی "تاریخ ریاست روس" کی جلد اول شائع ہوئی اور اُس کی دُھوم مچ گئی ۔ پوشکن کا تاثر تھا کہ :

کرامزین نے روس قدیم ایسے ہی دریافت کیا ہے جیسے کولمبس نے امریکہ ۔

پھر ژوکوفسکی تھے ، فرینچ ، انگریزی [اور فارسی] ادبیات کے بہترین مترجم ، جن کے منظوم ترجموں نے روسی زبان کو کئی قدم آگے بڑھا دیا اور بعضوں کا خیال ہے کہ لارڈ بائرن اپنے روسی ترجموں میں اصل سے زیادہ دِلکش اور پُرشکوہ نظر آتا ہے ۔ پھر پرنس ویازیمسکی ۔ ادب کے نہایت لائق جوہری ، الیکساندر تورگینف تھے ۔ باتیو شکوف ، اعلا پائے کا شاعر پوشکن کے باپ اور چچا سے ان لوگوں کی دوستیاں چلی آ رہی تھیں ۔ عالمی ادب پر ان کی نگاہ پھیلی ہوئی تھی ، اُن کی بدولت شہر کی اعلا سوسائٹی میں فنّ و ادب پر کلاسیکی نظر رکھنے والے "معززین" میں نوجوان شاعر کے مراسم بڑھ گئے ۔

دوسرا حلقہ سیاسی اور ادبی انقلاب پسندوں کا تھا ، یہاں پُرانے ساتھی ڈیلوگ نکیتا موراوئیف ، یاکوشکن ، تیزی کوف ، کوخیل بیکر ، پلیتینوف ، براتینسکی ، پوشچن جیسے پڑھے لکھے ، تیز مزاج نوجوان تھے جن سے

---

[1] اس پر بے اختیار جوشؔ ملیح آبادی کی مشہور نظم (برطانوی) "سوداگروں سے خطاب" یاد آتی ہے جو یوں تمام ہوتی ہے :

خیر اے سوداگرو ! اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جُھکا دو گردنیں
وقت کا فرمان اپنا رُخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے یہ فرمان ٹل سکتا نہیں

شاعرنہ صرف "عہدِ وفا" نبھا رہا تھا، بلکہ وہ اس "جگنو" کو مٹھی میں تھامنے کی بھی کوشش کیا کرتے تھے۔

بورڈنگ اسکول کے دیوار کے پاس والی کیڈٹ کور کو تین چار بیدار مغز نوجوان افسر، جو پہلے یونہی سے ملاقاتی رہ چکے تھے، اب پوشکن کی ذہنی سیاسی تربیت کرنے لگے، اسے کتابیں اور خفیہ لٹریچر دیا کرتے۔

ان تینوں حلقوں میں کئی ایسے بیدار مغز موجود تھے جنھیں فلسفے پر (مثلاً چادئیف) کو، تاریخ پر (مثلاً کرامزین کو) اور ادب پر (مثلاً ڈلوِگ کو) پوشکن سے کہیں زیادہ عبور تھا، یا جن کی تنقیدی نظر اس بے چین بوٹی کو کسی حد تک قابو میں رکھنے یا خود تنقیدی کا درس دینے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

پوشکن، عیش اور طیش میں بے قابو ہو جانے والا نوجوان، نہ اس کہکشاں کے نور سے منکر ہوا، نہ اسے رائگاں جانے دیا۔ اپنے وقت کے انھی ستاروں سے اُلجھنا، انھی کے گلے لگ جاتا۔[۵]

"ارزماس" ادبی حلقے کے تجربوں نے اسے اور آگے بڑھایا، اب تک کسی حلقے کی ممبری سے کترا تا رہا تھا، (یا غالباً خفیہ سیاسی سرگرمی والے اس کی تیز زبانی اور برہمی کی وجہ سے ذرا کتراتے رہے) اب وہ ایک نیم ادبی، نیم سیاسی حلقے "ہرا لیمپ" (Зеленая Лампа) کا ممبر بن گیا۔ یہاں ادب کا ذوق رکھنے والے روشن خیال نوجوان آتے، ان میں جن کی سوجھ بوجھ یا جرأت بڑھتی، وہ خفیہ سیاسی پارٹی "انجمن رفاہِ عام" کے ممبر بن کر اس کے شمالی یا جنوبی بازو سے رابطہ قائم کر لیتے ____ جس کی بنیادی مانگ تھی کہ (۱) ملک سے مطلق العنانی بادشاہی ختم کر کے آئینی ریپبلک قائم کی جائے، (ب) زرعی نظام سے کمیروں کی غلامی (Serfdom) کا خاتمہ کیا جائے۔

"ہرا لیمپ" (بمعنی ہری جھنڈی) ایک تربیت گاہ تھی جہاں زارشاہی کے خلاف علانیہ قلم اور بندوق کا ہتھیار اٹھانے والے مستقبل کی خفیہ تیاریاں کرتے تھے:

> پوشکن کے ایک ہم پیشہ نکیتا فسیے ولوژسکی کے گھر، بڑے کمرے میں "ہرے لیمپ" کی بیٹھکیں ہوا کرتیں۔ جام کھنکائے جاتے۔ ادب اور تھیٹر خاص موضوعِ گفتگو تھے، لیکن ان کے درمیان گرما گرم سیاسی مباحثے چلتے اور نظامِ حکومت پر سخت سے سخت تنقید کی جاتی۔

سال بھر بعد کے ایک منظوم پیغام میں پوشکن نے "لیزیم" کے ڈائرکٹر اینگل گارڈٹ کو ان سرگرمیوں کی

---

[۵] کوخیل بیکر پر ایک مصرعے میں پوشکن نے پھبتی کسی تھی۔ ہنسی میں کھنسی ہو گئی۔ پوشکن نے چیلنج قبول کیا اور اسی کو پہلی گولی چلانے کا حق دیا۔ ڈوئل کے وقت پستول رنگ چاٹ گئی۔ اب وہ منتظر تھا کہ شاعر گولی چلائے۔ شاعر نے اپنا پستول پھینکا اور دوڑ کر بچپن کے دوست کو گلے لگا لیا۔ یہ دوستی عمر بھر قائم رہی۔

اطلاع یوں دی ہے:

> ہم لوگ کھلے دل سے، احمقوں پر، شر پسندوں پر، حکام پر، احکام پر اور آسمانی بادشاہ پر باتیں کرتے ہیں —— اور کبھی کبھی زمینی بادشاہ پر بھی۔

ادب اور تھیٹر کا شوق محض ایک مشغلہ نہیں تھا، واقعی اس زمانے کے پیٹرسبورگ میں تھیٹر کی ہر صنف بیلے، اوپیرا، ڈرامہ "شرفا" کا تہذیبی معیار بن گئی تھی۔ پوشکن کو بیلے کا جنون تھا۔ (یہ بعد کی نظموں، خصوصاً "ایوگینی انے گن" سے بھی ظاہر ہے) سمی نووا اور کولوسووا، اپنے وقت کی باکمال بیلے ڈانسروں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ "معززین شہر" دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے تھے، بیجا جملہ بازی پر تلواریں چل جاتی تھیں، پستول نکل آتے تھے؛ پوشکن کے ایک ہمدرد اور تھیٹر کے تنقید نگار کرنل کاتے نن کو ایسی ہی کسی جسارت پر شہر بدر کر دیا گیا تھا۔

پوشکن اس ماحول میں صاحبِ نظر بھی شمار ہوتا تھا، نگاہوں کا مرکز بھی۔ اہل دل بھی پسِ پردہ ربط ضبط رکھنے میں خود ایک فتنہ بھی۔ یہاں اس کی شاعری کے قدرداں تماشائیوں اور تماشے میں موجود ہوتے تھے۔ یہیں خفیہ انقلابیوں سے بھی دو دو باتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ عموماً تھیٹر ہال میں اگلی صفوں کی بائیں بازو کی کرسی پر پایا جاتا تھا اور بیٹھنے سے پہلے نظر گھما کر، سر جھکا جھکا کر لوگوں کی نگاہِ شوق کا جواب دینا اس کا معمول تھا۔ ایک بار آیا تو " Due de Berry " کے نوجوان قاتل لاوپل کی تصویر اس کے ہاتھ میں تھی جس پر لکھا تھا: بادشاہوں کو عبرت!

"من مانی" (Вольность) کی طرح دوسری نظم "کہانیاں" (Казки) تھی جس کا چرچا تو بہت ہوا، چھپ نہ سکی۔

سیاسی موضوع پر فرنچ میں ایک گانا ہے جس میں مریم و مسیح کے الفاظ اور انجیل کی اصطلاحوں کی لپیٹ میں سیاسی بے ایمانوں پر چوٹ کی گئی ہے۔ پوشکن نے اپنی نظم کا یہی نام رکھا۔ اشارہ بہت واضح تھا۔ ۱۵ مارچ ۱۸۱۸ء کو الیکساندر نے وارسا میں قومی نمائندوں کے افتتاحی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے دعوا کیا کہ جا بجا نمائندہ اور آئینی حکومتیں قائم ہونے کا وقت آگیا ہے اور عنقریب روس میں بھی آئینی اصلاحات کی جائیں گی۔ دکھاوے کی روشن خیالی اور آئین پسندی کا ڈنکا بجاتا ہوا جب شہنشاہ دھوم دھام سے دسمبر ۱۸۱۸ء میں وطن واپس آیا، تب پوشکن نے اس نظم سے استقبال کیا؛ جتنا طمطراق تھا، اتنا ہی یہ "ہجویہ گیت" عام ہو گیا:

گلے پر روس کے ہے اس کا پنجہ
گورنر پس گیا ایسا شکنجہ
سبق دیتا ہے ساری کو نسل کو
لیے مٹھی میں شہنشاہ کے دل کو۔
بڑا بد ذات ہے اور کینہ جُو ہے
ذہانت ہے، نہ پاس آبرو ہے
بتاؤ کون وہ ہے "سچا نمک خوار"
...... [1] مُرداروں کا مُردار ؟

۱۹-۱۸۱۸ء کی لکھی ہوئی دو اور مختصر نظمیں ہیں جنھیں کئی سال تک چھپنا نصیب نہ ہوا" چادئیف کے نام" اور "گاؤں"۔ دراصل چادئیف سے متعلق پوشکن نے ایک سے زیادہ نظمیں لکھیں اور وہ تھا بھی اس حلقے کا مفکر [2]۔ شاعر سے عمر میں صرف تین سال بڑا ہونے کے باوجود وہ ان چند خوش نصیبوں میں سے ہے، جن پر پوشکن نے کوئی چوٹ نہیں کی، پھبتی نہیں کسی، چادئیف کے علاوہ دوسرا گری بائیدیف (عقل کی بپتا " Горе от ума " کا مصنّف) پہلا دسمبر ۱۸۲۵ء کی بغاوت میں چمکا، دوسرا اپنی واحد نثری تصنیف سے، شہنشاہ نے ایک کو سائبیریا جلاوطن کیا، دوسرے کو ایران کی سفارت پر بھیجا اور عاشورہ محرّم میں وہیں مارا گیا۔ دونوں کا انجام المناک ہوا۔

ان تین برسوں میں طویل نظم "رسلان اور لودمیلا" کے علاوہ اس نے کوئی چھتیس نظمیں لکھیں جن میں سے چھ فوراً شائع ہوگئیں اور قینچی کی کاٹ سے گزر کر صرف ۲۵ نظمیں چھ سال بعد اور کوئی .۳ موت کے بعد نکلیں۔ تاہم "گاؤں" ایک ایسی نظم ہے کہ گاؤں گاؤں پھیل گئی اور کسانوں کی غلامی کا خاتمہ طلب کرنے والوں نے زبانی یاد کر لی:

---

[1] خالی جگہ پر صرف ایک نام موزوں ہوتا ہے.... ارکچایئف

[2] چادئیف کے نام جو نظم ہے، اس میں شاعر کی نگاہوں اور فنّی کاوشوں کا حجاب بالکل اٹھ گیا ہے اب اس نے اپنا انداز پالیا ہے۔ اس کی آواز غم و غصے سے لرزتی نہیں، تاجداروں سے نیک خواہشات اور توقعات کا دھند چھٹ گیا ہے، شاعر کو یقین ہے کہ روس خواب گراں سے بیدار ہونے والا ہے، من مانی حکومت کے پرزے اڑیں گے اور سرفروشوں کے نام امر ہو جائیں گے۔ اس نظم کا ترجمہ شاعر جاں نثار اختر نے کیا ہے۔

شاعر اپنے گاؤں کے آگے تعظیم سے سر جھکاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سیدھے سادے لوگوں کے پُر خلوص ماحول میں اسے دربارداری کے جھمیلوں سے نجات ملتی ہے، روح کو تسکین اور تخلیقی اُتساہ میسّر آتا ہے۔ سب خوبیاں ایک طرف، مگر یہ دیکھ کر دل اُداس ہے کہ جہالت، پس ماندگی، بے بسی اور مالکوں کے ظلم کی کوئی حد ہی نہیں۔ نہ رحم، نہ ہمدردی، نہ قانون؛ کاشتکار کے لیے، لہو پسینہ بہانے والے کے لیے یہ زمین کچھ اگاتی ہی نہیں۔ کنواریوں پر جوانی آتی ہے تاکہ بے رحم بدکاران سے کھیلیں....

کاش میری آواز سے دل دہل جاتے۔ سینے میں لاوا اُبل رہا ہے — کیا کروں.... دوستو، کیا مجھے وہ دن دیکھنا نصیب ہوگا کہ عوام پر ستم نہ توڑے جائیں، شہنشاہ کے ایک اشارے سے غلامی (کا ڈھانچہ) ٹوٹ کر گر جائے اور وطن کی سرزمین پر آزادی کا بول بالا ہو؟ — کیوں، انجام کار، کیا وہ بے مثال صبح نمودار ہونے والی ہے؟

اس نظم میں حالاں کہ "شہنشاہ کے ایک اشارے" کی ہلکی سی آڑ رکھی گئی ہے، لیکن تیر کمان سے نکلا اور نشانے پر بیٹھا۔ ۱۸۲۰ء میں، "من مانی" ہیں اور "ارکچائیف"[1] کی ہجو میں پوشکن کھُل چکا تھا، "ہرالیمپ" میں اس کی سرگرمیاں بھی محض ادبی یا فنی نہیں تھیں، شہر کے ہنگاموں کی دھمک بھی مخبروں کے ذریعے پہنچتی رہتی تھی۔ پھر تھیٹر میں نوجوان قاتل لاویل کی تصویر لے جانے اور دکھانے کا واقعہ — اور وہ نظمیں پوشکن کا جگری دوست پوشچن لکھتا ہے:

ان دنوں ہر طرف یہ نظمیں ہاتھوں ہاتھ گھوم جاتی تھیں۔ لوگ نقلیں لیتے اور زبانی یاد کر لیتے تھے...

شاید ہی کوئی متنفس ہوگا جسے اس کے شعر یاد نہ ہوں۔

دوسرے ہم عصر اور ہم عمر یاکوشکن کا بیان ہے:

اس کی تمام غیر مطبوعہ تحریریں.... نہ صرف یہ کہ سب میں مشہور ہو گئی تھیں، بلکہ ان دنوں شاید ہی کوئی شُد بُد رکھنے والا فوجی جمعدار ایسا ہوگا جسے یہ نظمیں زبانی یاد نہ ہوں۔ (ک نمبر ۲۸)

حکومت کا عملہ، خصوصاً ارکچائیف کا محکمہ منصبداروں کی اس ناخلف اولاد اور اپنے وظیفہ خوار نوجوان فوجیوں کی طرف سے اس قدر چوکنّا ہو چلا تھا کہ پتہ کھڑکتا تو اوپر تک خبر جاتی — ایک بار شاہ دیہہ میں بادشاہ سلامت حسبِ معمول ٹہلنے نکلے تو ریچھ کا بچّہ زنجیر تُڑا کر ان پر جھپٹا۔ خادم دوڑ پڑے، جان بچی۔ پوشکن نے

---

[1] نظم "کون ہے وہ" صہ ۲۸ پر۔

سُنا تو وہ بچّوں کی طرح خوش ہو کر بولا :

آخر ایک مرد بچّہ تو ملا ـــــ وہ بھی بھاؤ نکلا۔

"من مانی" نظم میں دو مصرعے ایسے ہیں جن سے الیکساندر کے باپ "پاویل کی ویران یادگار" کا نام لیتے وقت یہ اشارہ نکلتا ہے کہ تاجدار باپ کے قتل میں بیٹے کا دامن داغدار رہے۔

پوشکن کا اعمالنامہ سیاہ ہو چکا تو شہنشاہ نے فیصلہ کیا اس سیاہی کو بحرِ سفید (سائبریا) کی کسی ویران خانقاہ میں چند سال تک دُھلوانے کا انتظام کر دیا جائے۔

یار دوستوں کو پہلے سے دھڑکا لگا تھا، حکم نافذ ہونے سے پہلے ہی کاغذی گھوڑے دوڑنے شروع ہو گئے۔ ژوکوفسکی شہزادے کے اتالیق تھے، فوراً پہنچے، صفائی پیش کی، کرامزین نے سفارش کی ـــــ مگر جس خاموش طبع رحمدل انسان کا نام اختلافی مسئلہ رہا ہے، لیزیم کا بُردبار ڈائرکٹر اینگل گارڈٹ (Anglegardt) وہی آڑے آیا، خاص باغ میں ٹہلتے وقت شہنشاہ سے ملا اور زبانِ گوہر بارسے پوشکن کی مجوزہ سزا کا فیصلہ سن کر ادب کے ساتھ بولا :

"عالی جاہ کا جو حکم ہو، بجا، برحق! تاہم اگر اجازت مرحمت ہو میں (فدوی) اپنے پرانے زیرِ تربیت لڑکے کی بابت کچھ عرض کرنے کی جسارت کروں : اس نوجوان میں غیر معمولی جوہر نمودار ہو رہا ہے جسے حضور کا رحم و درگزر درکار ہے۔ فی الوقت پوشکن ہمارے موجود ادب کا زیور ہے، مستقبل میں اور بھی امیدیں وابستہ ہیں۔ نوجوان کی تیز طبیعت کو جلاوطنی بالکل ہی بجھا کر رکھ دے گی میرے ناقص فہم میں تو یوں آتا ہے کہ حضورِ عالی غریب پروری سے کام لیں، سرکار صرف تادیب فرما دیں۔"

سفارش کارگر ہوئی، آئی بلا سر سے ٹل گئی۔ حکم ہوا کہ چھ سال کے لیے پیترسبورگ چھوڑ دے۔ چوں کہ سرکاری عہدیدار تھا تبادلہ کیا گیا کہ روس کے جنوبی مقبوضات کے صدر دفتر "ایکاترنیوسلاف" میں اپنی ڈیوٹی پر رپورٹ کرے۔

۶ مئی ۱۸۲۰ء کو محکمہ خارجہ کا سیکشن افسر الیکساندر سرگے ئچ پوشکن جب پیترسبورگ سے رخصت ہوا تو آسمان پر بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد شاعر کو پہلی بار محسوس ہوا کہ باہر اور اندر کی دُنیا کا تضاد چھٹ گیا ہے۔

رُسلان اور لودمیلا

پوشکن کی باہر کی دنیا دیکھنے والوں کو گمان بھی نہ تھا کہ ان تین برسوں میں وہ ایسی طویل بیانیہ نظم لکھنے میں مصروف رہا ہے جو تین ہزار مصرعوں تک جائے گی اور آئندہ صدی تک روس کی بیانیہ نظموں کے لیے بحر اور وزن کا معیاری پیمانہ بن جائے گی۔ آنے والی روسی نسلیں جوان ہونے سے پہلے اس نظم کو پڑھ کر قدیم قصّے کہانی اور جدید، بے تکلّف طرزِ بیان سے آگاہ ہونا، پوشکن کی شاعرانہ شرارتوں اور تفریحوں سے لطف اندوزی اپنا فرض سمجھا کریں گی۔ آج تک یہی ہو رہا ہے[1]۔

رُسلان اور لودمیلا کا قصہ، کیئف راج کی راجکماری لودمیلا اور چار امیدواروں کا قصّہ ہے۔ ایک رتمیر، دوسرا راگدے متی، تیسرا فرلاف، چوتھا خاص روسی راجکمار رسلان۔ لڑکی اپنے پسندیدہ رسلان سے بیاہ دی جاتی ہے۔ شادی کی رسمیں انجام دینے کے بعد جب نوجوان جوڑے کو ان کے مہکتے ہوئے عروسی کمرے میں پہنچا دیا جاتا ہے، "جلن کے مارے ہوئے لباس بازنطینی قالینوں پر گرنے شروع ہوتے ہیں . . . اور دولھا بے اختیار ہونے لگتا ہے" تو عین اسی لمحے کڑک، گرج، بجلی، کمرے کے روشن دان میں سے لڑکی کو انجانی طاقت کھینچ کر لے گئی۔ ایک بالشتیا ہوسناک جن اسے پہاڑوں کے پیچھے اپنے طلسمی راج میں کھینچ لایا۔ بادشاہ نے طیش میں آکر اعلان کر دیا کہ چاروں امیدواروں میں سے جو کوئی بھی اس لڑکی کو تلاش کر لائے گا۔ میں اسی سے شادی کر دوں گا۔ اب چاروں اپنے اپنے کردار اور ہمّت کی خوبی و خامی لیے ہوئے سر بکف نکلتے ہیں۔ فرلاف کو کھانے پینے کی لت ہے، وہ اپنی مہم کے دَوران شراب پر گرتا ہے، تن آسان رگدائی لڑکیوں پر، رتمیر مشکلات کا سامنا کرتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے۔

---

[1] اس داستانِ منظوم کو روسی اور دوسری کئی زبانوں میں فلمایا گیا اور فلم کی حیثیت سے بھی نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ ہندوستانی میں اسے ظ انصاری نے ڈھالا ہے۔

لیکن اسے لو دمیلا کی اتنی لگن نہیں، اسی لیے رسلان سے رقابت بھی جوش نہیں مارتی ـــــ آخر رسلان اس ظالم داڑھیل "چرنا مور" کے راج میں جان کی پروا کیے بغیر گھس پڑتا ہے۔

اپنی "گمشدہ جنت" کو دشمن کے پنجے سے چھڑا لاتا ہے اور بڑی دھوم دھام سے ان دونوں کی رخصتی ہوتی ہے؛ قصہ تو صرف اتنا ہے مگر اس میں پر و بال بہت ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ طویل نظم ہلکے پھلکے انداز میں لکھنی شروع کی تھی، غنائی اور رومانوی لہجے میں ایک پرانی وضع کی جادوگر والی داستان۔ شروع میں انتساب بھی کچھ ویسا ہی ہے:

"میرے دل و جان کی مالک، حسیناؤ! قیمتی فرصت کے لمحوں میں، بھولے بسرے وقتوں میں، قلم سنبھال کر، جی لگا کر میں نے .... یہ داستان نظم کر دی ہے۔ ایک شوخ قلمکاری قبول کرو، میں تم سے تعریف نہیں کرتا۔ بس اسی امید میں مگن ہوں کہ کوئی لڑکی، محبت کے مارے دھڑکتا ہوا دل سنبھالے، ممکن ہے، سب کی نظر بچا کر یہ نظم پڑھے، میرے خطاوار نغمے پر ایک نگاہ ڈالے۔"

یہ شوخ و شنگ نظم رواں دواں کھلنڈرے لہجے میں شروع ہوتی ہے، مگر قدیم الفاظ اور محاوروں کی ڈھلان پر یونان و روم کے استعاروں کے کنکر پتھر لڑھکاتی اس تیزی سے بڑھتی ہے، گویا کوہستانی سلسلے پر گھٹا برسی، ندی نالے بڑھ کر آبشار ہوئے، آبشار دریا بنا، بلندیوں سے میدان میں اترا اور آہستہ خرام (عالمی ادب کے) سمندر سے ہم آغوش ہوگیا۔

سارے کردار افسانوی ہونے کے ساتھ جیتے جاگتے ہیں اور ہر قسم کی انسانی کمزوریوں میں مبتلا ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ فضا طلسمی بھی ہے، سچ مچ کی بھی، لہجہ قدیم داستانوں کا سا ہے، کردار عام انسانوں کے سے ـــــ بیچ بیچ میں شاعر کی آواز ("سوتر دھار" کی طرح) سنائی دیتی ہے، جو قصّہ جوڑتا، ریمارک کستا اور تصویر میں رنگ بھرتا چلا جاتا ہے۔ بھولی بھالی ہیروئن مصیبت میں ہے، مگر ہمیں اس کے حال پر رونا نہیں آتا، بلکہ بعض اوقات ہنسی آتی ہے۔ اپنی بے بسی پر روتے وقت بھی وہ آئینہ دیکھنے سے باز نہیں آتی ہے؟ "چرنا مور" جادو کے زور سے خاصے کے کھانے اس پر اتارتا ہے، وہ منھ پھیر کر بیٹھ جاتی ہے کہ نہیں چکھوں گی، مگر بھوک اور مہک کے مارے چکھ لیتی ہے اور خوب سیر ہو کر کھاتی ہے۔ عجب من موجی اور بے فکر لڑکی نکلی ـــــ چرنا مور کی طلسمی ٹوپی اٹھا کر کبھی پہنتی ہے، کبھی اتارتی ہے اور یوں کبھی نظر کے سامنے، کبھی نظروں سے اوجھل۔ شاعر کہتا ہے کہ میری "لو دمیلا" اس الھڑ پن اور شوخی سے اور بھی دلکش ہو گئی ہے۔

لو دمیلا کی دلکشی نے داستان میں دلکشی بھر دی۔ یہاں بھی البم کے ورق اس طرح الٹتے ہیں کہ

ابھی جنگی مارکہ تھا، اور ابھی جل پریوں سے چہلیں ہو رہی ہیں، ابھی شوخ رنگ تھے، ابھی دھیمے، ملگجے اور سنجیدہ رنگ ابھرنے لگتے ہیں۔ اور ہر ایک رنگ قدرتی، ہر ایک منظر کا بیان اُبلتا اُچھلتا ہوا۔

نظم جوں جوں انجام کی طرف بڑھتی ہے، رفتار دھیمی ہوتی جاتی ہے۔ فنکار کی غیر معمولی توجہ اور فنکاری بڑھتی جاتی ہے۔ "رسلان" قدیم روسی سورما کی طرح اپنی ہمت، برداشت اور قوت کے جوہر دکھانے لگتا ہے۔ اور روس کے "زورِ شمشیر" کا نام لیتا ہے۔ اور لب و لہجہ طلسمی داستان سے تاریخی معرکوں کی طرف مُڑ جاتا ہے۔ شاعر کو لڑکپن سے تاریخ کے مطالعے سے لت تھی، پھر جس ماحول میں بسر کر رہا تھا، وہ بھی نئے معرکوں کی سنجیدہ تیاری میں مصروف تھا۔ مشقِ سخن نے بھی اس سے سنجیدگی، وزن و وقار کا مطالبہ کیا ہوگا۔

یہ اور ان کے سوا اور بھی سبب ہوں گے کہ داستان سرائی کے تمام کلاسیکی اصولوں سے انحراف کرنے کے باوجود، مکمل آزادانہ اسلوب اختیار کرنے کے باوجود، تخیل اور سلاستِ بیان کے پروں سے بلند پروازی دکھانے کے باوجود شاعر نے آہستہ سے ایک موڑ کاٹا۔ اور نظم کے بیان میں، بحروں کی تبدیلی میں، چھ چھ قافیہ بند مصرعوں کی ایکسار آواز پیدا کرنے میں، سلاست کے ساتھ صلابت کا احساس جگانے میں، قبیلوں، قلعوں اور یلغاروں کا سچا منظر دکھانے میں "رسلان اور لودمیلا" کو ایک یادگار، تازہ ترین نمونہ بنا دیا۔

وہ جو کہتے تھے کہ "ہرالیمپ" والے باتیں بڑی بڑی کرتے ہیں، مگر کلاسیکی خزانے کے سامنے انھوں نے اپنا کوئی جدید طرزِ سخن، کوئی معرکے کا شاعرانہ نمونہ پیش نہیں کیا، ان کی زبانیں بند ہوگئیں۔

مارچ ۱۸۲۰ء میں نظم تمام ہوئی اور فوراً پریس کے حوالے کر دی گئی۔ ابھی مکمل شائع نہ ہوئی تھی کہ اس پر سخت اور بے رحم تبصرے نکلنے لگے۔

یہاں تک تو درست تھا کہ نظم کے اُٹھان پر اطالوی شاعر اریستو (Ariosto) کی افسانوی نظم (Неистовый Орланд) کا اثر تھا، اور والیتر کی "اورلین کی دوشیزائیں" نے خاص طور سے پوشکن کو فیض پہنچایا، لیکن خیال بہر حال شاہنامے کی "داستانِ رستم" کی دین ہوگا۔ "رستم" نے فرانس اور انگلستان میں کئی افسانوی سورما پیدا کیے، "رسلان" بھی انھی کی نسل ہے۔ رستم کی طرح "رسلان" بھی "ہفتخواں" عبور کرتا ہے، پہاڑ پتھر برساتے ہیں، جنگل درخت گراتے ہیں، شیر جھپٹ کر حملہ کرتا ہے،

نیم عریاں حسینائیں راستہ روک لیتی ہیں۔

کچھ بھی ہو، پوشکن کی نظم" رسلان اور لودمیلا" کلاسیکی قدامت پرست تنقید اور رومانی نکتہ چینی کا راستہ کاٹ کر روشنی کی ایک لکیر بن گئی اور جب انہی دنوں پوشکن کو شعروادب کے برادر بزرگ ژوکوفسکی کی ایک تصویر تحفتہً ملی تو اس کے نیچے لکھا تھا:

شکست خوردہ استاد کی طرف سے فاتح استاد کے نام، اس عالی شان تاریخ پر، جب اس نے اپنی نظم رسلان لودمیلا مکمل کرلی۔

" ارزماس" اور" ہرالیمپ" والے نوجوان فنکاروں کی پیش رَو نسل نے گویا پوشکن کو روس کی بلند بانگ اور نئی شاعری کے میدان کا فاتح تسلیم کرلیا۔ (ک نمبر۱۴ صفحہ ۱۳-۲۱۱)

چوتھا باب

(۱۸۲۰-۱۸۲۴ء)

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

(غالب)

رسوائیاں ایک طرف۔ مگر پایۂ تخت کی بھری بزم سے نکلتے وقت، اس کے سینے میں کوئی ایسی چنگاری تھی جو دبی رہ گئی، کہیں کسی جگہ دل لگا ہوا تھا، اس کے اشارے تو ملتے ہیں، مگر نہ اس عشق کو برابر کا جواب ملا، نہ گرہ کھلی، نہ راز کھلا۔

اس کے رخصت ہونے کے دس دن بعد بزرگوار کرامزین نے پرنس ویازیمسکی کو لکھا:

.... چند روز ہوئے، پوشکن آیا تھا، آزادی پر کچھ نظموں کی اور ہجویں جو لکھ دی ہیں، ان کی مارے موڈ بگڑا ہوا تھا۔ مجھے زبان دے گیا ہے کہ گڑبڑ نہیں کرے گا۔ خیر سے کرائمیا روانہ ہوگیا.... سفر خرچ کے طور پر ہزار روبل ملے ہیں۔ بظاہر وہ متاثر نظر آتا تھا کہ سرکارِ عالی نے عالی ظرفی سے کام لیا۔ واقعی اس کے دل کو چھو گئی یہ بات....

تفصیل طولانی ہے، لیکن اگر پوشکن اب بھی نہ سنبھلا تو جہنم کا کُندہ ہوجائے گا....

"میں نہ اچھا ہوا ـــــ بُرا نہ ہوا"

پوشکن بھلا کہاں سنبھلنے والا تھا! ۶ مئی کو بیلوروس والی شاہراہ سے لگاتار گھوڑا گاڑی بدلتا ہوا چلا، مئی کے آخر میں اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو بخار چڑھ گیا۔ ایکاتری نوسلاف جنوب کا سرکاری شہر تھا۔ چھاؤنی، دفتر، کلرک، عہدیدار، کوئی واقف کار نہیں۔ اتنے میں پیٹرسبورگ کا ایک پرانا ملاقاتی نکولائی رائیفسکی آپہنچا۔ بیمار سے ملنے آیا تو حالت خراب دیکھی۔ باپ سے کہا، وہ بڑے نامور جنرل تھے، انھوں نے ہیڈکوارٹر کے چیف اور گورنر انزوف سے بات کی۔ پوشکن کو اس خاندان کے ساتھ قفقاز جانے اور اپنی صحت سنبھالنے کی اجازت مل گئی۔ اور پوشکن کو یہ مہذب، تعلیم یافتہ، سلیقہ مند اور ہمدرد کنبہ ایک ڈاکٹر سمیت قفقاز کے صحت بخش مقام پتی گورسک لے گیا۔ یہاں جابجا گندھک کے گرم چشمے ہیں، انھی میں نہایا، انھی کا پانی پیا،

---

۱ ؎ "بول پون چکی" نظم

ہفتہ بھر میں اس قابل ہوگیا کہ دُور دُور پہاڑوں اور گھاٹیوں میں نکل جاتا تھا۔ دو مہینے یہاں ٹھہرنے کے بعد یہ قافلہ کرائمیا کی طرف روانہ ہوا جہاں جنرل کی بیوی دو نو عمر بیٹیاں ان لوگوں کے انتظار میں مقیم تھیں۔ بستی گورسک سے دریائے کوبان کے کنارے "تمن" کی بندرگاہ پہنچے، وہاں اسٹیمر پر سوار ہوکر کرخ اور فیوڈوسیا ہوتے ہوئے گورزوف اُترے۔ یہاں —— بحرِ اسود میں شاندار اور شہرۂ آفاق بندرگاہ یالٹا سے ذرا فاصلے پر جنرل رائیفسکی کی جاگیر تھی، باغات، فوارے، بنگلہ —— اور بڑی سی لائبریری۔

گرمی کا موسم، پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے باغات، پہاڑی نشیب و فراز اور سامنے سمندر۔ روح تازہ ہوگئی۔ پیتر سبورگ کی ساری "رنگ رلیوں میں اُترے ہوئے" پوشکن نے چلنے سے دو مہینے پہلے اپنے رفیق و غمگسار ویازیمسکی کو لکھا تھا:

"پیتر سبورگ شاعر کا دَم گھوٹنے والی جگہ ہے۔ دور کہیں پردیس نکل جانے کے لیے بے تاب ہوں۔ دھوپ بھری ہَوا میں سانس لوں تو جان میں جان آئے۔"

قفقاز کی روپہلی دھوپ نے، نرم، خوشگوار ہَوا نے، بیماری کے حملے سے گزر کر بحرِ اسود کے کنارے، رات گئے، جھونک کھاتے ہوئے پوشکن پر عین عالمِ سفر میں ایک نظم نازل ہوئی اور وہ اس کی ذہنی کیفیت کی ترجمان ہے۔

"رات بھر آنکھ نہیں لگی۔ چاند غائب، ستارے ٹمٹمارہے تھے؛ نظر کے سامنے دُور دُھندلکے میں جنوب کا پہاڑی سلسلہ.... کپتان نے بتایا —— وہ دیکھو چتر داغ آگیا...."[1]

غالباً اس بستی میں پَون چکّی کی دھونکنی چل رہی ہوگی، اس کی آواز سے شاعر نے اپنی نظم کی آواز ملائی ہے۔

دن کا تارا ڈوب گیا
نیلے سمندر پر پھیلی شام کے کُہرے کی چادر
بول پَون چکّی شُوں شُوں، تیرا پہیہ چُرخ چوں
گھور سمندر لہریں لے، لہریں میرے پاؤں تلے

---

[1] "بول پَون چکّی" نظم۔

دُور کنارے کی دُنیا
دھوپ بھری دھرتی کے طلسمی دیسوں کا پیارا منظر
سینے میں ہے ایک تلاطم، گیوں کر ساحل کو چھُولوں
بیتے دنوں کی یادوں سے جی ڈوب رہا ہے شام ڈھلے

دامن بھیگا آنکھوں کا
دل پر پھر جانے پہچانے سپنوں نے ڈالا سایہ
تن میں شرارے، روح لرزتی ہے تھر تھر
کیسے دِوانے دن گزرے ہیں، کیا تھا وہ اُلفت کا جنوں!
آج وہی ہیں دل کو پیارے، دل پر جن کے تیر چلے
ارمانوں اور اُمیدوں کا رنگ اُترا، ٹوٹا افسوں
بول پَوَن چکّی شُوں شُوں، تیرا پہیہ چُرخ چُوں
گھور سمندر لہریں لے، لہریں میرے پاؤں تلے

دُور کہیں مجھ کو لے جا
تیز ہَوا میں بہنے والی کشتی، چل چل موجوں پر
لَہر بَہر کے ناز اُٹھاتا دُور کناروں تک پہنچوں
میرے دیس، مری دُکھیا نگری کے دُھندسے چل بچ کر
دیس جہاں چنگاری سُلگی اور جذبے شعلوں میں پَلے

میرا دیس جہاں اُتساہ نے سینے کا پٹ کھولا تھا
جس میں کلا کی دیوی نے مُسکا کر گھونگھٹ کھولا تھا
دیس جہاں آغازِ جوانی کی پہلی کونپل پھوٹی
دیس جہاں طوفان اُٹھا اور ساری پھُلواری لوٹی
دیس جہاں سُکھ چین نے مجھ کو چھب دکھلا کر مُنھ پھیرا

سونپ دیا غم کے ہاتھوں میں دل میرا۔

کھوج نیارے رنگوں کی، دُور مجھے لے آئی ہے
تجھ کو تج کر نکلا ہوں اے میرے پُرکھوں کے وطن؟
عیش و طرب کے متوالو، تم سے جان چھڑائی ہے؟
سیلانی ہے عہدِ جوانی، سیلانی کے یار ہو تم
اور تم پینگ بڑھانے والی، راہوں کو اُلجھانے والی، نام بڑے، تھوڑے درشن
راحت کھوئی، لاج گنوائی، اپنی مرضی ہاتھ سے دی
پیار کیے بن خود کو لٹایا تم پر، جھوٹا پیار ہو تم
تم کو بھی میں بھول چکا ہوں، صبحِ بہاراں کی کلیو
(اے میری مرادوں کی کلیو)
پریم کے بھاؤ مدھر تھے لیکن پریم بڑا ہرجائی ہے۔
بھول چلا، پر زخم ہرے ہیں، کیوں کر اپنے زخم بھروں!
بول پَوَن چکّی شوں شوں، تیرا پہیہ چرّخ چوں
گھور سمندر لہریں لیے، لہریں میرے پاؤں تلے

چند مہینے بعد اپنے بھائی لیو کو خط میں بتایا کہ:

آزاد پہاڑی قبائل کے کھیت میدان نظر کے سامنے دُور دُور پھیلے تھے۔ ساٹھ قزاق (Kaзaки) اور ایک بھری بندوق کی حفاظت میں ہم سفر کر رہے تھے۔ اندازہ کرو کہ خطرے کا یہ سایہ رومانی تخیّل کو کیسا راس آیا ہوگا....

میرے عزیز، میری زندگی کے بہترین لمحے معزز رائیفسکی کے گھرانے میں گزرے ہیں، خود سوچو، کتنا شاد ہوں گا میں کہ بے فکری کی آزاد زندگی، ایسے پیارے خاندان کے ماحول میں، ایسی زندگی جس کا میں اتنا شیدائی رہا مگر کبھی نصیب نہ ہوئی تھی....

رات کو سوتے سوتے جاگ اُٹھنا سمندر کا شور سُنتے رہنا مجھے پسند تھا۔ رات رات بھر سُنتا رہتا۔ گھر سے دو قدم پر سرو کا پودا (سرو قامت) کھڑا تھا؛ روز صبح اسے دیکھنے جاتا، ایسی وابستگی ہو گئی

جیسے کبھی کی دوستی ہو....

کرائمیا کے بارے میں شاعر نے پہلے سے (ایک محبوبہ کی زبانی) سُن رکھا تھا کہ باغیچہ سرائے کے مقام پر تاتاری خان حکومت کے زمانے میں کسی والیِ ریاست نے اپنے ناکام عشق کی یاد میں فوّارہ بنوایا تھا جس کے نلکے سے بوند بوند کرکے پانی گرتا ہے اور خان کے نہ تھمنے والے آنسوؤں کی زندہ جاوید یادگار بن گیا ہے۔
یورزوف سے یہ جگہ زیادہ دُور نہ تھی، پوشکن سمیت پورا خاندان اس تاریخی مقام کی سیر کو نکل گیا:

"ہم کھڑی چٹانوں پر پیدل گئے۔ تاتاری ٹٹوؤں کی دُم پکڑے پکڑے چڑھائی طے کی۔ بے حد لطف آیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی پُراسرار مشرقی Rite ہو....

سینٹ جارج کی خانقاہ، اس کی بے تکی سیڑھیاں جو سمندر میں اُتر جاتی ہیں، دل پر گہرا نقش چھوڑ گئیں۔ وہیں میں نے دیانا (Diana) دیوتا کے عظیم الشان کھنڈر دیکھے....

آخر یہاں روحِ سخن مجھ میں بیدار ہوگئی....

(ویران) محل کا ایک چکّر لگایا، دیکھ کر غصّہ آیا کہ کیسے بے پروائی سے یہ آثار بربادی کے حوالے کر دیے گئے ہیں۔ بعض مکانات (دالان اور دیوان خانے ــــ ظ ا) یوروپی انداز پر تعمیر ہوتے تھے۔
N. N. نے زبردستی کرکے مجھے کائی لگے زینے پر کھینچا، خان کا حرم سرا اور قبرستان دکھانے لے گئی۔

مگر یہ دل مرا

اور ہی فکروں میں تھا ڈوبا ہوا

مجھے بخار چڑھا تھا...."

یہ "این این" کون ہے؟ ظاہر ہے کہ رائیفسکی خاندان کی چار ہمسفر بیٹیوں میں سے کوئی ایک۔ اکثر سوانح نگاروں نے نشاندہی کی ہے کہ وہ تیسری لڑکی ماریا تھی، عمر ۱۵-۱۴ سال۔ تیکھا ناک نقشہ، چھریرا بدن، سرکش اور ضدّی طبیعت، کھایا پیا شاداب جسم، چہرے پر الھڑپنے کے ساتھ وسیع مطالعے کی سنجیدگی۔ پوشکن نے غالباً بڑی احتیاط برتی، اظہار تک نہ کیا۔ کیوں کہ بقول خود:

محبت کے عالم میں مجھے چُپ لگ جاتی ہے؛

تین سال تک پیٹرسبورگ کی عیش پسند تتلیوں میں گلچھرے اُڑا لینے کے بعد وہ عیّاشی اور عشق کا فرق جان گیا تھا۔ جو کسر رہ گئی ہوگی وہ جنوب کے ان چار برس میں پوری ہوگئی، عشق نے دوبارا اس کا دامن کھینچا، دوبارا اس کچے سونے کو سوز و ساز کی کٹھائی میں ڈالا، تپایا اور کندن بنا کر نکالا (تفصیل بعد میں آئے گی)

یورزوف کے اس ہرے بھرے، خوش و خرّم ماحول میں اسے دو اور شناسا بھی ملے جو لکڑی کی بھاری الماریوں میں موجود تھے؛ اور اسے پھسلواں زینے سے اوپر سہارا دینے والے: والتیئر اور بائرن۔ دونوں کی اُفتادِ طبع الگ الگ۔

یورزوف کی تصانیف تو وہ لڑکپن سے پڑھتا آیا تھا، بدلے ہوئے ماحول اور پسِ منظر میں والتیئر کی معنویت اور کھلی۔ والتیئر کی قاموسی (Encyclopaedic) نگاہ، استدلال، مذہبی عقائد کو للکارنے کی قوت، سائنسی طرزِ فکر، تہذیب، سماج، قانون اور رسم میں آزادہ روی اور بے باکی برتنے کا حوصلہ ــــــ اور پھر جوشِ بیان۔ یہ صفات نوعمر پوشکن کو پہلے ہی اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ بائرن کا نام ان دنوں یوروپ کی طرح روس میں بھی گونج رہا تھا۔ یورزوف کی ذاتی لائبریری میں سے مکمل بائرن برآمد ہوا۔ انگریزی ادب کے رومانی پیغمبروں میں سب سے زیادہ گونجنے والا بائرن۔ جنوب کی ٹُھنک ہوا، رومانی فضا، نرم رَو شب و روز، آہستہ خرام سمندر، یوروپ میں ہنگاموں، بغاوتوں اور آزادیوں کی لہر۔ اور بائرن کا نام اس سے وابستہ اپنے ہیرو " Child Herald " کا ان لفظوں میں تعارف کرانے والا بائرن۔

'پہاڑ اس کے دوست تھے اور خود نگر سمندر اس کا طوفان'

خاص اسی تصوّر کی فطری فضا میں پوشکن کے ہاتھ لگا۔ انگریزی کی صرف شُد بُد تھی۔ بڑے لڑکے الیکسانڈر رائیفسکی نے شوق سے اپنی پسند کا انگریز شاعر پوشکن کے گلے اُتار دیا۔ اس بے چین اور آزادی پسند نوجوان پر، جو خود بھی بائرن کی طرح بانکا، البیلا اور دل فریب تھا، یہ جادو ایسا چلا کہ کئی برس تک نہ اُترا۔

۸۰ دن کا یہ مختصر وقفہ اس کی زندگی کا سب سے خوشگوار، کارگر اور فکر انگیز زمانہ ثابت ہوا "جس راحت کو میں اپنے گھر میں ترستا تھا، وہ اس خاندان میں نصیب ہوئی"۔ قفقاز کے مسافرنے، باغیچہ سرائے کی سیر نے، اس مشرق کے دیدار نے، جس کے گیت گائے جا رہے تھے مغرب میں[1] اُٹھتی جوانی کی نرم نگاہی نے، بائرن کے مطالعے نے پیٹرسبورگ سے جُدائی کا غبار آئینۂ دل سے دھو ڈالا اور اسے آئندہ سفر کے لیے تازہ دَم کر دیا اور انھی دنوں کا غیبی تحفہ تھی وہ ڈرامائی اور بھرپور نظم "بغچہ سرائے کا فوارہ"

---

[1] یہی وہ زمانہ ہے جب جرمن شاعروں، خاص کر گوئٹے کے کلام اور "دیوانِ مشرق" کے قبولِ عام کی بدولت مشرق کی بزم گرم اور افسانوی دنیا کے گُن گان ہو رہے تھے۔ اس کی گونج اوّل فرانس میں اور پھر روس میں۔

جن دنوں وہ نقاب پوش جلاوطنی کے لیے رختِ سفر باندھ رہا تھا۔ (اپریل ۱۸۲۰ء) اپنے بارے میں اس نے لکھا:

ابتدائے سن سے ہی جنگی جاہ و جلال کی طرف میرا دل جھکتا ہے۔

اور اب وہ جاہ و جلال نظر کے سامنے تھا، کانوں میں گونج رہا تھا۔ نرم رفتار دریائے دون (Дон) کے کنارے کسان جا بجا بغاوت کا علم بلند کر رہے تھے۔ اپنی ڈیوٹی پر ایکا ترینا سلاف پہنچتے ہی خبر ملی کہ دیہات میں بے چینی انتہا کو پہنچ چکی ہے، طوفان برپا ہے، سیکڑوں نہیں، ہزارہا آدمی نرغہ کرکے اپنے افسروں اور مالکوں کو بے دخل کر دیتے ہیں۔ خطا قصور کچھ نہیں مانتے، سامنا کرتے ہیں اور دوٹوک کہتے ہیں کہ پوری آزادی چاہیے۔

پھر جب چند روز بعد وہ رائیفسکی والوں کے ساتھ قفقاز روانہ ہوا تو راہ میں دیکھا کہ جنگی قزاق ترچھی کلاہ، پاپاخ کسے، جب دیکھو، چاق چوبند، لڑنے مرنے کو تیار، گھوڑے کُداتے پھر رہے ہیں۔ اس منظر سے بھی پھریری آتی ہوگی۔ جس گھرانے میں ٹھہرا وہاں تکلف کے ساتھ بے تکلفی کے لمحوں میں سیاسی بحث بھی چھڑ جاتی تھی۔ پتہ چلا کہ جرمنی میں روسی حکومت کے (صاحبِ قلم) سیاسی ایجنٹ کوچے بو (Коцебу) کے نوجوان قاتل زند کو پھانسی کا حکم ہوا، اسپین میں، پرتگال میں بغاوت بھڑک اٹھی، شخصی حکومت کو دب کر انقلابیوں کا مطالبہ ــــ آئینی حکومت ــــ ماننا پڑا ــــ اطالیہ میں کوئلے کی کانوں سے جمہوری نظامِ حکومت کی مانگ اٹھی اور جنگل کی آگ بن کر پھیل گئی۔ آسٹریا کی جبری حکومت اور پاپائے روم دونوں کے خلاف جنگی مظاہرے ہو رہے ہیں۔ نپولین نے بادشاہوں کے گرز اور کلیسا کی عصا، دونوں رکھوا لیے تھے، اب ان رجعت پرستوں کے چودھریوں نے، زار الیکساندر اوّل کی رہنمائی میں ویانا کانگرس کے فیصلوں کے ذریعے پھر انھی کو بحال کرنا چاہا تو ہر طرف آگ لگ گئی۔ خود روس بھی اس کی آنچ میں تپ رہا تھا۔ کسانوں کی احکام کی نافرمانی یا بلوے کے علاوہ، ایک دم سیمونوفسکی رجمنٹ میں عام فوجیوں نے بدسلوکی کے خلاف بغاوت کر دی۔ بغاوت تو خیر فولادی پنجے نے کچل ڈالی، مگر بادشاہ سلامت کی نیند حرام ہو گئی کہ

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

اور انقلابیوں کو بھی آس بندھی کہ فوج کا لہو گرم ہے، شعلہ دے گا۔

چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی یورزوف کے دورانِ قیام میں بائرن کے رنگ کی بیانیہ نظم "قفقاز کا قیدی" لکھنی شروع کر دی۔ غالباً وہ تمام نہیں ہوئی تھی کہ اسے واپس اپنی ڈیوٹی پر آنا پڑا۔ اب یہ دفتر مولداویہ کے

صدر مقام کشی نیف (Кишенев) میں منتقل ہو گیا تھا۔ ترکوں سے چھینا ہوا شہر، جہاں ترکوں، یونانیوں، ولماتیوں، مولداویائی ٹھیکیداروں اور بیوپاریوں کی چہل پہل تھی، مشرقی طرز کی گلیاں اور بازار —— جنرل اِن زوف ہی اس کا سربراہ تھا، ایک شریف النفس، مردم شناس، قدر داں اور درگزر کرنے والا خاندانی جنرل۔ اس نے ہونہار شاعر کو ہر طرح کی چھوٹ دے دی۔

کشی نیف کے کسی پرانے باشندے نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے:

صبح سویرے وہ ہاتھ میں کاغذ پنسل لیے شہر سے باہر گھومنے نکل جاتا۔ دن چڑھے واپس آتا تو کاغذ شعر شاعری سے بھرے ہوتے....

دن کے بیشتر حصے میں وہ یا تو گھوڑے کی سواری کرتا، تاش کھیلتا (بازی بدکر) یا پھر یونانی اور مولداویائی لڑکیوں کے چکر میں پڑا رہتا....

یہاں بھی اس نے ڈوئیل لڑے۔ نشانے کا پکا تھا، سلامت رہ گیا۔ یہیں کے ایک اور ملاقاتی نے اپنے تجربے کا خلاصہ یوں کیا ہے کہ پوشکن ویسے تو ایک دَم طیش یا جوش میں آجاتا تھا لیکن اپنے اوپر غضب کا قابو تھا۔

جب معاملہ بالکل ہی اُبلنے کی حد کو پہنچنے لگتا تو یوں پیش آتا جیسے برف۔

بسرابیہ کا علاقہ[1] لگا ہوا تھا، لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ پوشکن نے تعلقات پیدا کیے اور ایک دن شہر سے لاپتہ ہو گیا۔ کئی دن سُن گُن نہ ملی۔ وہ بسرابیہ کے ویران علاقے میں خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ گھومتا پھرتا؛ یہ اس کے بھائی کا بیان ہے، لیکن دفتر کے کاغذات بتاتے ہیں کہ جنرل دو سال تو چشم پوشی کرتا رہا۔ آخر روز روز کی شکایتوں سے تنگ آکر اسے ایک مشکل سرکاری کام دے دیا اور بوجاک (بسرابیہ) کے مقام "اسماعیل" پر بھیج دیا۔ یہیں وہ کسی خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ لگ گیا، اور کچھ دن بعد لوٹ آیا۔" روز روز کی شکایتیں" کیا تھیں؟ ۷۰۰ روبل سالانہ تنخواہ[2]، کبھی کبھی گھر سے کچھ روپیہ آجاتا اور کچھ نظموں کی اشاعت سے۔ اچھی خاصی رائلٹی "قفقاز کا قیدی" شائع ہونے کے بعد ملنے لگی۔ تاہم مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتا۔ دوستوں سے قرض لیتا۔ جُوے میں ہارتا، شام کی محفلوں میں دامن جھاڑ کر اُٹھتا، بھرے

---

[1] بلقان کا وہ حصہ جو ترکوں سے پہلے اور بعد بھی رومانیہ کے قبضے میں رہا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد سوویت یونین میں ملا لیا گیا۔ رومانیہ اب تک اس پر خفا ہے۔ (ظ ا)

[2] بعضوں نے ۷۰۰ لکھا ہے۔ الاؤنس وغیرہ ملا کر ۷۲۰۔ (تقریباً اتنی ہی سالانہ رقم غالب کو پنشن میں ملتی تھی)

دفتریں، بازاریں، افسروں اور نوکروں کے سامنے حکومت کو، کسانوں کی نظامِ غلامی کو سخت سست کہہ ڈالتا اور یہاں تک اصرار کرتا کہ

"جو شخص بھی روس میں انقلاب نہیں چاہتا، وہ کمینہ ہے۔"

۱۸۲۱ء میں خفیہ پولیس کے مخبر نے افسروں کو رپورٹ کی :

"پوشکن کھلے عام بُرا بھلا کہتا ہے، کافی ہاؤس میں بھی باز نہیں آتا، صرف فوجی افسر ہی اس کی ملامت کا شکار نہیں، خود سرکار پر بھی برستا ہے۔"

مگر یہ سب بعد کی بات ہے؛ تب تک اس نے اپنی ایک چونکانے والی، بھرپور، خوش آہنگ جذباتی عشقیہ مثنوی کے انداز کی بیانیہ نظم "قفقاز کا قیدی" مکمل کرکے اشاعت کے لیے بھیج دی تھی۔ قفقاز اور کرائمیا کی سیر نے اسے کئی چھوٹی چھوٹی نظموں، تصویروں (اور کرداروں) کے علاوہ "باغچہ سرائے کا فوارہ" اور "بنجارے" جیسی شاہکار نظمیں عطا کیں۔ "ڈاکو بھائی" بھی انھی دنوں ایک واقعے سے متاثر ہو کر لکھی تھی، اس میں دو ڈاکو جان پر کھیل کر دینیپر دریا میں کود پڑتے ہیں اور ہتھکڑی سمیت پار اُتر جاتے ہیں۔ پہریدار کو انھوں نے مل کر ڈبو دیا۔ بظاہر یہ ایک اخباری واقعہ تھا۔ شاعر نے اسے علامتی معنوں میں استعمال کیا کہ روس کی نئی نسل، ملامتوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ یہ نڈر پیڑھی ایک دن ہتھکڑی سمیت دریا میں کود دے گی اور "پار اُتر جائے گی"۔ —— لیکن یہ نظم کمزور رہی۔ خود پوشکن نے دیکھا کہ علامتیں اُبھرنے نہیں پائیں —— ۲۳ء میں یہ نظم اس نے چاک کرکے آگ میں جھونک دی۔

یہ طویل نظمیں کشی نیف کے دورانِ قیام، پہلے ۱۸ مہینوں میں لکھی جا چکی تھیں، کچھ اور نامکمل نظمیں تھیں —— اور ۴۰ مختصر موضوعاتی نظمیں۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ کشی نیف کے ہنگم ماحول میں رہ کر تین سال کے اندر جتنا کچھ اس نے لکھا، وہ اس سے بھی تین گنا تھا —— حالاں کہ ادھر آتے ہی ایک نئی مصروفیت پیدا کرلی تھی —— ایسی درپردہ مصروفیت، جو ادبی سرگرمی سے کچھ کم عزیز نہ تھی۔

---

[1] Бахсасарайскйи фокюн Чыганы Братыч разошики ان چاروں میں تین نظمیں مثنوی کے طرز کی ہیں اور ایک نظم ڈرامہ ہے (بنجارے) ان کو اس قفقازی سلسلۂ نظم میں شمار کیا جاتا ہے جس پر بائرن کا اثر نمایاں ہے۔ مگر نوجوان شاعر اپنے اس روحانی اُستاد کے نقشِ قدم سے ہٹ گیا ہے اور براہ راست روسی مسائل سے دست و گریباں ہے۔

ابھی یہاں ملازمت کا ایک سال پورا نہوا تھا کہ سردیوں میں چھٹی لے کر وہ کئیف کے صوبے میں "کامینکا" گاؤں چل دیا۔ یہ آبائی جاگیر تھی ایک نامی گرامی زمیندار وسیلی دویدوف کی، جو رشتے میں جنرل رائیفسکی کے بھائی ہوتے تھے۔ یہ دویدوف اپنی تمام عیش پسندی اور تن آسانی کے باوجود نہایت بیدار مغز، باخبر اور سیاسی سازش کا نقطۂ اتصال (جنکشن) تھے۔ (کی نمبر ۲۰۔ باب دوم)

پوشکن کے پیترسبورگ سے روانہ ہونے کے فوراً بعد "ہرالیمپ" ٹھنڈا ہوا اور چند مہینے کے اندر انجمن رفاہِ عام بکھر کر دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی: شمالی اور جنوبی ــــــ شمالی کا مرکز پیترسبورگ ہی رہا، پہلے نکولائی موراویف اس کا لیڈر بنا، پھر کندراتیف ریلیئیف ــــــ مگر جنوبی والے زیادہ گرم تھے، انھوں نے کرنل پیستل (Pestel) کو اپنا لیڈر چُنا۔ یہ وہی پیستل ہے، جس کے متعلق پوشکن نے اپنی ڈائری میں یوں اندراج کیا ہے:

> صبح پیستل کے ساتھ گزری، بہت دانا آدمی ہے ــــــ ہر معنی میں دانا۔۔۔ جتنوں سے اب تک ملا ہوں ان میں نہایت اوریجنل ذہن رکھنے والوں میں سے ایک۔۔۔۔

پیستل کے علاوہ کشی نوف کے دورانِ قیام ایک میجر رائیفسکی سے بھی ملاقات رہا کرتی تھی (جسے ۱۸۲۲ء میں فوج کے اندر انقلابی پروپیگنڈا کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا) ایک جنرل ارلوف (Opeol) تھے، جو گرفتاری سے بچ گئے۔

"کامینکا" میں بانکے زمیندار دویدوف کی حویلی گرم مزاج افسروں اور خفیہ انقلابی کارکنوں کی مستقل آماجگاہ بن گئی تھی۔ بظاہر یہ لوگ تفریح کرنے، ہفتے کی چھٹیاں گزارنے آتے، جام لنڈھاتے، صبح تک ہڑبونگ مچاتے، تاش کھیلتے، قہقہے لگاتے، بباطن اس پاس کی چھاونیوں میں مسلّح بغاوت کے مشورے اور تیاریاں کرتے۔ نئی کتابوں پر بحث ہوتی، پولٹکل اکانومی، فلسفہ، تھیٹر اور شاعری سبھی موضوع ان نوجوانوں کی جولاں گاہ تھے۔ پوشکن اکثر یہاں کا پھیرا کرنے لگا۔

۴ر دسمبر ۱۸۲۰ء کو اس نے ایک ذاتی خط میں لکھا:

> "میرا وقت شاندار دعوتوں اور جمہوریت کی حجتوں میں گزر رہا ہے۔"

انھی دنوں کامینکا آیا تو پاکوشکن، اخوتنی کوف، ارلوف اور دویدوف جیسے سازشی بیک وقت موجود تھے۔ ارلوف نے سوال اٹھایا کہ روس میں خفیہ سوسائٹی کا قیام کیسا رہے گا؟ شاعر پہلے ہی ان لوگوں کی

لہ پوشکن ہرے لیمپ کی خیریت پوچھتا رہتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پوشکن کی غیر حاضری کا کوئی اثر پڑا۔

افسانہ طرازی میں بوئے خوں سونگھ چکا تھا۔ جوش میں کہنے لگا کہ خفیہ سوسائٹی بہت ضروری ہے، روس میں انقلابی کام کو اس سے بڑے فائدے ہوں گے۔ دوستوں میں چپکے سے بات ہوگئی تھی کہ رائیفسکی کو گڑبڑا دیا جائے، پتہ نہ چلنے پائے کہ ہمارا کسی خفیہ سرگرمی سے رشتہ ہے۔ جب پوشکن خفیہ سوسائٹی کی ضرورت پر زور دیے جا رہا تھا۔

تو میں (یاکوشکن) نے، اس کے خلاف یہ دلیلیں دینی شروع کیں کہ روس میں خفیہ سوسائٹی کا چلنا قطعی ناممکن ہے۔۔۔۔ رائیفسکی اس کا توڑ کرنے لگا۔۔۔۔ جواب میں بحث سے نکلنے کے لیے میں نے کہہ دیا کہ جناب، صاف نظر آتا ہے کہ آپ کو مذاق سوجھا ہے؛۔۔۔۔ ورنہ سچ مچ کوئی خفیہ سوسائٹی موجود ہوتی تو آپ غالباً اس سے کوئی رشتہ بھی نہ رکھتے۔ رائیفسکی بولا، غلط، میں ضرور شامل ہو جاتا۔ میں جھٹ سے بولا! تو پھر لائیے ہاتھ۔ اور اس نے بے اختیار ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اوروں نے بھی فرمائشی مسکراہٹ بکھیر دی۔۔۔۔ چلیے اچھا مذاق رہا۔

یاکوشکن اپنی اس شام کی یادداشت میں لکھتا ہے:

"جیسے ہی اس نے دیکھا کہ ساری گفتگو کا حاصل محض ایک مذاق نکلا تو وہ (پوشکن) اپنی جگہ سے اٹھا، چہرہ تمتمایا ہوا آنکھوں میں آنسو، (اسی عالم میں) بولا: مجھے زندگی بھر ایسی بدقسمتی سے واسطہ نہیں پڑا جیسا اس وقت۔ میں نے سمجھا تھا کہ زندگی سوارت ہوئی، (کارِ خیر میں صرف ہوتی) ایک بلند مقصدِ حیات میرے سامنے آگیا۔۔۔۔ لیکن یہ سب کیا ہے،؟

محض ایک بیدرد مذاق!

یہ الفاظ ادا کرتے وقت وہ بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔"

بظاہر رندانِ قدح خوار کے اس حلقے سے چند سال بعد وہ باغی اٹھے جنھوں نے "خدا اور زار کے نام پر" سر کٹانے والے بُرز دربار روس کا ضمیر جھنجھوڑ ڈالا۔ پوشکن کو تو "ارزماس" کے زمانے سے یہ چاٹ پڑی ہوئی تھی، "ہرالیمپ" والوں سے بھی واسطہ رہا تھا، کامینکا کی صحبتوں نے لَو اور اونچی کر دی۔ اتنے میں ترکوں کے خلاف یونان میں بغاوت ہوگئی۔ یونان کے انقلابی مرد و زن، پناہ گزیں، والنٹیر مولداویہ کی طرف آنے لگے، مولداویہ میں کھلبلی مچ گئی، روس نے اسے مصلحتاً اور ہوا دی۔ پوشکن بیقرار رہا اور کچھ نہیں تو والنٹیروں میں شامل ہو جائے۔

"جنوبی" سازشی حلقے نے اسے اپنے اندر نہیں لیا۔ وجہ یہ کہ اوّل تو اس پر پولیس کی نظر رہتی تھی، دوسرے یہ کہ تیز مزاج آدمی تھا، زبان سے کچھ بھی کہہ دیتا۔ تیسرے یہ کہ شاعر کو خفیہ سرگرمی میں شریک کر کے یہ لوگ

اس کی زبان بندی کا سبب بن جاتے، شاعری سے محروم رہتے؛

سرکاری عہدیدار پاجی اور چور، جنرلوں میں زیادہ تر حیوان، صرف کاشتکار رہے قابلِ عزت . . . .
ان بے ایمانوں کو پھانسی پر لٹکانا چاہیئے۔ میرا بس چلے تو خوشی سے پھانسی کا پھندا تیار کرکے دوں . . . .

انقلابیوں نے طے کر لیا تھا پوشکن کی بے لگام زبان کو اپنے گلے کا پھندا نہیں بننے دیں گے۔ چناں چہ پوشکن نے ان سے رشتہ تو بنائے رکھا، فروری ۱۸۲۱ء کے بعد آنا جانا البتہ کم کر دیا۔

ادھر جا بجا سے خبریں آنے لگیں کہ قومی آزادی کی لہریں دبائی جا رہی ہیں۔ مسیحی تصوف (Mysticism) کے نئے مُرید —— بلکہ مصاحبین کے پیر و مرشد الیکساندر اوّل کی تدبیر اور قوت سے یوروپ کے انقلابی کچلے جا رہے ہیں۔ اطالیہ کی قومی آزادی کی تحریک کو آسٹریا کی فوج سے، اسپین کے انقلاب کو فرانسیسی کمک سے بزور دبا دیا گیا، اسپین اور پرتگال میں تحریک کا زور ٹوٹ گیا، قدامت پرستی فتح کے شادیانے بجا رہی ہے۔ زار کا روس ایک بڑا سا آہنی پنجرا بن چکا ہے جس سے جان چھڑانے کی کوئی سبیل نہیں بنتی۔

حوصلے اور بے بسی کے اس تصادم نے، شکستِ آرزو کے گہرے احساس نے، مشاہدوں اور تجربوں کی رنگا رنگی نے اس کے وجود کو، اندرونی کائنات کو "لذتِ الم" کی نئی گہرائی عطا کی۔ فن اور فکر کو صیقل کیا۔ اسی تین سال کی مدت میں اس نے "خنجر" ([illegible])، "وادیم"، "یونان کے سپوت کو . . . "، "قیدی" ([illegible]) (روح قدس کا معاملہ) اور "رات" جیسی نظمیں لکھیں، جن میں سے "گوریالادا" نے والتیر کی بے دین فکر کے اثرات اُجاگر کیے اور "وادیم" نے کسانوں کی غلامی کے خلاف آواز بلند کی:

> ہماری سیاسی آزادی کسانوں کی (سر فدم سے) نجات کے ساتھ قطعی جڑی ہوئی ہے۔

اس نظم پر پوشکن نے یہ تاریخی نوٹ لکھا تھا۔ ایک طرف وہ کلیسائی مذہب کے عقائد اور ریاکارانہ احکام سے براہِ راست جہاد پر اُتر آیا، دوسری طرف "خنجر" نظم لکھ کر اس نے انقلابیوں کو گانٹھیں کاٹنے کے لیے خنجر دے دیا۔ کتنی ہی یادداشتوں میں ذکر آیا ہے کہ پوشکن کی نظم خنجر دسمبریوں کے زبان زد ہو گئی۔ "قیدی" اور "گوریالادا" یہ لوگ تحفے میں ایک دوسرے کو بھیجتے تھے[1]۔

---

[1] پوشکن سے بہت پہلے وہ شاعر جنھیں قبولِ عام کی خداداد نعمت ملی، اس رتبے کو پہنچ گئے تھے۔ مثلاً حافظ شیرازی، جن کا کلام ادھر نوکِ قلم تک آیا، ادھر دیس بدیس ارمغاں کے طور پر بھیجا جانے لگا۔

سیلے ہوئے زنداں میں ہم دونوں اسیرِ غم
قیدی کی غذا پر اک شاہیں کا بھی سر ہے خم
پنجوں میں لیے بوٹی، یہ مونسِ تنہائی
پروازسے بے بس ہے پرواز کا شیدائی

ہے چونچ لہو میں تر، بل کھاتے ہوئے شہپر
کیا جانیے، اس کو بھی آتا ہو خیال اکثر
نظروں سے جتاتا ہے، دیتا ہے صدا مجھ کو
کرتی ہے مخاطب یوں شاہیں کی ادا مجھ کو

"آزاد پرندے ہیں ہم دونوں، چلو، چل دیں!
اُس سمت، جہاں بادل پھرتے ہیں پہاڑوں میں
اُس سمت، جہاں نیلے ساگر میں لہر مچلے
اُس سمت ہم اٹھلائیں اور بادِ سحر مچلے"

فرد اور سماج کا تصادم (Conflict)، رومانی تصورات اور ٹھوس حقیقت کا تصادم، صورت (Form) اور معنی (Content) کا، تھکی ہوئی روحوں اور جوشِ عشق کا تصادم، آزادی کی اُمنگ اور بے بسی کی مصلحت کا تصادم، کامرانی اور ناکامی کی فطرت اور تمدّن کی عادتوں اور آدرشوں کی کش مکش، سبب اور نتیجے کی، سکت اور ارادوں کی، مکمّل نشاط اور "خار دار پیرہن" کی ــــ غرض حیات اور ممات کی کش مکش اس شاعر کے ہاں دلوں کو گہرائی تک چھوتی ہے، جس نے ابھی چند مہینے پہلے "رسلان اور لودمیلا" جیسی ہلکی پھلکی بیانیہ نظم لکھ کر اپنا دل بہلایا اور نام پھیلایا تھا۔ اب وہ ہر ایک تصادم کے در پر دستک دیتا ہے، پردہ سرکانا چاہتا ہے ــــ ادھر سے جواب نہیں ملتا۔ فکر و فن میں شاعر کی پختگی اور زرخیزی کی بس یہی ایک دہائی ہے۔ (۱۹۲۰ - ۳۰ء)

خانہ بدوشوں کی زندگی پر طویل ڈرامائی نظم "بنجارے" (سگانی) اور شاعر کی زندگی کا بہترین شعری کارنامہ "ایوگے نی انے گن" ــــ دونوں کا اوّلین خاکہ یہیں کشی نیف میں پھیلایا گیا۔ ایک لگے سال پوری ہوئی، دوسری آٹھ سال تک لکھی کھرچی اور پھر لکھی جاتی رہی ــــ یہاں تک کہ پورے گیارہ برس میں

تکمیل کو پہنچی۔

کھنکتے ہوئے قہقہے لگانے والا، فحش لطیفے، گندی پھبتیاں اور سیاسی ہجویں سُنانے والا پوشکن کشی نیف میں غلیظ، تنگ نظر اور دفتری جوڑ توڑ کے ماحول سے ڈھائی سال میں اُکتا گیا۔ ذرا ذرا سی بات پر اُلجھنے لگا۔ بہت کاغذی گھوڑے دوڑائے کہ پیٹر سبورگ نہیں تو کسی اور یوروپی شہر کو تبادلہ ہو جائے، مگر وہاں تو حکم تھا کہ بلا اجازت چانسلری کے حدود سے باہر نہ نکلے۔ آخر جیسے تیسے بحرِ اسود کی روسی بندرگاہ "اودیسہ" میں نئے روس کے نئے گورنر جنرل میخائیل ورنتسوف (M. Bopыyoa) کے دفتر میں اس کا تبادلہ ہو گیا اور اگست ۱۸۲۳ء میں وہاں پہنچ گیا۔ اودیسہ ایک بندرگاہ کے ناتے صرف تجارتی نہیں، بلکہ جنوب میں روسی یوروپی تہذیب کا مرکز بھی بن گیا تھا؛ اوپیرا ہاؤس تھا۔ اطالوی، فرانسیسی، یونانی سرگرمیاں تھیں، اخبارات و رسائل تھے، شاندار انگلیسرس کلب تھا۔ پوشکن وہاں اُترتے ہی نہال ہو گیا۔ ۲۵ راگست ۲۳ء کو بھائی کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

اپنے مولد ادیبہ کو خیر باد کہا اور یوروپ میں آ گیا، خدا کی قسم، روح تازہ ہو گئی۔

گراف ورنتسوف کے والد انگلینڈ میں روسی سفیر رہ چکے تھے، وہیں لڑکے کی پرورش ہوئی تھی۔ وہی اکل اکھڑا پَن اور محتاط برتاؤ۔ ادب آداب، قاعدے قانون کی پابندی۔ روسی ادب یا تہذیب سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ ایک طرح سے تحقیر کا سلوک۔ پوشکن اپنے ساتھ یہ شہرت بھی لگا لایا تھا کہ مذہب اور حکومت، دونوں کا ڈسپلن توڑنے میں کمال رکھتا ہے۔

ورنتسوف کو، جنھیں اہلِ اودیسہ "لارڈ ورنتسوف" کہتے تھے، یہ برہم نوجوان ایک آنکھ نہ بھایا اور انھوں نے شروع سے ہی اس کو ہیڈ کلرک شمار کر کے صرف کام سے کام رکھا۔ مارچ ۱۸۲۴ء کے ایک خط میں کسی دوست کو پرسشِ احوال کا جواب دیا ہے:

"میں پوشکن کے ساتھ، چودہ روز میں چار لفظ سے زیادہ گفتگو نہیں کرتا۔ مجھ سے ڈرتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ اگر کوئی حرفِ شکایت مجھ تک پہنچا تو فوراً نکال باہر کر دوں گا اور پھر کوئی اس کا طلبگار نہیں نکلے گا۔ میری اطلاع بالکل درست ہے کہ یہاں آ کر کافی سنبھل گیا ہے۔ زبان کھولنے میں بھی کہیں زیادہ احتیاط برتنے لگا ہے، شریف، بھلے مانس جنرل ان زوف کے یہاں ایسا نہیں تھا۔ مجھے نہ اس شخص کے طور طریقے پسند ہیں، نہ اس کی صلاحیتوں کا مدّاح ہوں۔"

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح
در کارِ زندگی صفتِ سنگ خارا ایم

اودیسہ میں تیرہ مہینے کس تناتنی میں گزرے ہوں گے، (لارڈ) ورنسوف کے ذاتی خط اور پوشکن کی ایک عرضداشت سے ظاہر ہے جو تکلف برطرف، انکی افسرِ اعلیٰ کو دی گئی تھی:

"مجھ سے کہا جائے گا کہ سات سو روبل تنخواہ پاتے ہو تو اپنی ڈیوٹی کرو۔ آپ آگاہ ہیں کہ صرف ماسکو یا پیٹرسبورگ میں ہی کتابوں کی تجارت ہو سکتی ہے، کیوں کہ وہی اخبار والے، سنسر والے اور کتب فروش پائے جاتے ہیں۔ موجودہ صورت میں اس منافع بخش امکان سے فائدہ اُٹھانے کی میرے لیے کوئی گنجائش نہیں، وجہ صرف یہ کہ پائے تخت اور میرے درمیان دو ہزار کوسٹ کا فاصلہ ہے۔ حکومت کا منشا یہ ہوگا کہ میری محنتوں کا کسی نہ کسی شکل میں کچھ صلہ دے۔ (چناں چہ) میں ان سات سو روبل کو اپنی ملازمت کی تنخواہ شمار نہیں کرتا، بلکہ بندشوں میں جکڑے ہوئے آدمی کی جلاوطنی کا بھتہ سمجھتا ہوں۔"

گورنر جنرل نے اس بیان کو گستاخی سمجھا۔ پوشکن کے سامنے وہ بھیانک مسئلہ پھر نمودار ہوا اور اس بار تین چہروں کے ساتھ: عادت، آدرش اور ماحول کی عداوت، تینوں سے نباہ کیوں کر ہو۔ سال بھر یہ کشمکش جاری رہی، مگر کس طرح!

کشی نیف چھوٹی سی پسماندہ جگہ تھی، مگر اودیسہ میں دُنیا بھر کے رسائل اور کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا اور محفلوں میں ایک سے ایک اچھی خوش مذاق، فیشن ایبل صورت نظر آتی تھی۔ یہاں ہاتھ اور کھُل گیا، اس نے اپنا کتب خانہ بنانا شروع کیا۔[2] بائرن اور شینیئے کے اثر سے وہ آزاد ہو چلا تھا۔ لیکن انگریزی اور فرنچ میں جو تازہ علوم چلے آ رہے تھے، ان کی تشنگی اور بڑھ گئی۔ چناں چہ باقاعدہ انگریزی کے سبق لینے شروع کیے، انگریزی سے جو وقت بچا، اطالوی اور اسپینی زبانوں کی تحصیل پر خرچ کیا۔ غیر ملکی اخبارات اور ادبیات کے مطالعے نے نگاہ کو اور وسعت بخشی اور اس نے اپنے پچھلے کلام اور کام پر تنقیدی نظر پھیری۔ انگریزی ادبیات کو جرمن بلکہ فرنچ پر ترجیح دینے لگا۔

ماں باپ پر تقاضے کیے اور جب وہاں سے مالی امداد کی راہ بند پائی تو اپنی تصانیف کی اشاعت کی وہ

---

[1] کوسٹ ایک پرانے روسی لفظ ورسٹ (Верст) کے لیے لکھا گیا۔ یہ لفظ بھی کوسٹ کی طرح صرف ادب میں رہ گیا ہے۔

[2] بہت سی کتابیں تقسیم ہو چکنے کے باوجود اس ذاتی کتب خانے کی وسعت، رنگا رنگی اور خوش ذوقی کا اندازہ مطالعے کے اس کمرے کو دیکھ کر ہوتا ہے جہاں پوشکن نے آخری بار آنکھ بند کی۔ وہ مکان، خصوصاً وہ کمرہ جوں کا توں لینن گراد میں محفوظ ہے۔

تدبیریں نکالیں جن سے آمدنی بڑھے۔ اودلیسہ کے کاروباری اور تجارتی ماحول نے بھی کچھ سمجھایا ہوگا۔

طبیعت میں آمد ہوتی ہے تو لکھتا ہوں، لیکن جب ایک بار شعر لکھا جاچکا تو پھر وہ مال بن گیا۔

—— (میرے لیے جنس بازار) ....

آخر بیکری والا روٹی پکاتا ہے، درزی کپڑا سیتا ہے، کوزبوت لکھتا ہے، حکیم (Аекар-

Морит —— کلہے کی خاطر؟ روپے کے لیے۔ میں بھی نغمہ سرا ہوتا ہوں۔ جب جھلاہٹ سوار

ہو تو بس —— میں ایسا ہی ہوں ۵

وجدان کی اگر کوئی قیمت نہیں رہی
لکھے ہوئے ورق تو بکیں گے، یہی سہی!

(کتب فروش کی شاعر سے گفتگو۔ ۱۸۲۴ء)

"قفقاز کا قیدی" اور "باغچہ سرائے کا فوّارہ" کی رآئلٹی مل گئی، قرض ادا کر دیا۔ ایک دوست، جس کے پاس، جوئے میں ہار کر اپنا غیر مطبوعہ کلام رہن رکھ چکا تھا، رقم واپس لیے بغیر ان مختصر نظموں کو پریس کے حوالے کرنے پر رضامند ہوگیا۔ غیر ملکی شائستہ لوگوں اور علمی کتابوں میں رہ کر پوشکن نے جانا کہ صرف شعر سے زندگی کا حق ادا نہیں ہوتا، نثر پر، سنجیدہ، منطقی اور علمی نثر پر بھی توجہ کرنی چاہیے۔ ایسی نثر جو کم از کم ماضی کے خزانوں اور حال کی کیفیتوں سے کام کے موتی چُن لے۔ عجب نہیں کہ معاصر روس کے متوسط طبقے کی انسائیکلوپیڈیا" —— 'ایوگے نی انے گن' لکھنے کا نقشہ اسی لیے پھیلایا ہو —— مگر تب تک شعر گوئی طبیعت میں رچی ہوئی تھی، شروعات ہی 'منظوم ناول' کی صورت میں ہوئی —— روزانہ "ڈائری" لکھنی شروع کر دی جس میں گزشتہ کی یادوں اور موجودہ واقعات پر مختصر ریمارک قلمبند ہوئے کہ نثر نگاری کی ابتدائی مشق یہیں سے ہوتی ہے۔

پوشکن کے بہترین ذہنی کارنامے یا تو ان دنوں مکمل ہوئے، یا ان کی داغ بیل پڑی۔

یونان کی جنگِ آزادی کی لہر اونچی اٹھی، پوشکن بذاتِ خود تو اس میں شریک نہ ہوسکا تھا البتہ ایک دلربا پناہ گزیں کلپسوپولی کرونی، (جن کے متعلق شہرت تھی کہ بائرن کے ساتھ رہ چکی ہیں) کشش نیفت آگئیں۔ ایک سربیائی ہیرو کی لڑکی آپہنچی، یہ دونوں اور ان کے سوا کئی شوقین خواتین اور بیویوں کی جذباتی دُنیا میں ضرور شریک ہوا۔ اودلیسہ میں تقریباً بیک وقت دو جگہ مبتلا ہوگیا۔ ایک اطالوی حُسن کا پیکر امالی زازنیچ —— کسی مقامی دولتمند بروکر (دلال) کی شوقین مزاج بیوی جو خود بھی ہر طرح سے

اہلِ کمال کی ہمت افزائی کرنا، ان کے قلب و نظر کا مرکز رہنا اپنے دمکتے ہوئے حُسن کا قدرتی حق سمجھتی تھی، اور کچھ رقابت کے جوش میں خاص انھی جوانوں پر نظرِ کرم ڈالتی تھی جو مادام ایلزبیتھ ("ایلی زوتیا") ورنتسووا (لیڈی گورنر جنرل) کے پروانے ہوں۔ پوشکن اودیسہ آتے ہی اس بے پناہ طلسمی حسن میں، خوددار، خوش طبع، خوش اندام اور عالی مرتبت خاتون کی سادہ و پُرکار نظر میں اُلجھ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رقعے اور پُرزے بھی درمیان میں آئے گئے[1]۔

ہاں غالبؔ خلوت نشیں، بیمے چناں عیشے چنیں

جاسوسِ سلطاں در کمیں، مطلوبِ سلطاں در بغل

مگر یہاں شانِ محبوبی میں کچھ سرپرستانہ انداز بھی شامل تھا۔ شاید حجاب مانع رہا۔ البتہ پوشکن نے جسم کی آگ امالی زارنیچ کی تب و تاب سے روشن رکھی۔ وہاں اکیلے پوشکن کا گزر نہ تھا، اور بھی کئی راہرو تھے، پوشکن کو پہلی مرتبہ خود رقابت کی جان لیوا تپش محسوس ہوئی (جن تاثرات سے گزرا ہوگا، وہی بعد کی نظموں میں "در حدیثِ دیگراں" بیان ہوئے ہیں) نجانے انجام کیا ہوتا کہ مئی ۲۴ء میں پوشکن کے ایک اور رقیب کے ساتھ امالی اودیسہ چھوڑ گئی[2]۔ مادام ایلی زاوتیا نے پوشکن کی دلداری تو ضرور کی لیکن فاصلہ بھی قائم رکھا۔ اس فاصلے کے خلا میں پوشکن کا ہی ایک چالاک، نازپروردہ اور صاحبِ علم و جاہ دوست در آیا۔ یہ تھا الیکساندر رائیفسکی، پُرانا ہمدرد اور رازدار۔ پوشکن جیسے بھولے اور ہر ایک کی باتوں میں آجانے والے آدمی سے راز اُگلوانا کیا مشکل کام تھا۔ نتیجہ یہ کہ "بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا" اور اس نے گورنر جنرل کے کانوں تک بات پہنچادی[3]۔

اس عشق کے کارن اور ورنتسوف کی ذلّت آمیز برتاؤ کا توڑ کرنے کے لیے شاعر کو یاد آیا کہ:

کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

کتابوں کی آمدنی کا حساب کرتے وقت وہ بھُول گیا ہوگا کہ میں امیر ابنِ امیر بھی ہوں۔ اب اس نے محل، بے محل جتانا شروع کر دیا کہ چھ سو برس سے ہمارا خاندان نامور رہا ہے۔ پانچ سو برس سے ہم میں "سپہگری" اور سرکشی رہی ہے۔ میرے پرنانا پِتیرِ اعظم کے مقربِ خاص تھے (کوئی حبشی غلام نہیں، ایتھوپیا

---

[1] یہ راز تین نظموں سے کھُلتا ہے۔ (ک نمبر ۲۱ صفحہ ۷۰-۶۹)

[2] مگر وہ پوشکن کے دل سے کبھی نہ گئی۔ ۲۳ء، ۲۵ء کی دو نظموں اور غالباً ۲۴ء کی "یونان کے سپوت" اس خلش کی گواہ ہیں۔

[3] پوشکن نے جلائے ہوئے خطوط" (Сожженное письмо) نظم میں اسی پر دستِ افسوس ملا ہے۔

کے شہزادے) بلکہ پیٹر کے زمانے کی تاریخ لکھ ڈالنے کے خیال نے یہیں سر اٹھایا ہوگا۔[1]

ڈاکخانے کے جال کی ڈوری تو حکومت کے کارندوں کے ہاتھ میں تھی ہی (تب تک ٹیلی فون لائن نہیں آئی تھی)، پوشکن کا ایک خط پکڑا گیا جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ جملے بھی تھے:

.... آجکل شکسپیر اور بائیبل کا مطالعہ جاری ہے۔ مجھے بعض اوقات "روح القدس" زیادہ اچھا لگتا ہے۔ تاہم گوئٹے اور شکسپیر بہتر ہیں۔ بتاؤں، کیا چل رہا ہے ان دنوں؟ تو ایک رومانی نظم کے بے ربط بند لکھے جارہے ہیں اور خالص دہریت کے سبق پڑھ رہا ہوں۔ یہاں ایک انگریز ——— بہرا فلسفی رہتا ہے، واقعی ایسا ذہین دہریہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس نے کوئی ہزار ورق لکھ مارے ہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ[2]

یوں بقائے روح (حیات بعد الموت) کی کمزور دلیلوں کا بالکل صفایا کر دیا ہے۔ اس کا یہ نظام (فلسفہ) قائل کرنے میں اتنا پورا نہیں اُترتا جتنا عموماً تصور کیا جاتا ہے، تاہم دوسرے نظاموں سے زیادہ قرین قیاس ہے....

ایک تو سرکشی، اوپر سے یہ دہریت کے سبق۔ دوہرا گناہ۔ گورنر جنرل نے اس کا تبادلہ کرانے کے لیے (۲۳ مارچ ۲۴ء) وزیر خارجہ نسلرود کو لکھ دیا۔ خط کا لہجہ ہمدردانہ تھا، منشا اور اثر بیدردانہ۔ سفارش اس امر کی کہ:

بہتر ہو اگر اس شخص کو روس کے اندر کہیں فاصلے پر رکھا جائے، جہاں بُرے اثرات سے اور بے جا تعریفوں سے پاک رہے۔ وہاں اس کی صلاحیت اور اُبھرتی ہوئی لیاقت پروان چڑھے گی۔ یہاں لوگوں کی کثرت ہے، وہ اس کی تعریفیں کر کر کے دماغ خراب کیے دے رہے ہیں۔ حالاں کہ "وہ ایک کچا نقال ہے، وہ بھی ایسے شخص کا، جو دُور دُور قابلِ احترام نہیں" (یعنی بائرن)

پوشکن نے دیکھ لیا کہ اس سے زیادہ تباہ نہیں ہونے والا۔ آزادی کے فرانسیسی اور انگریز شہیدوں شینئے (Chenier) اور بائرن سے جو کچھ لینا تھا، (بائرن کا انتقال اپریل ۲۴ء) لے چکا۔ جنوب کے دھوپ بھرے دیس کی سیر کر لی اور مناظر و تجربات سے سیر ہو چکا، خوابوں کے مشرق نے اس کی جھولی بھر دی ———

---

[1] انقلابی خیالات کے رہنما اور عزیز دوست ریلییف نے اس بات پر پوشکن کو ڈانٹ کر خط لکھا۔ (ک نمبر ۲۸ ص ۱۳)

[2] (ک نمبر ۲۹ ص ۵۶)

اب اُٹھنے کا وقت آیا۔ انھی دنوں ایک مزے دار ہجو دفتروں اور کلبوں میں گشت کر رہی تھی۔ کم سواد، بے مایہ دیسی زبان اور "کچے نقال" دیسی شاعر کے چاہنے والوں نے اس ہجو کو خوب اُچھالا، لارڈ صاحب پر یہ ہجو چپک گئی:

آدھا لارڈ ہے، آدھا بنیا

آدھا گھامڑ، عقل ادھوری

آج ہے آدھا پاجی خصلت، کل پر اُس کے ہوگی پوری

کتابوں سے بکس بھرے جا رہے تھے، چلنے کی تیاری تھی کہ پوشکن نے صرف اودیسہ سے نہیں، روسی سلطنت کے حدود سے بھاگ نکلنے کے سارے جتن کیے۔ باہر کے بحری جہازوں پر آنے جانے لگا۔ مادام ورنتسووا نے بھی درپردہ مدد کی، لیکن کوئی تدبیر پیش نہ گئی۔

۸ جولائی کو شاہی فرمان پہنچا کہ پوشکن برخاست۔ ۳۰ جولائی کو، روانگی سے قبل اسے ایک عہد نامے پر دستخط کرنے پڑے کہ اودیسہ سے سیدھی سڑک اپنے مادری گاؤں میخائیلوفسکوئے جائے گا، راستے میں کہیں نہیں ٹھہرے گا، خصوصاً کیئیف پر (یہیں نزدیک کامینکا، "جنوبی" والوں کا سازشی اڈّا تھا)۔ آخری بار جب وہ سمندر سے رخصت ہونے گیا تو اس کے مغربی کناروں پر، دو سرفروش، بے وطن مرنے والوں کی یاد آئی۔ نپولین اور بائرن؛ تبھی یہ نظم لکھی گئی:

الوداع، اے فطرت آزاد، ہیں

چل دیا، یہ آخری دیدار ہیں

تو ہے اپنی نیلی موجوں میں مگن

حُسن میں تیرے غضب کا بانکپن

جیسے ہوتی ہو جُدائی ناگوار

برہمی دکھلائے چلتے وقت یار

یوں ہی تیرا شورِ پیہم، دُکھ بھرے دل کی پُکار

رخصتی ہے، سُن رہا ہوں جاتے جاتے ایک بار

میرے ارمانوں کی سرحد تھی یہاں
تیرے ساحل بار ہا میرے قدم چوما کیے
سر جھکائے سوچ میں پہروں یہاں گھوما کیے
اَن کہی، انجانی باتوں نے کیا ہے نیم جاں

تیری آوازوں میں کیا لگتا تھا جی
کس قدر ڈوبی ہوئی، کتنی اتھاہ
اور وہ شاموں کی خاموشی میں سنّاٹا ترا
بے قراری، جوشِ فطرت، برہمی!

ماہی گیروں کی پُرانی بادبانی کشتیاں
نرم لہروں میں پھسلتی، تیرتی
تیرے سینے پر مزے میں ہیں رواں:
ہاں شرارت پر اُتر آئے تو بے قابو ہے تو
غرق ہوں بیڑے جہازوں کے، ڈبو دے آبرو

چاہتا تھا چھوڑ دوں ان کو ہمیشہ کے لیے
دل رہا ہے کیف اور بے حس کناروں سے نفور،
تیری جولانی مبارک ہو تجھے،
آرزو تھی سیلِ بے پایاں میں کشتی ڈال کے
فطرت شاعر نکل جائے کہیں ساحل سے دور

تو نے میری راہ دیکھی اور بُلایا بھی.... مگر
پاؤں میں زنجیر تھی، گردن میں طوق
لاکھ سر پٹکا نہ نکلا قید سے کوئی مفر

میں کہ تھا حسرت زدہ، تکتا رہا طوفانِ شوق

اور اب کا ہے کا غم؟
کون سی منزل ہے جس کی سمت اُٹھیں گے قدم؟
اِک ٹھکانا تجھ میں تھا اے بحرِ ناپیدا کنار
رُوح کی اس بے قراری کو جہاں ملتا تھا قرار

اِک جزیرہ، اِک چٹان، اقبال مندی کا مزار...
خوابِ شیریں نے دبا دی ہے جہاں مٹی تلے
عظمتوں کی ایک زندہ یادگار
دفن ہے اس میں نپولین کا وقار

انتہائے کرب میں جب آنکھ اُس کی لگ گئی
جیسے طوفانوں کا ہنگامہ ہو ــــــ ایک میّت اُٹھی
وہ ہمارے ذہن کا آقا، ذہانت کا کمال
ہو گیا ہے ہم سے رُخصت بائرن شیریں مقال

جس کا آزادی ہی خود ماتم کرے، آنسو بہائے
وہ ہوا آنکھوں سے اوجھل، پھول سہرے کے بڑھائے
اے سمندر بین کر، آفت مچا، طوفاں اُٹھا
اس بھری محفل سے اب وہ تیرا نغمہ خواں اُٹھا

تھا وہ تیرا ہی نمونہ ہُو بہو
تیرے سانچے میں ڈھلی تھی اس کی خو
قوت و حسرت میں، گہرائی میں فرد

اتنا سرکش، اس قدر بے باک مرد!

محفلِ ہستی تو خالی ہوگئی
اے سمندر، اب کدھر لے جائے گا کشتی مری؟
ہر طرف روئے زمیں پر ایک ہی قسمت کا ساتھ
جس جگہ ہے بوند کوئی خیر کی
ہے وہیں ذہنوں پہ پہرہ یہ کسی ظالم کا ہاتھ

الوداع اب رخصت ہوں تجھ سے،
اے سمندر تیرا بانکا حُسن پتھّر کی لکیر
دن چھپے کے بعد تیری گونج، یہ مبہم سی گونج
مُدّتوں مجھ کو سنائے جائے گی غم کی نفیر

مُدّتوں سنسان ویرانوں میں، صحراؤں کے بیچ
میرے دم کے ساتھ ہوں گی، ہمسفر بن جائیں گی
یہ چٹانیں، دھوپ چھاؤں کی یہ تیری اونچ نیچ
یہ خلیجیں اور موجیں تیرے نغمے گائیں گی

دس دن بعد اگست (۱۸۲۴ء) میں جب وہ میخائیلوف فسکوئے پہنچا تو ماں باپ، بہن بھائی منتظر تھے۔ اب وہ ۲۵ برس کا سرد و گرم چشیدہ جوان، ملک کا ایک مشہور پختہ کار شاعر تھا، اوپر کے حلقوں میں اس کے چرچے تھے، گھر والے مل کر بہت خوش ہوئے۔ مگر شاہی فرمان میں خاص اسی مقام پر بھیجنے کی تاکید اس مصلحت سے ہوگی کہ وہ گھر میں نظر بند رہے۔ یہاں چند روز بعد جوان بہن بھائی کو بھی اس کے "خطرناک پرچھانوے" سے بچایا جانے لگا۔ ستم یہ کہ باپ نے (سرکاری ایماء سے) اس کی ڈاک سنسر کرنی شروع کر دی۔ باپ بیٹے میں ناگواری بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہنچی جو ژوکوفسکی کے نام پوشکن کے ایک خط سے دنیا پر کھلی:

"میرے والد، کسی اور کی غیر موجودگی کے موقع سے فائدہ اٹھا کر سارے مکان میں شور مچاتے پھرے کہ میں نے اُن پر ہاتھ اُٹھایا —— بعد میں یہ کہ ہاتھ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں تمھارے سامنے صفائی

پیش نہیں کروں گا۔ لیکن آخر ان کی نیت کیا ہے فوجداری الزام لگانے میں؟ مجھے سائبیریا (قید با مشقت) میں ڈلوائیں گے اور ہمیشہ کے لیے بے عزت کرائیں گے؟ بچاؤ مجھے!"

آخر باپ کٹا، پوشکن کو تنہا چھوڑ کر باپ اہل و عیال سمیت پیٹرسبورگ چلے گئے، وہی ایک بوڑھی کھلائی "اریشا" خدمت کے لیے رہ گئی اور آخر تک رہی۔ "بگڑے ہوئے شاعر" پر نظر رکھنے اور سدھارنے کی ذمہ داری کورٹ آف وارڈس کے افسر اور مقامی خانقاہ کے نگراں کے سپرد ہوئی۔

پوشکن خود کو سمیٹ کر بیٹھ گیا اور دس ماہ پہلے شروع کی ہوئی اپنی یادگار ڈرامائی نظم "بنجارے" اکتوبر ۲۴ء کے تیسرے ہفتے میں پریس بھیجنے کے لیے تیار کر دی۔ درمیان میں چھوٹی چھوٹی "عاشقانہ" نظمیں بھی ہوتی رہیں، لیکن موسمِ خزاں کی یہ پہلی تنہائی بڑی زرخیز نکلی۔ "ایوگے نی آنے گن" کے صرف تین باب لکھے ہوئے تھے۔ انھیں آگے بڑھایا۔ بورس گودونوف (Борис Годунов) جیسا شاندار، نیم تاریخی، نیم افسانوی منظوم ڈرامہ شروع کیا اور اگلے سال کے ستمبر (موسمِ خزاں) میں مکمل کر دیا۔ شاعر کا ذہن فرد اور سماج کے تصادم میں اس نازک مرحلے پر اپنی تخلیقی روشنی کو کس طرح فانوس میں بچائے ہوئے چلا۔ اہلِ قلم کو اس کا اندازہ پوشکن کے ہی ایک اقتباس سے ہوگا جو خاکساری کے باوجود اس کی بھری پُری شخصیت کے ایک رُخ سے نقاب سرکا دیتا ہے:

> "شکسپیر، کرامزین اور ہمارے جو پرانے مخطوطے محفوظ ہیں، ان کے مطالعے سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنے یہاں کی تاریخ کے ایک نہایت ہی ڈرامائی دَور کو ڈرامے کے لباس میں زندہ کر دوں۔ شکسپیر کی تقلید اس بات میں کی کہ وہ کیرکٹر کو بے تکلفی کے ساتھ پوری وسعت دیتا ہے؛ کرامزین کے نقشِ قدم پر چلا اس صفت میں کہ واقعے کے اُتار چڑھاؤ پر روشنی ڈالتے ہیں؛ اور واقعہ نگاری کے پرانے مخطوطوں سے میں نے اس زمانے کی زبان سیکھنے کی کوشش کی؛ سرچشمے سب مالامال۔ سوال یہ باقی رہتا ہے کہ میں ان سے فیض اُٹھا سکا یا نہیں، سو مجھے نہیں معلوم۔"

"بورس گودونوف" کا چرچا پہلے ہوا، چھپا ۶ سال بعد۔ اور اس نے قوم کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ آج تک وہ روسی ادب کا ایسا کارنامہ سمجھا جاتا ہے جس کا ترجمہ دُنیا کی کئی بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔[۵]
اس کی مختصر نظموں میں ایک زبان زد ہو گئی "زندگی کا جھگڑا"۔

---

[۵] میں نے اس کے منظوم ترجمے سے خود کو قاصر پایا اور خیال ترک کر دیا۔ (ظ ا)

کیسے مزے میں جاتا ہے چھکڑا بھرا ہوا
بوجھل ہے، چرچراتا ہے چھکڑا بھرا ہوا
بوڑھا ہے کوچوان، زمانہ ڈھلان پر
گھوڑا اڑائے جاتا ہے چابک کی سان پر

چل چل رے چھکڑے صبح کے بیٹھے ہوئے ہیں ہم
سر گھومتا ہے، گھومنے دو، ہم ہیں تازہ دَم
ہاں کوچوان چال دکھا دو مزا رہے
اپنی بَلا سے، جاتے یہ آرام یا رہے

دوپہر ہوتے ہوتے، یہ تُرکی ہوئی تمام
دُکھتا ہے جوڑ جوڑ، ذرا تھام باگ، تھام
ڈر لگ رہا ہے ڈھال سے، ترچھی چڑھائی سے
ہاں کوچوان بچ کے، سنبھل کے، صفائی سے!

چھکڑا تو اپنی چال ہی چلتا رہا مگر
جب شام ہونے آئی تو ہم ہو گئے نڈر
اب اپنے اپنے رَین بسیرے کو چل دیے،
گھر تک پہنچ ہی جائیں گے ہم سوتے جاگتے،
خود وقت کوچوان ہے، گھوڑے سَدھے ہوئے۔

پانچواں باب

دسمبری سرفروش

روس کی تاریخ تمدن مکمل نہیں ہوتی اور ۱۹ویں صدی کے ادبی اُبھار کا اندازہ نہیں ہوسکتا جب تک ہم اُس تحریک کی تہہ میں نہ اُتریں جسے "دسمبری" کہا جاتا ہے ــــــ پوشکن ایک شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، مورخ، ادبی مُدیر اور تنقید نگار اس تحریک کا بہترین ترجمان، اس کا رجز خواں اور لَے میں ڈھلی ہوئی اس کی فریاد ہے۔

> "۱۹ویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں خفیہ سوسائٹیوں کی تاریخ کا بہت ہی نزدیکی رشتہ ہے روسی تہذیب کی تاریخ سے۔ حاضر نظامِ زندگی کو جڑ بنیاد سے بدل ڈالنے کا بیڑا اٹھایا ہے، غلام داری (سرفڈم) ڈھانچے کی بنیادوں کے خلاف قدم بڑھایا تو دسمبریوں نے اپنی تمام تحریروں میں اس انقلابی سوجھ بوجھ کا پرچار کیا جو تہذیب، ادب، سائنس اور آرٹ کی ترقی کے فریضے بتانے والی تھی" ــــــ یوں قومی کلچر کی ترقی کے سوال پہلی صف میں سامنے آگئے۔ (ک نمبر ۲۷، ص ۸۳-۲۸۲)

واقعہ بظاہر معمولی سا ہے: چاروں طرف سرگوشیاں شروع ہو رہی تھیں کہ کہیں انقلاب حکومت کی خفیہ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ۱۸۲۵ کے موسم خزاں میں زار الیکساندر اول کو پرچہ لگا کہ شمال اور جنوب، دو شاخوں میں اندر اندر کام ہو رہا ہے، اس نے فوراً سب لیڈروں کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ اُدھر خفیہ انقلابیوں میں طے نہ ہوسکا کہ مسلح کارروائی کہاں سے اور کب شروع ہو۔ ایک رائے تھی کہ زار کو سر دربار گولی سے اُڑا دیا جائے، ایک یہ کہ پریڈ گراؤنڈ میں عین معائنے کے وقت پلٹنیں ہتھیار اٹھالیں اور سرکاری عہدیداروں کو گرفتار کرلیں۔ شمال والے براہ راست پائے تخت سے وابستہ تھے اور سب کے سب فوجی افسر، امیر گھرانوں کے اعلا تعلیم یافتہ نوجوان۔ پیٹرسبورگ میں ۱۶ رجمنٹیں رہتی تھیں اور کئی افسر سازش میں شریک تھے، لیکن باہمی اختلاف سے

بچنے کے لیے سب سے سینیر افسر میجر جنرل کو اپنا ڈکٹیٹر طے کیا ــــــ جو بذات خود نہ سیاسی آدمی تھا، نہ سرفروش۔ جنوبی اور شمالی سوسائٹیوں میں ربط کمزور رہا۔ وہاں پیستل جیسا انقلابی رہنما موجود تھا اور ان لوگوں نے پایۂ تخت سے دور ہونے کا فائدہ اٹھا کر نیچے کے افسروں تک کو مٹھی میں لے رکھا تھا۔ وہاں (جہاں پوشکن بھی آتا جاتا رہا) بغاوت کی تیاری زیادہ پکی تھی۔

زار پایۂ تخت سے باہر (تگان روگ) گیا ہوا تھا، وہیں اچانک مرگیا، اولاد چھوڑی نہیں اسے معلوم تھا کہ بڑے بھائی ولی عہد کانستن تین (قسطنطین) نے [غیر ملکی بیوی اور شہریت قبول کرنے کی بنا پر] تخت سے دست برداری لکھ دی ہے، چھوٹا بھائی نکولائی پاولووچ شروع سے بدمزاج اور ظالم مشہور تھا۔ فوج اور خاص خاص لوگ جو اس کے حق میں نہیں تھے، انھوں نے قسطنطین کی تخت نشینی کا جابجا اعلان کر دیا۔ نکولائی نے پایۂ تخت میں تختِ حکومت پر قدم رکھا تو ردِ عمل پھیل گیٔ۔

خفیہ سوسائٹی کو زریں موقع ملا کہ اس ڈھلمل حالت میں، قسطنطین کے نام سے بغاوت کا پرچم بلند کرے، نکولائی کو گرفتار کر کے آئینی حکومت، سرفڈم کے خاتمے اور روسی ریپبلک کا اعلان کر دیا جائے۔ ۱۴ر دسمبر ۱۸۲۵ کو باغی پلٹنیں باہر سینٹ چوک میں نکلیں، لیڈر میجر جنرل غیر حاضر تھا۔ اور بغاوت کا دل و دماغ ریلئیف، غیر فوجی ہونے کے باعث بے اثر رہا۔ دوسرے لیڈر کاخوفکی نے پستول تانا، اس سے گولی نہ چلی۔ زار نکولائی پہلے تھرایا، پھر دیکھا کہ باغی بکھرے ہوئے ہیں، عوام محض تماشائی ہیں، فوراً فائر کا حکم دیا۔ پہلی باڑھ میں کچھ گر گئے، باقی تتر بتر ہو گئے، کچھ بھاگے اور برف پوش دریا میں ڈوب گئے۔ دو گھنٹے کے اندر میدان صاف ہو گیا۔

دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ پانچ لیڈروں کو پھانسی کا حکم ہوا، ۱۲۰ کو اول سزائے موت سنائی گئی تھی، شہنشاہ "عالی ظرفی کو کام میں لایا" اور پھانسی عمر قید میں بدل دی۔ اکثر سائبیریا بھیجے گئے، جو زندہ بچے وہ (۳۱ سال بعد) ۱۸۵۶ میں معافی عام کی بدولت وطن کو واپس آئے۔

پھانسی پانے والوں میں پیستل اور ریلئیف وہ دانش ور اور اہل قلم تھے جنھوں نے پوشکن کے ذہن کو مانجھا اور جی کھول کر داد دی تھی[1]۔ عمر قید کی سزا میں جو لوگ سائبیریا بھیجے گئے، ان

---

[1] اپریل ۲۵ء میں ڈلوگ نے ریلئیف کا خط پہنچایا تھا پوشکن کو جس میں نظم "بنجارے" پر مبارکباد دی گئی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر نوعمر شاعر کی ذہنی تربیت میں حصہ لیا تھا اور خود شاعر نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

میں لڑکپن کے دوست، پشت پناہ، اور "نئے خاندان" کے بہترین عزیز پوشچن اور کوخیل بیکر تھے، پرنس (جنرل) والکونسکی تھے جنھوں نے حال میں ہی رائیفسکی خاندان کی اسی لڑکی 'ماریا' سے شادی کی تھی، جس کی یاد کرائمیا کے سفر کے بعد چھ سال سے شاعر کی رگِ جاں کے قریب آباد تھی۔ آخر وہ بھی اپنی خوشی سے عہدِ وفا نبھانے کے لیے سائبیریا اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔

چند روز بعد اخباروں میں سرکاری اعلان نکلا کہ جس جس آدمی نے سازش کی خبر راز میں رکھی، اسے تجاہل عارفانہ کی سزا دی جائے گی۔ اور یوں شعلہ دب گیا، چنگاری دبی رہ گئی۔

واقعے سے اہم اس کا پس منظر ہے:

روس کی نئی نسل، جو ملٹن، روسو، والتیئر، وکٹر ہیوگو پڑھ کر جوان ہوئی، اپنے ملک کی مطلق العنانی اور جابرانہ طرزِ حکومت سے ناخوش تھی، نپولین کے حملے، روسی فوج کی پسپائی، ماسکو کی آتش زنی (۱۸۱۲ء) نے نشتر سے اس کا زخم چیرا، اور پھر نپولین کی پسپائی اور آخری شکست (۱۸۱۴ء) نے روس کے تعلیم یافتہ جوانوں، افسروں اور ذی ہوش رئیس زادوں کو یورپ میں فاتحانہ شان سے گھومنے کا موقع دیا تو ان پر باہر اور گھر کے اندرونی حالات کا ہولناک فرق کھلا۔ روس کی نوے فیصد آبادی تب تک پشت در پشت بڑے تعلقہ داروں اور جاگیرداروں سے وابستہ غلامانہ زندگی بسر کرتی تھی۔ شہر کے درمیانی طبقے اور عام دیہاتی کے درمیان، فوجی افسر اور زبردستی بھرتی کیے ہوئے کسان کے درمیان لباس، عادات، عقیدے اور سوجھ بوجھ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک روسی چھاپہ مار شاعر وینس دویدوف نے اپنی ڈائری میں ذاتی تجربہ لکھا ہے:

> ایسے مقامات پر بھی جو دشمن کے پہنچ سے باہر تھے، ہمیں کچھ کم مشکلات پیش نہیں آئیں۔ ہر طرف رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہر گاؤں نے اپنا پھاٹک بند کر رکھا تھا، پھاٹک کے سامنے بوڑھے، جوان سب پنج شاخے، کلہاڑے، کدالیں لے کر ڈٹے جاتے، بعضے تو گن گولوں سے لیس ہوا کرتے تھے۔ مجبوراً ہم میں سے کسی کو مقامی باشندوں کے پاس جا کر صدا لگانی پڑتی کہ ہم روسی ہیں اندر آنے دو، تمھاری مدد کو آئے ہیں، تمھیں اور اپنے سچے سلاف مذہب کو بچانے آئے ہیں۔ جواب میں ادھر سے بوچھار ہوتی، یا کلہاڑے پھینک کر مارے جاتے۔ ان کی زد سے قسمت ہی بچاتی تو ہم بچ جاتے تھے، ہم ان دیہات سے کترا کر بھی نکل سکتے تھے، لیکن میں چاہتا تھا لوگوں میں یہ خبر پھیلا ناکر فوج پیچھے ہٹ رہی ہے۔ ان میں اپنی حفاظت کی تیاری اور ہمیں دشمن کی آمد کی اطلاع دیتے رہنے کا جذبہ ابھارنا تھا۔

بہ مشکل یہ دیہاتی باشندے ہمارے سامنے سڑک پر جمع ہوتے ــــ اور جیسے ہی انھیں بھروسہ ہونے لگتا کہ ہم روسی ہیں، سپاہیوں کی خاطر تواضع شروع ہو جاتی۔ ہم پوچھتے کہ آخر ہم پر فرانسیسی ہونے کا دھوکہ کیوں ہوا؟ ہم تو روسی زبان بول رہے تھے تو ہر بار جواب ملتا کہ خطرہ رہتا ہے، اُن کے ہاں بھی ہر طرح کے (زبان والے) آدمی ہیں، یوں دیکھنے میں آپ اور وہ ایک سے ہی لگتے ہیں۔

وینس دویدوف ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالتا ہے:

"میں نے اپنے تجربے سے سیکھا کہ قومی جنگ میں صرف گنوار و زبان بول لینے سے کام نہیں چلتا بلکہ چال ڈھال میں، رسوم و آداب میں بھی ان کا سا بننا چاہیے۔ ۔ ۔"

اشراف و اجلاف کے درمیان عبرت ناک فاصلے کا یہ احساس دراصل اس تحریک کا جنم داتا ہے جو "آرگس" کی طرح سراپا چشم تھی، جس نے ملک کی معاشی، سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے ہر ایک پہلو پر تنقیدی نظر ڈالی، روس کی قومی زندگی کے سمندر کو متھ کر وہ باخبر اور دردمند نوجوان نکالے جو دنیا کے لیے سائنسی انکشافات کو ترقی پذیر زمانے کے تقاضوں کو اور اپنے یہاں کے پرانے روگوں کو پہچانتے تھے اور اس پہچان کی قیمت اپنے سروں سے ادا کرنے کو آمادہ تھے۔ یہی لوگ بالآخر "دسمبری" کہلائے۔

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

ایک دہائی پوری نہ ہوئی تھی کہ ان میں سے کچھ پھانسی کے پھندے پر جھول گئے، کچھ نے جوانیاں جلاوطنی کی قید بامشقت میں گزار دیں اور جو بچے وہ یا تو سیل ہو گئے، یا دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دیتے رہے۔ اس آخری گروہ میں الیکساندر سرگے یچ پوشکن نمایاں ہے۔

کشتی میں بہت سے لوگ تھے ہم
کچھ کستے تھے بادبان کی ڈور
چپّو پہ لگا رہے تھے کچھ زور
بے صوت و صدا ہمارا مانجھی
تھا جان پہ کھیل جانے والا
یہ بارِ گراں اٹھانے والا

بے فکر تھا مَیں کہ گا رہا تھا
دل دوستوں کے بڑھا رہا تھا
اتنے میں ہوا کے بدلے تیور
کشتی کو دیا بھنور نے چکّر؛
مانجھی ہی رہا، نہ یار باقی
میں رہ گیا سوگوار باقی
موجوں نے کیا اُنھیں نوالہ
اور مجھ کو کنارے لاکے ڈالا
اَب بیتے دنوں کے گیت گاؤں!
اور دھوپ میں چیتھڑے سُکھاؤں!

سوال یہ تھا کہ اوّل سیاسی پسماندگی دور کرنے پر ساری قوت لگائی جائے یا ذہنی روشنی پھیلانے پر؟ جو نوجوان پوشکن کے ساتھ "لیزیم" کی تعلیم پاکر نکلے (۱۸۔ ۱۸۱۷ء) وہ اگرچہ علم کی کسی ایک شاخ میں گہرے نہیں اترے تھے، تاہم فلسفہ، ادب، تاریخ، معاشیات اور علم حساب کے علاوہ قانون اور حقوق کی بنیادی آگاہی نے ان میں وسعتِ نظر پیدا کر دی تھی اور یوروپی جدید علوم کے مطالعے نے اپنے پسندیدہ موضوع پر انھیں قلم اٹھانے کے قابل بھی بنایا۔ کوخیل بیکر، ڈلوِگ، ارلوف، یاکوشکن، ریلسیَیف، پوشیچن، ایلی چیفسکی سب اسی کھیت کی بے چین روحیں تھیں؛ پھر وہ جوان تھے جو تب تک تعلیم کے علاوہ زندگی کے تجربات میں تپ چکے تھے۔ مثلاً پیستل، دَویدوف، چادئیف، ولادیمیر رائیفسکی، موراوئیف، پلتنیف، کاتے نِن، بستوژوف، میودر گلینکا، نکولائی تورگینیف، براتنسکی، شاخوفسکی، اور والکونسکی، پھر ایسے تھے جو پوری طرح کسی عملی تحریک میں نہیں کود سکتے تھے، لیکن دل سے ہمدردی رکھتے تھے مثلاً پرنس ویازیمسکی، نیری کوف (پیدائش ۱۸۰۳ء) اور رباتوشکوف جو اپنے علم اور جذباتی شدّت کی تاب نہ لاسکا اور ۱۸۲۱ء میں دیوانہ ہوگیا۔ ادب، آرٹ، قدرتی سائنس اور سیاست سے ان لوگوں کو یکساں دل چسپی تھی۔

عام خیال تھا کہ یوروپ میں آزادانہ ماحول کی اٹھان تعلیم اور روشن خیالی کی بدولت ہوئی ہے۔ اور روس کے جابرانہ قوانین کے سائے میں بھی روشن خیالی پھیلانا ممکن ہے[1] یہیں

[1] روسی ادب میں تب تک لفظ کلچر "Культура" موجودہ معنوں میں استعمال نہیں (فٹ نوٹ جاری)

سے کام شروع کیا جائے۔

نوجوان مصنفین کی انجمن "ارزماس" اور اس کے بعد "ہرالیمپ" ذہنی محاذ بنے جن میں، انقلابی و غیر انقلابی، معتدل، لبرل سبھی شامل تھے، انھی میں سے چھن کر خفیہ سرگرمی کی سیاسی سوسائٹی تک پہنچتے تھے یہیں سے خیالات میں گہرے اور ہلکے رنگوں کا فرق اُبھرا۔ ایک رجحان یہ تھا کہ رفتہ رفتہ تعلیم و تہذیب پھیلے گی تو ترقی کی راہ کھُلے گی۔ علم کی روشنی اندھ وشواس اور غلامی یا فرماں برداری کا اندھیرا برداشت نہیں کرتی۔ نکولائی تورگینف نے لکھا:

"تنہا تعلیم و تہذیب کی راہ آزادی کی منزل تک نہیں لے جا سکتی۔ اس کے برعکس آزادی ہے جو لازماً تعلیم و تہذیب تک لے جائے گی . . ."

بحث میں یہ نکتہ اٹھنا قدرتی تھا کہ تعلیم سے مراد کیا ہے۔ اسکولوں، کالجوں کی سندیں، عام خواندگی یا صحیح معنوں میں دل و دماغ کی تربیت؟ بستوژوف نے اس خیال کو یوں قول بند کیا:

عالم آدمی اور ذہنی طور پر ترقی یافتہ (روشن خیال) شخص میں کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ عالم آدمی کو علم و فضل سے آبرو ملتی ہے اور علم و فضل کی آبرو روشن خیال کے دم سے ہے۔

پوشکن نے اسی خیال کی تائید اپنے طنزیہ انداز میں کی کہ

ملکہ ایکاترینا (کیتھرائن) دوم بھی بڑی ذی علم بلکہ علم دوست تھی، لیکن اسی کے جلادوں نے، "علم کی پہلی کرنیں پھیلانے والے نووی کوف" کو جیل میں ڈالا، رادی شیف کو عمر قید کی سزائیں سائبیریا بھیجا، کنیاژنین معتوب ہو کر مرا، فان ویزن کی غیر معمولی شہرت اسے بچا لیتی، وہ اس سے ڈری نہ ہوتی تو وہ بھی مصیبت میں پڑتا۔

کاخوفسکی نے چند لفظوں میں اس بحث کا خلاصہ کر دیا یہ لکھ کر:

'وہی ملک شاد آباد ہوگا جہاں قانونی آزادی کے طفیل میں تعلیم و تہذیب پھلے پھولے'

اس تحریک نے گہرے اور ہلکے رنگ (یا گرم اور معتدل) کے فرق کے ساتھ ہر محاذ پر دھاوا بول دیا، زندہ شعور، نئی روشنی اور سماجی ترقی کے لیے صرف کتابی تعلیم ناکافی سمجھ کر معاشی اور سیاسی آزادی

ہوتا تھا۔ تعلیم و تربیت اور تہذیب کے مفہوم پر ایک لفظ حاوی تھا: پراسوی شینیے Просвещение جسے ہم روشن خیالی یا نئی روشنی کہہ سکتے ہیں۔

کی جد وجہد کو کلیدی اہمیت دی گئی۔ آزادی پسند نوجوانوں کی سماجی فکر بہرحال اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ موجودہ تعلیمی نظام ناکارہ، عہدِ دن کے طلب گار پیدا کرتا ہے، اسے بدلنے کے لیے سیاسی جد وجہد کی ضرورت ہے اور عام آبادی کا سیاسی شعور بیدار کرنے کے لیے نئے علمی، ادبی، تہذیبی خیالات عام کرنے کی؛ دونوں ایک دوسرے سے قطعی وابستہ ہیں۔ اس صورت میں روشن خیال، بیدار مغز ادیبوں اور سائنس دانوں کا فرض ہے کہ فکر و فن کے سماجی رول پر زور دیں، اپنے دَور کے سب سے ترقی یافتہ خیالات پھیلائیں اور رائے عامہ کی تربیت میں رہنمائی کا فرض انجام دیں۔ خود اس جد وجہد کی صفِ اول میں نکل کر آئیں۔

وہ ادبی انجمنیں اور حلقے، جو دسمبریوں کی خفیہ پولیٹکل سوسائٹیوں سے نزدیکی واسطہ رکھتے تھے، یہی غرض پوری کرنے لگے۔ ان انجمنوں کے بارے میں بستوژوف نے کیا کھلی بات کہی! ادبی انجمنوں میں حاضرین کے سامنے کسی تصنیف کا پڑھا جانا ہونہار اہلِ قلم کے درمیان مقابلے (یا مسابقت) کا جذبہ اُبھارتا ہے، لوگوں میں اپنی زبان و ادب کا ذوق اُجاگر کرتا ہے۔ یہ صرف حسنِ اتفاق نہیں کہ وہاں آنے والے جب واپس اپنے گھر کا رخ کرتے ہیں تو نیا شعور، نئی فہم اور کام کی باتیں لیے ہوئے جاتے ہیں؛

یہ مضمون قطبی ستارہ (Polar Star) رسالے کی ۱۸۲۴ء کی اشاعت سے لیا گیا ہے۔ یہاں ذکر ان دنوں کا ہے جب ان نوجوانوں کو مطالعہ بڑھانے کے لیے تاریخ و فلسفہ، آرٹ اور ادبیات کے خاص مضامین اور تصانیف تجویز کی جاتی تھیں، ایسی تحریریں جن میں قومی تاریخ اور تہذیب کے ترقی یافتہ نظریوں کا، اپنے پرکھوں کا اور ان کے ساتھ اپنے سمبندھوں کا گیان ملے۔

یہ سلسلہ شروع ہوئے دو تین سال ہی گئے ہوں گے کہ ۱۸۱۸ء میں کرامزین کی "تاریخ ریاستِ روس" کی پہلی آٹھ جلدیں چھپ کر بازار میں آگئیں[1]۔ برسوں سے ان کا چرچا تھا، مہینے میں ۳ ہزار بیش قیمت کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ تب تک روس میں کسی سنجیدہ اور مستند کتاب کی اتنی مانگ نہ ہوتی تھی۔ کرامزین نے حالاں کہ تلاش و تحقیق کا حق ادا کر دیا تھا، اور ریاست روس کی قدامت دریافت کر کے قومی احساس میں نئی روح پھونکی تھی؛ تاہم دسمبریوں کے نزدیک خود مورخ بھی قدامت پرست اور دربار کا کرسی نشین تھا اور اس نے واقعات کی کڑیاں جوڑتے وقت جو

---

[1] ۱۸۲۴ء تک گیارہ جلدیں چھپ چکی تھیں، بارہویں تکمیل کے قریب تھی کہ ۱۸۲۶ء میں کرامزین کا انتقال ہو گیا۔

نظریے کا ٹانکا لگایا وہ بھی مطلق العنان بادشاہی کا پایہ مضبوط کرنے کی خاطر لگایا تھا۔ مثلاً ایک مقام پر کرامزین اس نتیجے پر حجت تمام کرتے ہیں :

شخصی اقتدار ہونا قانون کا ناپید ہونا نہیں ہے۔ کیوں کہ جہاں فرض شناسی ہوگی وہیں قانون ہوگا۔ کسی زمانے میں کسی نے کبھی اس میں شک نہیں کیا کہ بادشاہوں کی فرض شناسی رعایا کو راحت و خوش حالی دے سکتی ہے۔

پوشکن حالاں کہ کرامزین کا ادب کرتا تھا اور احسان مند بھی تھا، اس نظریے پر چپ نہ رہ سکا اور اس نے ہجو لکھ دی :

"تاریخ" اُن کی حسن و سلامت میں ہے کمال
قائل ہوئے ہیں ہم بھی، نہیں کوئی قیل و قال
لازم ہے ایک شخص کو سرکار ماننا
ہنٹر سے پیار کرتی ہے، ہم روسیوں کی کھال

نکولائی تورگینف نے "تاریخ روس" کی ان آٹھ جلدوں پر بحث کر کے یہ فیصلہ صادر کیا :

کرامزین جب واقعات بیان کرتے ہیں، تو بہت خوب ہیں، جب نتیجے نکالتے اور فلسفہ چھانٹنے لگتے ہیں تو بالکل بکواس پر اُتر آتے ہیں۔

تاہم کرامزین کی تاریخ دلیل و فلسفہ ہی نہیں، جدید علمی نثر کا ایک کامیاب اور زندہ نمونہ بھی تھی اور علمی ذہن رکھنے والے دسمبری اس سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکے۔

جدید علمی نثر گیتوں، رومانی نظموں[1] (غزلوں)، خطابیہ، شاندار الفاظ پروئے ہوئے منظوم کلام کے سہارے نہیں ابھر سکتی تھی، اس کے لیے ضروری تھا کہ سائنسی اور تنقیدی مضامین، سفرنامے، ڈرامے، تاریخی افسانے، انشائیے سادہ مگر ٹھہرے ہوئے لہجے میں زیادہ سے زیادہ اشاعت پائیں، اس کام کے لیے نئے رسالوں، انجمنوں اور اشاعت گھروں کی ضرورت تھی، جو یوروپی، خصوصاً فرانسیسی اور انگریزی ادبیات کی اُٹھان سے، جملوں کی ساخت سے، غیر ملکی الفاظ اور استعاروں کی کھپت سے فیض اٹھا کر روسی زبان کی پُرانی منڈیریں ہٹائیں۔ کرامزین نے تاریخ کے مضمون کی حد تک ایک مثال سامنے رکھ دی تھی۔ دسمبریوں میں کئی اہل قلم یہ فریضہ لے کر آگے بڑھے۔

---

[1] بعض مختصر نظمیں اپنے رومانی یا غنائی انداز میں غزلِ مسلسل نظر آتی ہیں۔

پوشکن چار سال (۲۴ - ۱۸۲۰) روس کے تہذیبی مرکز سے دور "جلاوطنی کا بھتہ" پا رہا تھا جب "ہرالیمپ" نام کی محدود ادبی انجمن ٹوٹ کر، دوسری زیادہ وسیع، قانونی اور جمہوری انجمن قائم ہوئی! روسی ادبیات کے پریمیوں کی آزاد سوسائٹی دو ایک سال کے اندر دسمبری خیالات کے گرم مزاجوں بستوژوف، ریلیئیف، فیودر گلینکا اور کورنی لووچ نے اسے اپنے اثر میں لے لیا۔ یہ لوگ کئی سنجیدہ رسالوں اور اشاعت گھروں میں بھی دخیل ہو گئے۔ "وطن کا سپوت"، "قطبی ستارہ"، "آئینۂ نیوا" اور سالنامے (المناخ) وغیرہ ان کے اثر میں آ گئے۔ بالآخر دو رسالے ان کے ترجمان بن گئے؛ "قطبی ستارہ" کے ایڈیٹر بستوژوف اور ریلئیف تھے، اور "منےِ موزین" (Mnemosyne) کا ایڈیٹر کوخیل بیکر ـــــ یہ جرمن نژاد روسی محبِ وطن نوجوانی میں ہی روس کی سرحدوں سے باہر تک آواز پہنچانے لگا تھا۔ ۱۸۲۱ء میں اس نے پیرس کے ایک بھرے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے روسی زبان کے بارے میں غلط فہمیاں دور کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا:

> "ہمارے پس ماندہ [اور سادہ] عوام کی یہ زبان "بے تکلف، جاندار اور دولت مند زبان تب وجود میں آئی جب کسان کی غلام داری اور من مانی (Despotism) حکومت کا وجود نہ تھا، لہٰذا اس میں بجائے خود ایک تریاق موجود ہے اس زہر کا جو ظلم و جبر اور جاگیردارانہ نظام کے جان لیوا عمل کے کارن پھیلتا ہے..... آج تک لفظ آزادی، ہر ایک سچے روسی سینے میں ہلچل برپا کرنے کی قوت رکھتا ہے......[1]"

اس تحریک میں قومی آزادی کے نعرے اور پروگرام نے سیاسی اور تہذیبی، دونوں بازو پھیلا دیے تو سوال یہ اٹھا کہ نئے ادب، آرٹ اور تھیٹر کا دیسی دستور، رسوم اور زبان سے کیا اور کتنا تعلق ہو۔ اس کا جواب تلاش کرنے میں داہنے اور بائیں بازو کے دسمبریوں نے شروع میں توازن کھو دیا، کچھ نئے پُرجوش اہل قلم قومی اور عوامی کو ہم معنی سمجھے، کچھ جو قلم کے مرد میدان تھے، فرانس کے انسائیکلوپیڈیائی ادب کی مثال دیتے دیتے یہاں تک پہنچے کہ باہر کے مضامین اور انداز تحریر کو اپنانا چاہیے۔ "پرتگال سے لے کر روس تک" جتنی سیاسی یا تہذیبی لہریں اٹھتی ہیں، ان

---

[1] یہاں کوخیل بیکر نے عوامی زبان کا لفظ "Вольность" استعمال کیا ہے جو Boir یا Will سے مشتق ہے یعنی اپنے ارادے سے آزادانہ عمل کرنا، من کی موج، عین یہی عنوان ہے پوشکن کی اس نظم کا جو کچھ دن پہلے لکھی گئی اور جسے دسمبریوں نے زبانی یاد کر لیا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ اس لکچر کی بنا پر فرانس میں روسی سفارت خانے کے حکم سے کوخیل بیکر کو بیک بینی و دوگوش روس واپس بھیج دیا گیا۔ (ظ ا)

سب سے روس کے ترقی یافتہ ذہنوں کا براہ راست رشتہ مان لینے اور جتانے کے بعد یہ حد بندی دشوار تھی کہ زبان، ادب، انداز بیان ـــــ اور خود سائنسی مسائل ہیں کیا شے قومی ہے، کیا نہیں ہے، کن غیر ملکی ـــــ اثرات کا قبول کرنا، انھیں جنتا کے لیے قابلِ قبول بنانا ضروری ہے، اور کن سے کترانا لازم!

۳۰ ـ ۱۸۲۰ کے درمیان روس کے روشن خیال ـــــ خصوصاً دسمبری حلقوں میں جو بحثیں چھڑی ہیں، ان کی معنویت آج بھی باقی ہے اور ہمارے شاعر کا دامن ان سب سے وابستہ ہے۔ عوامی فن کار دبرولیوبوف نے لکھا تھا:

"ہر وہ چیز جس میں روسی زندگی جھلکی، پوشکن نے اس پر اپنا تاثر ظاہر کیا؛ ہر پہلو سے اُلٹ پلٹ کر دیکھا، اور ہر مرحلے میں اس پر پوری نظر رکھی۔"

فرانسیسی رنگ میں رنگے جا چکنے کے بعد، اس نے جب انگریزی ادبیات کا مطالعہ کیا تو روس کی نئی نسل کو ادھر خاص توجہ دلائی۔ فرنچ کے "نازک اندام" طرز بیان سے خود کو آزاد کیا اور زور دے کر کہا کہ:

ڈرائنگ روم کے تکلفات والا ادب سائنسی علوم کی تیز روشنی کی تاب نہ لا سکے گا۔

رومانی تحریک ۱۹ ویں صدی شروع ہوتے ہوتے سائنس اور صنعت کے ساتھ زاویے بدلتی ہوئی اب اس مقام پر آ پہنچی تھی جہاں شاعری (یا شاعرانہ فن کاری) کو یا تو سائنس کا حریف ہونا تھا یا حلیف ـــــ ورڈسورتھ نے کہا کہ " Man of Science " (سائنس والے) اور شاعر کا نباہ مشکل ہی نظر آتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جب سائنسی انکشافات عام فہم ہو کر روزمرہ زندگی کا حصہ بن جائیں تو شاعر بھی اس پر طبع آزمائی کیا کریں[1]۔

کیٹس (Keats) سائنسی انکشافات کی "بے رحمی" سے برہم ہو گیا کہ قوس قزح کے رنگوں کا تجزیہ اس کی شاعرانہ دل کشی کو دبائے گا اور مشین کی گڑگڑاہٹ سُریلی بانسری کے رمز و ایمائی راگ کو پیس ڈالے گی۔ شیلی (Shelley) کو شروع سے فزکس اور کیمسٹری کی تازہ دریافتوں

---

[1] ملاحظہ ہو " Wordsworth " کا اپنے مجموعہ کلام (Lyrical ballade) پر مفصل دیباچہ (۱۸۰۰ء) جو عین اسی طرح انگریزی رومانی تحریک کا مینی فسٹو ثابت ہوا جیسے پوشکن کی مثنوی "باغچہ سرائے کا فوارہ" پر ویازیمسکی کا یادگار دیباچہ جس نے روس کے ادبی حلقوں میں دھوم مچا دی۔ (ظا)

کی لگن تھی، عجب نہیں کہ اور جیتا رہتا تو سائنس اور شاعری کے درمیان تعاون و توازن کی ایک مثال قائم کر جاتا ـــــ اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ فرانس کی علمی اور ادبی زندگی میں بھی ہلچل تھی۔ وہاں صنعتی کاروبار اور پیداوار کی ترقی انگلینڈ کے مقابلے میں تیز تر تھی اور اسی نسبت سے شعرو سائنس کی کشش بھی۔

فیوزیل (C. Fusil) نے اپنی اس ریسرچ میں جو فرانس کے اندر سائنسی شاعری " La Poesie Scientifique " کی تاریخ سے منسوب ہے، ۱۸ ویں صدی کے وسط سے اس کی ابتدا دکھائی ہے۔ رالف کرم (Ralph B. Crum) نے اپنی تصنیف " Scientific Thought in Poetry " میں خصوصیت سے پانچواں باب اسی پر صرف کیا ہے کہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس سے پہلے ہی سائنسی ترقی اور میکینکل کے روز افزوں اُبھار نے فرینچ تخلیقی ادب میں کیا گونج پیدا کی . . . . سال لمبیے نے اپنی کتاب "سال کے موسم" (Времена года) میں، مثلاً اس بات پر زور دیا ہے کہ "سائنس کی ترقیوں نے، طبعیات، فلکیات، کیمسٹری، نباتات وغیرہ کے شعبوں کے مشترکہ فتوحات نے دنیا کے قلعوں کا اور اس کے باشندوں کا علم بڑھانے میں مدد کی . . . . خوش بیان فلسفیوں نے فزکس کو ایک خوش گوار سائنس بنا دیا۔ اس کے افکار پھیلائے اور عام فہم کر دیے، لہٰذا اب فلسفے کی زبان شاعری کی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ امکان پیدا ہوا کہ ایسی نظمیں لکھی جائیں جو عالم فطرت کے مختلف پہلوؤں کی جانکاری کا تقاضا کریں۔" (ک نمبر ۱۹۔ ص ۲۹)

چناں چہ فرانس کے دانش وَر اہل قلم نے "علمی شاعری" (Scientific Poetry) کے معیاری نمونے دینے شروع کیے۔ روس کے دانش وروں میں، جن کا ہراول دستہ دسمبری کہلایا، یہی بحث چلی۔ ۹ اپریل ۱۸۳۲ء کی تاریخ میں ـــــ ای۔ ایم سنے گیریف کی ڈائری میں یہ اندراج ہے:

. . . . ای، ای دوید وت کے ہاں ڈنر تھا۔ گفتگو چھڑی کہ قدرتی سائنسوں کے مقابلے میں ادبیات پیچھے رہ گئیں؛ ارسطو کے زمانے سے گویا اٹکی ہوئی ہیں؛ جس طرح فزیالوجی کے بغیر جمالیات کا علم حاصل نہیں ہوتا، تو ایسے ہی یہ ہے کہ علم الاشیا کے بغیر روحانی دنیا کی سمجھ نہیں آتی . . .

اگلے سال روس کے باخبر اخبار "مخبر یورپ" میں پادیل موروزوف کی تقریر چھپی جو ماسکو

یونیورسٹی میں ایک ہاسٹل کے افتتاحی موقع پر دی گئی تھی :

,, قطعی (نیچرل) سائنسوں کا اثر ادبیاتی علموں کی ترقی پر" اہم نکتہ یہ ہے کہ "ہماری بھرپور زندگی کی خیریت اسی میں ہے کہ ان علوم کو جو دل اور دماغ پر یکساں اثر ڈالتے ہیں، ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے"۔ ڈلوگ، کوخیل بیکرا اور پوشکن نے بھی اسی بحث میں حصہ لیا۔ پوشکن کے ہاں لفظ ہوش مندی، معقولیت، عقل کی روشنی اور فکری وجدان (Вдохнольённый разум) اسی زمانے میں اُبھرتا ہے اور اسے پیش منظر تک لانے میں ان سرفروش جنوبی دسمبریوں کا بھی ہاتھ تھا جو عقلیت اور حریت کا غیر ملکی ادب مطالعے میں رکھتے تھے"۔

الیکٹرومیگناٹزم کی دریافت ۱۸۲۰ء میں ہوئی اور پی ایل شیلنگ نے پائے تخت میں ۱۸۳۲ء میں ٹیلی گراف کے تار لگائے، لیکن اس سے کئی سال پہلے فرانسیسی اور انگریزی ادب کے تار پائے تخت کے شمالیوں اور کیئف کے جنوبیوں سے ملے ہوئے تھے۔ وہاں کی ہر ایک سائنسی ایجاد یا ادبی بحث یہاں صدائے بازگشت پیدا کرتی تھی۔ صنعتی دور کا روس عالم ایجاد میں قدم رکھنے والا تھا:

"حق یہ ہے کہ نئے روس کی خاطر سب کچھ حرکت میں لایا گیا: پلوٹارک اور رسے روئ ۱۸ ویں صدی کے فرانسیسی علم پرور، خصوصاً روسو اور والتیئر، ۱۹ ویں صدی کا مغربی سیاسی لٹریچر، بنجامن کانستن، دیتیو دے تراسی وغیرہ، سے ئی، آدم اسمتھ، سیسمونڈ کی پولٹکل اکانومی پر تصانیف اور وقت کے معروف غیر ملکی اخبار اور رسالے سبھی [کام آئے] ترقی یافتہ نسل کو سماجی افکار و خیالات سے باخبر رہنے کی اتنی لگن تھی کہ بعض اوقات باہر کی کتابیں خود اپنے ملکوں کے بہ نسبت روس میں زیادہ مشہور اور مہیا ہو جاتی تھیں۔ اس پر کاخوفسکی نے کہا تھا کہ "سخت سنسرشپ نے پولیس اور کسٹمز چوکیوں کے سارے پہرے بٹھائے، جتن کر لیے، تاہم کہیں اور کبھی کامیاب نہ ہو سکی باہر کی کتابوں کو اندر آنے یا اندر کی تصانیف کو روکنے میں کسی بھی کتاب پر قانونی بندش لگانی کی دیر ہے کہ بس لوگوں کو اس کی کُرید لگ جاتی ہے اور [اگر مطبوعہ فراہم نہ ہو تو] قلمی نقلیں دست بدست گشت کرنے لگتی ہیں۔ فرانس میں کسی کتاب پر پابندی لگی اور کم سے کم وقت میں وہ روس کے منظر پر نمودار ہوئی"۔[۱۵] (ک نمبر ۲، ص ۳۰۷)

(حاشیہ جاری)

قانونی اور غیر قانونی راہوں سے در آمد کیے ہوئے علم وادب نے ترقی یافتہ ذہنوں کو تو بیدار کیا مگر قومی آزادی اور روشن خیالی کی خاطر ان خیالات کو عام آدمی تک پہنچانا، قابلِ قبول بنانا ضروری تھا۔

کسی قومیت کی پہچان کیا ہے؟ وہ کیا اجزا ہیں جن سے قومی مزاج بنتا ہے؟ پہلے یہ طے ہو تب نئے خیالات اور ان کے اظہار کو قومی سانچے میں ڈھالا جائے۔ اس موضوع پر دو اہم تحریریں نکلیں جنھوں نے بحث کو ہوا دی: پتیر سبورگ کا سفرنامہ، اور جرمنی میں ایک دوست کے نام [کھلا] خط، "خط" میں قوم کی اپنی پہچان (Identity) کو منحصر کیا گیا تھا لباس، جن گان، لوک گیت، اور مشترک تاریخ پر ــــــ یہ ہیں وہ خصوصیات جنھیں ادبیات اور تھیٹر کا بانی شمار ہونا چاہیے۔ قوم کی چال ڈھال کو ایک خاص رنگ دینے والے دو عناصر ہیں: مخصوص آب وہوا اور اندرونی بند و بست (حکومت یا انتظامیہ) کا طرز، یہی عناصر ہیں جو قوم یا جاتی کے کیرکٹر پر قومیت کی مہر لگاتے ہیں۔

بالواسطہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ روسی قوم کے نئے ادب، آرٹ اور افکار کو آگے بڑھنے میں قومی روایت[1] ملحوظ رکھنی چاہیے۔ ہم عصر پلیرندی نے اپنی یادداشت میں پوشکن اور رفیود ریائفسکی کی ایک گفتگو کا حوالہ دیا ہے "اس نے پوشکن پر زور ڈالا کہ روسی شاعری میں روم اور یونان قدیم کی مائتھولوجی (دیومالا) سے یا تاریخی کرداروں سے ہرگز نام [مستعار] نہیں لینا چاہیے۔ خود ہمارے پاس خود اپنا یہ بھی موجود ہے، وہ بھی۔"

پوشکن نے پلیرندی سے کہا کہ رائیفسکی تو زبردستی کر رہا ہے کہ سب کچھ صرف روسی تاریخ سے ہی لیا جائے۔ یوں، گویا دسمبریوں نے ــــــ جو خود بدیسی مال کے بڑے شیدائی تھے اور اسی میں پل کر جوان ہوئے تھے، علم وادب میں سودیشی کی تحریک چلا دی۔ مادی زندگی میں ابھی سودیشی

---

[1] اردو میں مارکسی اور بعض اوقات ترقی پسند یا انقلابی تصانیف کے ساتھ بھی یہی عمل ۲۱-۱۹۲۰ میں ہوا مثلاً افسانوں کا مجموعہ "انگارے" یا جوش کی نظم "سوداگروں سے خطاب"۔

[2] لفظ "روایت" یہاں رعایتہً لکھ دیا گیا ہے۔ Tradition کے مقام پر روایت لکھنا اگرچہ رواج پا گیا، تاہم آدھا مفہوم ادا کرتا ہے۔ بڑے ڈی شن ایک تو روایت ہوتی ہے نسل در نسل، دوسرے رسم، رواج یا چلن، جو بیان نہیں کیا جاتا، برتا جاتا ہے۔ ایسے مقام پر "روایت" لکھنا مناسب نہیں۔ ظ ا

کا دورد ورپتہ نہ تھا۔

انھی دو ایک برسوں میں پوشکن کی نظم 'وادیم' نکلتی ہے، اسی کے ساتھ روسی تاریخ پر شاعر کا نوٹ۔ ان دونوں میں صاف نظر آتا ہے کہ روس کی ۱۸ ویں صدی کی تاریخ کو دسمبری اہل قلم کس طرح چھان کر برتنا چاہتے تھے ـــــ اسی نقطہ نظر نے سائنسی بنیاد پکڑی تو صدی کے آخر میں پلیے خانوف کا نظریہ تاریخ سامنے آیا۔ جس کا رشتہ مارکسی فکر سے تھا:

دسمبری [پوشکن سمیت] خوب سمجھتے تھے کہ آرٹ قومی ہونے پر بھی بنی نوع انسان کو جوڑتا ہے۔ الیکساندر بستوژوف نے فنی تخلیق کے بارے میں کہا "حسن بیان اور شاعری کا جی نی یس تمام ملکوں کا باشندہ ہے۔" اپنے مضمون "روس میں پرانے اور نئے ادبیات پر نظر" میں یہ بات کہی تھی۔ ۱۸۲۴ء اور شروع ۱۸۲۵ء کے دوران روسی ادبیات پر دوسرے مضمون میں اس نے غیر ملکی کتابوں کے ترجموں کی اہمیت جتائی اور اسے "انجمن رفاہِ عام" [انقلاب کی خفیہ تیاری کرنے والی سوسائٹی] کے دستور کے ساتھ شائع کیا.....

کوخیل بیکر نے اپنے مضمون "پچھلے دس سال کے دوران ہماری شاعری، خاص کر غنائی شاعری کا رخ" میں یہ جتایا کہ عالمی ادب اور روسی ادب کا باہمی رشتہ کیا ہونا چاہیے۔ روس کو تمام عالمی تہذیب اپنا لینی چاہیے اور صرف مغربی یوروپ کی نہیں، مشرق کی بھی: ہمارے اہل قلم کے شعور، ہنر اور محنت کی بدولت روس آج اس قابل ہے کہ یوروپ اور ایشیا کی ذہانتوں کا حاصل اپنے دامن میں سمیٹ لے۔" فردوسی، حافظ، سعدی، جامی، [کے فن پارے] روسی ادیبوں کے انتظار میں ہیں۔" لیکن ساتھ ہی خبردار کرتا ہے کہ غیر ادبیات کو صرف اپنا لینا کافی نہیں، بلکہ روس کی شان اسی میں ہے کہ "شاعری اصل نسل میں روسی ہو۔" گیت اور داستانیں عوامی ہوں، صاف ستھری، نفیس اور سچا سرچشمہ ہمارے ادبیات کا۔ یہ نکتہ جتاتے وقت اس نے پوشکن کی مثال دی اور اس سے آئندہ کی امیدیں وابستہ کی ہیں۔

عالمی ادب سے سیکھ کر اس کا حاصل روسی خصوصیات کے سانچے ڈھالنا، یہ تھا ان لوگوں کے نزدیک "اپنا لینے" کا مفہوم۔ اسی لیے وہ بار بار نقالی کے چلن پر سخت تنقیدیں کرتے تھے (کیوں کہ روس ابھی مغربی یوروپ نہیں تھا)، پوشکن نے اس سے دو برس پہلے ہی تنقیدوں اور تبصروں میں نقل بے عقل، پر حملہ شروع کر دیا تھا۔ فرانسیسی ادب پر اپنے تبصرے میں ایسے نقالوں کی فہرست بھی گنا دی۔

در مضمون یوں تمام کیا:

"!.... ارے ہمارے پاس کیا نہیں! ہمت سے بڑھو! اپنی زبان ہے، ریت رسم ہے تاریخ ہے، گیت ہیں، کہانیاں ہیں اور بہت کچھ ہے...."

نقل صرف روس میں نہیں چل رہی تھی، خود فرانس میں بعض نئے ہن کے شوقین اہل قلم اسی مرض میں مبتلا تھے۔ ۱۸۲۵ء میں " Revue Encyclopaedic " میں شائع شدہ Arto کا ایک مضمون "وطن کا سپوت" رسالے نے شائع کیا، جس میں عام لوگوں سے فرانسیسی ادب کی دوری یا اجنبیت کا سبب یہ بتایا گیا تھا کہ وہ اکادیزم (علمیت بگھارنے) میں پکی نقالی میں، اور پُر تکلف وضع داری میں گرفتار ہو گیا۔ مصنف اسی ضمن میں لکھتا ہے:

" اصل بات یہ نہیں کہ شکسپیر کی نقل کی جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم اپنے زمانے کی اسپرٹ (روحِ عصر) سے تال میل رکھ کر ویسے ادب پیدا کریں جیسے شکسپیر نے اپنے زمانے کے لیے کیا۔ تب ہم اپنے دَور کے ساتھ قدم ملائیں گے۔ محض نقل سے آج تک کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں پایا۔"

نقالی سے بچنے اور خود نیا ادب پیدا کرنے کی کوششوں میں برابر افراط و تفریط ہوتی رہی۔ روس کے پاس عوامی ادب کے کئی بہترین نمونے موجود تھے مثلاً کری لوف کی سادہ داستانیں، دِرژاوِین کی چند رواں، عام فہم نظمیں۔ ژوکوفسکی اور کاتے نین کے کلام میں چند مقامات کریلوف کو پُشکن نے روسی عوام کی روح کا نمائندہ قرار دیا اور دِرژاوِین کو پوری نسل کا پیش رو۔ مگر ان نمونوں سے نئے روسی ادب کا بھلا نہیں ہونے والا تھا۔ ادب کو پرانی حد بندیوں، اصنافِ سخن کے مقررہ اصولوں، ضابطوں اور پُر تکلف آداب سے نکال کر دیہات، بازار اور چھاؤنیوں کی سیر کرانی تھی، لیکن "عوامی" کہہ کر اس کا معیار نیچا رکھتے ہیں خود وہ مقصد ہی فوت ہو جاتا جس کے لیے دسمبری دانش وَر تہذیبی میدان میں اُترے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں پوشکن نے ایک اہم تنقیدی مضمون لکھا: "ادب میں عوامی پن" اور جم کر اس بات کی مخالفت کی کہ قومی تاریخ اور تاریخی افسانوں میں سے ہی موضوعات چُنے جائیں انھیں موٹی جھوٹی زبان میں ڈھال دیا جائے۔

"اوتھیلو، ہیملٹ، جیسے کو تیسا " Measure for Measure " اور شکسپیر کی دوسری تصانیف میں موضوعات قومی تاریخ سے ہرگز نہیں چُنے گئے مگر پھر بھی ان سب مصنفوں کے ہاں شان دار عوامی پن کا جوہر قابلیت کے ساتھ بھرا ہوا ہے...."

اور ایک مضمون میں وہ جتا چکا تھا:

ادیب کی یہ صلاحیت کہ وہ کسی قوم[1] (نرود Народ) کے خاص اپنے روپ کو، اچھوتے روپ کو ادبی شکل دے سکے اس قوم کی تاریخی شناختوں کی آب جکٹو (معروضی، جمع پونجی کو ہضم کرکے ریا اس کے نتیجے میں) وہ تاریخی شناختیں کیا ہیں؟ آب و ہوا اندرونی ساخت اور عقیدہ مل کر ہر ایک قوم (نرود) کو ایک نہ ایک چہرہ مہرہ عطا کرتے ہیں۔

اور وہی شاعری میں کم و بیش آئینہ ہوتا ہے۔ خیالات اور جذبات کا ایک انداز، رسم و رواج عقیدوں اور عادات کا گہرا سایہ خاص کسی نہ کسی قوم سے منسوب ہوا کرتا ہے.....

یہ سب تو ہے مگر عوامی پن کی اصل فیصلہ کُن پرکھ اسی ایک بات سے ہوگی کہ ادیب کی نیت "زاویۂ نظر" کیا ہے! آیا اس کے قلم سے قومی کردار کی نمایاں خصوصیات ٹپکتی ہیں یا نہیں ـــــ اگر نہیں تو وہ عوامی ادب نہ ہوا۔

ساری بحث تقریباً اس نتیجے پر پہنچی کہ قومی ادب، جیسے نئے دَور میں اُبھرنا اور اُبھارنا چاہیے، وہ ہے جو محض "عوام کا" نہ ہو، بلکہ "عوام کے لیے" ہو، ان کی سطح پر نہ اُتر آئے، بلکہ قومی خصوصیات اپنے اندر سمو کر عوام کا ذوق بلند کرے، ان کی نگاہ کو وُسعت بخشے[2] اس غرض کی تعمیل کی خاطر "خواص" کو تربیت یافتہ ذوق کے باخبر، ذی علم "شرفا" کو چاہیے کہ رہنمائی کا فرض انجام دیں۔

"ترقی یافتہ ذوق کے یہی باخبر شرفا" دسمبریوں میں پیش پیش تھے، انھوں نے تہذیبی میدان تو مار لیا، سیاسی رسّہ کشی میں ناکام ہو گئے کیوں کہ "ان پڑھ، کم علم عوام" اور فوجی سپاہی نہ اُن کے حوصلوں کی آنچ پا سکے، نہ اس آگ میں کود سکے۔

تہذیبی میدان میں جن کے حالات ذرا سُدھر گئے، رائلٹی، سرکاری سرپرستی، اعزاز و خطاب اور اعلا تنخواہوں سے جن کو ذرا راحت ملی، وہ تن آسان ہو چلے۔ یا تو ان کے نشتروں کی دھار ماری گئی یا ہاتھ

---

[1] "Narod" (نرود) کا لفظ تاریخ، ادب اور ریاست کے ذریعے بہت عام ہو گیا ہے اور اس کو قوم یا عوام لکھتے ہیں۔ مگر اس میں ایک خامی ہے، کہیں اس کے معنی ہیں قوم، کہیں عوام، کہیں لوگ یا لوک۔ اور صحیح لفظ ہوں گے جاتی ـــــ اور جن (جب کسی ترکیب میں آئے) ظ ا

[2] اس ضمن میں ملاحظہ ہو میرؔ کا یہ شعر: شعر میرا ہے گو خواص پسند :- پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

سے نشتر ہی رکھ دیے:

۱۸۲۴ء اور شروع ۱۸۲۵ء کے دوران روسی ادبیات پر ایک نظر، میں بستوژوف نے کہیں یہ لکھ دیا کہ

آسائشوں کی کمی نہ رہی، خدا کا شکر ہے!

اس طنزیہ جملے کے ضمن میں کہا یہ گیا تھا کہ بڑے بڑے اہل قلم، مصیبت کے، بدحالی کے، جبر اور گمنامی کے حالات میں، سارے دکھ جھیل کر لکھتے گئے، آزادانہ قلم چلاتے رہے، راحت ملی، رسوخ بڑھا، دنیا داری کے جھمیلوں میں پڑے تو اب خیریت ہے، قلم کی دھار گئی ——— خدا کا شکر ہے!

پوشکن کو بھی یہ تنقیدی جائزہ چبھا، اس نے بستوژوف کو جون ۱۸۲۵ء میں ایک کٹیلا خط لکھا کہ راحت و آسائش پر کیا طنز کرتے ہو، صرف گنے چنے اہل قلم کو یہ میسر آئی ہے[1]۔ بستوژوف نے اپنے خیال کو ایک تیز جملے میں سمیٹ دیا تھا کہ:

غبار جب ہوا میں اُڑتا ہے تو صرف آندھی بگولہ بن جاتا ہے، مگر جب لوہے پر جم جائے تو دھار زنگ آلود کرتا اور شدت و قوت کھا جاتا ہے۔

پوشکن لکھتا ہے کہ اگر یہ سچ بھی ہو تو اس کو بآواز بلند کہنا مصلحت وقت کے خلاف ہے کیوں کہ اس سے یہ مطلب نکالا جائے گا کہ راحت و آسائش میسر نہ ہو، ادیب کی راہ میں کانٹے بچھے ہوں تبھی غم و غصے کی صدا بلند ہوتی ہے یعنی سوتے بلاؤ کو جگانا ہے کیا؟ (یعنی حکومت کو ہم خود ہی تدبیر بجھاتے دے رہے ہیں سر سہلانے اور بھیجا کھانے کی)

پوشکن کا منشا یہ تھا کہ حکومت ان ہونہار باغی اہل قلم کی اتنی سرپرستی تو ضرور کرے کہ انھیں تحریر و تصنیف کا سر و سامان میسّر آجائے۔ دنیا کے بڑے بڑے اہل قلم کو یہ سہولتیں دی گئیں تو وہ اپنا تصنیفی، تخلیقی کام پورا کر سکے، لیکن اگر سرپرستی سے نیت ہو قلم کا ڈنک نکالنا، تو اس کے بجائے افلاس اور بے آرامی اچھی۔ بیلنیف اور بستوژوف کا کہنا تھا کہ سرکار یا اہل اقتدار کی شفقت اور عنایت کی گھنی چھاؤں میں ذہانت کی بیل منڈھے نہیں چڑھتی، احتجاج کا پودا نہیں اُگتا۔ جاگیر، پنشن، اعزاز، خطاب اور مصاحبت ادیب کو تھپک کر آزادانہ فکر سلب کر لیتے ہیں، اس لیے ان

---

[1] درژاوین اور دمیتریف کو وزارت کا منصب ملا۔ کرامزین کے لیے دو ہزار روبل، ژوکوفسکی کو چار ہزار، گنے دیچ کو تین ہزار، کریلوف کو ۱۵۰۰ روبل سالانہ پنشن مقرر ہوئی تھی۔

سے بے نیاز ہی جینا چاہیے۔

امیر زادہ پوشکن بے نیاز نہیں تھا۔ وہ میخائیلوفسکوئے گاؤں میں شب و روز کاغذ پر آنکھیں ٹپکانے کے باوجود پیٹرسبورگ واپس آنے کو تڑپ رہا تھا۔ پرنس ویازیمسکی اور ژوکوفسکی کو [حاجت برآری کے لیے] خط پر خط لکھ رہا تھا۔ احباب اور ہمدرد اُسے نظر بندی سے چھڑانے کے لیے کوشاں تھے کہ اتنے میں سال ختم ہوتے ہوتے اس نے تری گورسکوئے جاگیر کے ایک کسان خملوف کا بھیس بدلا، اسی کے نام کا شناختی کارڈ[1] لیا اور چار دن کی راہ پر پیٹرسبورگ پہنچنے کے لیے کمربستہ ہوگیا۔ دسویں دسمبر کو وہ میخائیلوفسکوئے کے پھونس بنگلے سے نکلنے والا تھا! اگر چل دیا ہوتا تو ۱۴ رویں دسمبر کو عین واردات کے دن وُہ پوشچن کے مکان پر، یا سینٹ چوک میں گرفتار ہو جاتا۔

مگر روسی ادب کی قسمت میں، دسمبری دانش وروں کے خوابوں کی تعبیر ملنی لکھی تھی۔ پوشکن کو کئی دن بعد خبر ملی کہ پائے تخت میں اس کے کئی ہمنوا، ہمدرد پھانسی پر لٹکا دیے گئے اور باقی موت یا جلا وطنی کی گھڑی دیکھ رہے ہیں۔

---

[1] شناختی کارڈ کو "پاسپورٹ" کہتے ہیں۔ اس کارڈ پر ہر شخص کے فوٹو کے ساتھ اس کا نام ولدیت، سکونت تعلیم اور پیشہ وغیرہ لکھا ہوتا ہے اور ہر ایک باشندے کے پاس اس کی موجودگی لازم ہے۔ پاسپورٹ دکھائے بغیر آج بھی ملازمت ملنا یا ہوٹل میں قیام کرنا ممکن نہیں۔ یہ پرانا ضابطہ ہے اور بار بار کی جنگوں نے اسے اور پختہ کر دیا ہے۔ ظا

چھٹا باب

(۱۸۲۴-۱۸۲۶ء)

بہ دانش غم آموزگارِ منست　　　خزانِ عزیزاں بہارِ منست

(غالب)

۲۴ء کی خزاں سے ۲۶ء کی خزاں تک، پوشکن کو میخائیلوفسکوئے گاؤں کے پھوس بنگلے میں قیام کے دو برس ملے۔ دو برس یعنی خزاں کے تقریباً تین موسم۔

روس کے ان علاقوں میں خزاں سنہری ہوتی ہے، فرش پر حدِ نظر تک پیلے پتوں کا مخملی فرش ہواؤں میں خُنکی ـــــ دھوپ نکلنے پر موسم خوش گوار، فضا دُھلی ہوئی، مہکی ہوئی۔ دھوپ نہ ہو تو بارش، فصل کٹ چکی کسان فرصت سے ہیں۔ خزاں باہر گھومنے کا نہیں اندر بیٹھنے کا موسم ہے۔ اور یہی موسم ہے جس میں ہمارے شاعر پر وجد کا عالم طاری ہوتا تھا۔ جب وہ دنیا و مافیہا سے، خود اپنی الجھنوں سے بے خبر، بکھرے ہوئے، اٹکے ہوئے، اُبلتے ہوئے خیالات اور جذبات کو بے تحاشہ سپردِ قلم کرتا چلا جاتا تھا ـــــ ذہن سے کاغذ تک کا سفر ان دنوں بہت ہی مختصر اور بے تکلف رہتا اور جو کچھ لکھا جاتا، کسی اور وقت نظرِ ثانی کے لیے اُٹھا رکھتا۔

وہ وقت ہے کہ پوشکن سرکاری ملازمت سے نکالا جا چکا، ماں باپ نے مُنہ پھیر لیا۔ آنے کے تین دن بعد (۱۱ر اگست ۲۴ء) کو ضلع کے صدر مقام پر، سرکاری دفتر میں "اچھے چال چلن" کے شرطنامے پر دستخط کرنے پڑے۔ اُجاڑ بستی کے اس دو سو برس پُرانے نیم شکستہ بنگلے میں بھی چار نظریں اس پر پہرہ دے رہی ہیں، پولیس والے کی اور پادری کی، دوستوں، عزیزوں اور قدر دانوں سے دور، اور اپنے مستقبل کی روشنی سے بے بہرہ۔

بلبل ہے آشیانے سے دُور اور شکستہ پر

میخائیلوفسکوئے میں چند روز سفر کی تکان اُتارتے ہی پہلا تاثر یہ ہے:

. . . . . کیا بُری جگہ ہے یہ ــــ دَم گھٹا جاتا ہے، اُداسی میرے سینے پر سوار ہوئی جا رہی ہے . . . . . دم گھٹے جانے کا احساس بار بار راجدھانی میں بااثر سورخ دوستوں کو خط لکھوا رہا ہے اور یہاں سے رہائی کے لیے سفارشیں کرا رہا ہے، لیکن ابھی دو برس نہیں ہوئے، پوشکن نے اسی "اُجڑ، بے رونق گاؤں" میں جب اپنے فکر و فن کی ہری بھری فصل دیکھی تو لکھا:

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ روحانی صلاحیتیں کمال پختگی کو پہنچ گئی ہیں ــــ اب میں ادب تخلیق کر سکتا ہوں . . . . . (ک نمبر ۲۲ ص ۲۵۹)

اُداسی، بیزاری اور گھٹن سے لے کر ذہنی راحت اور احساس کمال تک کا طویل فاصلہ جن دو برسوں کی مختصر مدت میں طے ہو گیا، انھی میں ہمیں پوشکن سے بے تکلفانہ مل لینا چاہیے۔ یہی وقت ہے اس کے روز و شب، خلوت و جلوت اور قرار و بے قراری کے عالم تک رسائی حاصل کرنے کا۔ سبب؟ تو سبب اس کے کلام میں پس منظر کی طرح چھپا ہوا ہے۔ گہرا سماجی شعور رکھنے والے ایک بڑے فن کار کی شخصیت المناک آزمائشوں کی کٹھالی میں تپ کر، گل کر، کندن ہو رہی ہے۔

سیاہ فام پرنانا کے وقتوں میں یہ بنگلہ نہ معلوم کیسا رہا ہوگا، اب چوطرفہ جنگلی گھاس اُگی ہے، دور تک گنجان پارک ہے، پارک سے گاؤں اور اس کی کچی سڑک نظر آتی ہے۔ کچی اینٹ اور لکڑی کی دیواریں، کھپریل، جن پر بعض جگہ کائی جم گئی ہے۔ ذرا دور پر تین ٹیلے اُبھرے ہوئے ہیں، کیئف کو ماسکو سے ملانے والے اس مقام پر کئی خونریز جنگیں ہو چکی ہیں، وطن کے بے نام فدائیوں کے مزار ہیں ــــ کچھ فاصلے پر "سروت" نام کی ندی بہتی ہے جو خود، نووارد شاعر کی طرح، خزاں کی بارشوں میں طوفانی دریا بن جاتی ہے اور آگے چل کر "ولیکا" دریا میں جا ملتی ہے[1]۔

اندر باورچی خانے کے علاوہ دو کمرے ہیں، دونوں ٹھنڈے۔ آتش دان تو بنا ہوا ہے، چمنی اور ایندھن کا انتظام نہیں۔ باورچی خانے کے برابر والے کمرے میں بڑی بی، ان کا پھٹا پرانا بستر اور چرخہ، دوسرے میں آدھے لکھے کاغذ فرش پر بکھرے ہوئے، کاسٹھ کا ہچکولے کھاتا پلنگ ہے اور بھاری میز، جو کبھی پورے خاندان کے لیے تاش یا گوٹ کھیلنے، گپ لڑانے اور چائے پینے کے کام آئی ہوگی۔

---

[1] ک نمبر ۲۹۔ باب اول و دوم

اب اس پر قرینے سے کورے کاغذ چُنے ہوئے ہیں۔ بھدّی سی دوات رکھی ہے۔ یہ اصل میں چٹنی اچار کی کلھیا تھی، دھو دُھلا کر صاف کی گئی اور اب اس سے روسی ادب کو بہترین چاشنی ملنے والی ہے۔ دیوار سے لگی لگی کتابوں کی بوسیدہ الماریاں ہیں، جنھیں شاعر نے جھاڑپونچھ کر نئی جلدوں سے آراستہ کیا ہے۔ میز کے پہلو میں صاف ستھرا مگر دقیانوسی لیمپ رکھا ہے جس نے ماحول کی خاموشی اور سنجیدگی میں قندیلِ رُہبانی[1] کا اضافہ کر دیا ہے۔

شاعر صبح سویرے بیدار ہوتا ہے۔ ٹھنڈے پانی میں غسل کرتا ہے، جاڑے کے دن ہوں تو باہر جاکر برف کُرید کر نیچے کے پانی میں ڈبکی لگاتا ہے اور پھر بستر میں۔ کبھی تکیے کے سہارے، کبھی سیدھے بیٹھ کر مطالعہ میں مصروف، یہیں جیسے تیسے ناشتہ کر لیا۔ دن ڈھلے تک ورق سیاہ کیے، نوٹ لکھے، یادداشتیں درج کیں۔ پُرانے مسوّدوں کو صاف کیا، تیسرے پہر سے کچھ پہلے کھانا کھالیا۔ کھاتے سے نمٹ کر گھوڑا منگایا، ریشمی کرتا پہنا اور اوپر سے رنگین ڈوری کسی، سر پر تنکوں کا چوڑا ہیٹ رکھا، ہاتھ میں لوہے کا ڈنڈا لیا اور سوار ہو کر نکل گیا۔ کبھی پارک میں کبھی میلے ٹھیلے میں، کبھی گرجا گھر کے عرس میں، کبھی یونہی بے سمت، اور ہفتے میں ایک دو بار پڑوس کی ایک جاگیرتری گورسکوئے (Тригорское) کی طرف، جہاں شرفا کا ایک قصباتی خاندان اس کی آمد کا منتظر رہتا ہے۔ دن چھپنے کے بعد واپسی۔ کچھ کھاپی کر پھر اپنی میز کے سامنے۔ اگر جی نہیں لگ رہا ہے تو بڑی بی سے قصہ کہانی کی فرمایش کر دی کہ آخر بچپن میں کہانیاں سنا سنا کر سُلاتی تھیں، پھر وہی سناؤ۔ بھولی بھالی "ارلشیا" اپنے پُرانے طرز میں کہانی کے تار پرونے لگتی ہے:

اب سے دور ایک تھا راجہ دادون، اس کے تھے دو لڑکے۔ جب وہ جوان ہو گئے جیسے تم ہو ــــــ تو ..... روس کا بالغ نظر شاعر لڑکوں بالوں کی طرح بایاں گال ہتھیلی پر رکھے، غور سے کہانی سُن رہا ہے۔

"..... وہ جو میری نالائق تربیت ہوئی تھی، اب اس کی کسر پوری کر رہا ہوں، رات کو کہانیاں سنتا ہوں، واہ، کیا کمال کے قصے ہیں! ان میں سے ہر ایک مکمل نظم ہے۔"

(دک نمبر ۲۶)

ایسی ہی کسی رات میں طویل المیہ نظم "مصری راتیں" لکھی گئی۔ ایسی ہی کسی سرد برفیلی شام کو

---

[1] بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رُہبانی۔ (اقبال)

جنوب سے ایک خط آیا جس میں ایک پُرانے دوست اور فوجی افسر والکونسکی نے خبر دی تھی کہ ماریا رائیفسکی سے میری منگنی ہوگئی ہے ـــــــ "اور آپ تو میری ہونے والی بیوی سے واقف ہیں آپ سے اپنی خوش نصیبی کیا بیان کروں" یہ بھی وہ ماریا نکولائیونا تھی، جسے یادداشتوں، نظموں اور خطوں میں "N" کے اشارے نے لازوال کر دیا ہے پوشکن پر اِس خبر سے کیا گزری ہوگی، کچھ اندازہ ہوتا ہے اس مختصر نظم سے، جس کا عنوان ہے: "جاڑوں کی ایک شام"
اسی غمگسار مادرِ مہربان سے خطاب کر کے شاعر نے اپنی بے کسی اور بے بسی پر ایک آنسو ٹپکایا ہے:

وہ برفیلی آندھی چلی زور کی
دھواں دھار ہے سب فضا آر پار
درندے سی گرجے، دہاڑے کبھی
کبھی جیسے رونے لگے شیر خوار
کبھی چھت پہ ایسی دھما چوکڑی
کہ چھپّر کا اڑ جائے ایک ایک تار
کبھی جیسے اٹکا ہوا یاتری
دریچے پہ دے دستکیں بار بار
ہماری یہ کُٹیا غریبا مئو
اُجالے سے محروم، افسردہ دل؛
تجھے کیا ہوا اے بڑی بی کہ تو
ہوئی ایسی بے سُدھ، گئے ہونٹ سِل ؟
نہ جانے یہ طوفان کی ہاؤ ہُو
تجھے کر گئی اس قدر مضمحل ؟
نہ جانے یہ چرخے کی رُوں رُوں رُتو
سُلاتی ہے یا نیند میں ہے مُخل ؟
اُٹھا جام، پی ساتھ اے مہربان
دُکھی نوجوانی کی ساتھی ہے تو

اسی جام میں گھول لیں تلخیاں
کہ ٹھنڈا ہو دل، گرم ہو کچھ لہو
سُنا دے اسی ننھی چڑیا کا گیت
سمندر پرے دن گئے جس کے بیت
وہی گیت گا دے کہ لڑکی نئی
سویرے جو پنیا بھرن کو گئی۔

وہ برفیلی آندھی چلی زور کی
دھواں دھار ہے سب فضا آر پار
درندے سی گرجے، دھاڑے کبھی
کبھی جیسے رونے لگے شیر خوار
اُٹھا جام، پی ساتھ اے مہرباں
دُکھی نوجوانی کی ساتھی ہے تو
اسی جام میں گھول لیں تلخیاں
کہ ٹھنڈا ہو دل، گرم ہو کچھ لہو

"پاس پڑوس میں کوئی خاص آبادی نہیں۔ صرف ایک خاندان سے راہ و رسم ہے، سو وہاں بھی بہت کم جانا ہوتا ہے؛ دن دن بھر گھوڑے کی سواری کرتا ہوں۔ شام کو اپنی بڑی بی سے قصّے کہانی سنتا ہوں [ان کی کہانیوں میں] اچھوتی تاتیا نا ملتی ہیں؛ بس یہی عورت ایک میری مونس و ہمدم ہے اور اس کے ساتھ اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ ۔ ۔ ۔"

ماحول کی بے رونقی سے اکتاہٹ کا توڑ یوں بھی نکال لیا تھا کہ "پڑوس میں تری گورسکوئے جاگیر والوں سے پوشکن کی دور کی رشتہ داری تھی۔ بچپن میں بھی وہ ایک دو بار ان کے ساتھ یہاں آچکا تھا۔ اب جو آیا تو دیکھا کہ ۴۰ برس کی ایک خوش باش اور خوش ذوق خاتون مادام اسی پووا (Осипова) ہیں، ان کی دو نوجوان بیٹیاں ہیں، بھتیجیاں، بھانجیاں ہیں، سوتیلی بیٹی ہے اور لڑکا، جو سرحدی مقام "دورپٹ" (Dorpet) کی جرمن یونیورسٹی

میں تعلیم پاتا ہے، کبھی کبھی چھٹیوں میں گھر آجاتا ہے۔ پوشکن کا سب سے پہلے اسی نوجوان سے دل ملا اور اسی کے اصرار پر وہ تری گورسکوئے والے خاندان میں آنے جانے لگا۔ شاعر خصلت بڑی، جو کنبے میں سب سے لیے دیے رہتی تھی، پوشکن پر مرمٹی اور پوشکن چھوٹی پر، دونوں حالتوں میں فریق ثانی ناکام رہا ـــــ البتہ اسی مخملی بساط پر، سات برس پہلے کی ایک اور تشنۂ الفت حسینہ مادام کیرن (Kepn) اُتر آئی جو مادام اسی پووا کے ہاں اتفاق سے مہمان آئی ہوئی تھی۔ پتیرسبورگ میں اس خاتون کے حُسن کے چرچے ہو رہے تھے سات برس پہلے کسی فیشن ایبل محفل میں اس آوارہ منش "حملہ آور" سے روشناس ہو چکی تھی اور حافظے میں تب کا ایک ہلکا سا نشان رہ گیا تھا۔ بعد میں کسی عمر رسیدہ دولت مند جنرل سے اس کی شادی ہو گئی اور یہ شادی گویا سوسائٹی سے دادِ حسن لینے اور شدت جذبات کا مُنہ مانگا انعام پانے کے لیے ایک لائسنس بن گئی۔ پوشکن نے تیور بھانپ لیے اور دو تین ملاقاتوں کے بعد ہی اظہارِ تمنا کر دیا، وہ بھی ایک ایسی نظم کی زبان میں، جو نرم نگاہی، سوز، اور دھیمے بہاؤ کی ملی جلی غنائی کیفیت کی بدولت پوشکن کے بہترین نغموں میں شمار ہوتی ہے :

وہ لمحہ مجھے یاد ہے بے مثال
جب آنکھوں پہ اُترا تھا تیرا جمال
فریبِ نظر تھا کہ حسنِ پری
گزرتی ہوئی اک جھلک دیکھ لی
سُلگتی ہوئی شامِ تنہائی میں
بھری بزم میں، جلوہ آرائی میں
سُنی ہے وہ کومل صدا دیر تک
کبھی خواب میں دیکھ لی ہے جھلک
گئی عمر : . . . . اور ساتھ لیتی گئی
اُمنگوں کی شورش، مرادوں کے دن
کٹی رات، پھیکی پڑی چاندنی
وہ کومل صدا، اس کی یادوں کے دن

کہیں کالے کوسوں پہ اپنوں سے دُور
کٹے ایسے کتنے برس بیش و کم
نہ ذوقِ سخن اور نہ ایماں کا نور
نہ جینے کی لذّت، نہ الفت کا غم
مگر روح جاگی ہے مدّت کے بعد
مجھے پھر میسّر ہے تیرا جمال
اُسی حسن سے آج آنکھیں ہیں شاد
فریبِ نظر ہے کہ حسنِ خیال
دھڑکتا ہے دل، جسم کو ہے سرور
ملی دوسری زندگی تازہ دم
سخن کی تب و تاب، ایماں کا نور
مزا زندگی کا، محبت کا غم

یہ شاعر نواز خاتون پوشکن کی موت کے ۲۴ برس بعد تک زندہ رہیں اور انھوں نے اپنے نام پوشکن کے خطوط اور معاملات ایک ہوش ربا دعوے اور دیباچے کے ساتھ شائع کر دیے۔ اسی یادداشت میں وہ شاعر کی تصویر یوں کھینچتی ہیں :

. . . . اپنے برتاؤ میں بڑا ہی بے ڈھب آدمی تھا گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ، ابھی قہقہے مار رہا تھا، ابھی مُنہ لٹکائے بیٹھا ہے، کبھی بالکل دبّو، کبھی دھاندلی اور زبردستی پر آمادہ، کبھی بے انتہا ریجھا ہوا اور بعض وقت بے لطف اور اینٹھا ہوا، کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ نہ جانے دم بھر میں کیا موڈ ہو جائے . . . . اپنے جذبات پردے میں رکھنا نہیں آتا تھا اُسے۔ جب دیکھو دل کی بات زبان پر۔ اگر کوئی خوش گوار واقعہ ہو گیا ہے تو ناقابل بیان بھلامانس۔ ایک بار تری گورسکوئے میں . . . . . کتاب بغل میں دبائے آیا۔ ہم سب اس کے گرد سمٹ آئے۔ اور اس نے ہمیں اپنی نظم بنجارے ("سگانی") سنانی شروع کر دی۔ ایک تو نظم کی روانی اور پھر اس کی خوش الحانی، پڑھنے کے انداز میں اس قدر ترنم بھرا تھا کہ مجھے تو نشہ ہو گیا، وہی بات جو اس نظم میں (جلاوطن اطالوی شاعر) کے بارے

میں کہی، وہ خود اسی پر صادق آتی تھی:

اپنے گیتوں سے جادو جگاتا تھا وہ

اور گلے میں کچھ ایسی کرامات تھی

جیسے چشمے اُبلتے ہوں

جھرنے اُچھلتے ہوں

جس وقت گانے پر آتا تھا وہ۔

مگر اس طویل ڈرامائی نظم میں، جو پوشکن نے انھی دنوں صیقل کر کے اشاعت کے لیے تیار کی تھی، نوجوان اور بے باک بنجارن کا وہ گیت بھی شامل ہے، جو پوشکن نے خود بنجاروں کی زبانی سنکر اسی لَے، اسی بے باکی کے ساتھ روسی سانچے میں ڈھالا تھا:

میرے بوڑھے خصم

چاہے خنجر چلا

چاہے زندہ جلا

چاہے کر دے بھسم۔

مادام کیرن لکھتی ہیں کہ نظم سنانے سے پہلے اس نے مجھ سے کہا کہ خاص آپ کے لیے لایا ہوں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ وہ یہ شاہکار نظم شاعرانہ ترہیب کے طور پر لایا تھا یا شاطرانہ ترغیب کی خاطر۔ نتیجہ بہر حال پوشکن کے حسب منشا نکلا۔ کم از کم تین نظموں میں ہمیں اس "پری جمال" اور "اپسرا خصال" حسن کی جھلک ملتی ہے ——— لیکن پرائیویٹ خطوں اور تذکروں سے جو تصویر مادام کیرن کی اُبھرتی ہے، وہ کچھ اور کہتی ہے۔

خون میں ہے تپش تمنا کی

رُوح تیرے ستم کی ہے شاکی

پیار کر لے کہ تیرے پیار لذیذ

مجھ کو عود و شراب سے بھی عزیز

میری آغوش میں جھکا لے سر

سو رہوں میں سکون سے دم بھر

اس سے پہلے کہ دن نکل آئے
اور سرک جائیں رات کے سائے

پڑوسی ترو سکورسکوئے کی آمد و رفت رائگاں نہیں گئی۔ اس شریف شائستہ اور مطمئن خاندان کے ماحول سے اس نے کردار بھی چنے، خد و خال بھی، چال ڈھال اور ماحول بھی ـــــ ورنہ "ایوگے نی آنے گن" میں بیان کی صداقت صرف تخیل سے کہاں جنم لیتی!

اور بھی موقعے ملے ہوں گے، لیکن روسی قصبات میں پڑے ہوئے اپنے حسب و نسب اور روسی کلچر کے ننگ و ناموس کی خدمت یا حفاظت کرنے والے شرفا کی زندگی اور ان کی بہو بیٹیوں کی نفسیات کے گہرے مشاہدے کا پورا موقع پوشکن کو یہیں ملا۔ ایک مقام پر وہ لکھتا ہے:

> میرے پڑھنے والوں میں سے جو لوگ کبھی دیہات میں نہیں رہے، ہرگز تصور نہیں کر سکتے کہ قصبات کی شریف زادیاں (Уездные Барышни) ہونا کیا عمدہ بات ہے! صاف ستھری ہوائیں، اپنے باغیچوں کے سیبوں تلے پل کر بڑی ہونے والی یہ لڑکیاں سوسائٹی اور زندگی کا گیان کتابوں کے ذریعہ حاصل کرتی ہیں۔ خلوت کی یکسوئی آزادی اور کتابوں کی ورق گردانی ان میں قبل از وقت وہ جذباتی تلاطم پیدا کرتی ہیں جس کی ہوا تک ہماری مدہوش حسیناؤں کو نہیں لگتی! گھوڑا گاڑی کی گھنٹیاں بجیں تو لہو کی گردش تیز ہو گئی، پاس کے شہر میں ہوا خوری کر لی تو زندگی بھر کے لیے ایک واقعہ ہو گیا۔ کوئی مہمان آ گیا تو ایک زمانے تک بلکہ بعض اوقات عمر بھر اس کی یاد رہ گئی۔ . . . . ان میں کردار کی کوئی خصوصیت کوئی انفرادیت ضرور ہوتی ہے۔ جس کے بغیر، بقول ژاں پال کے، انسانی عظمت کوئی معنی نہیں رکھتی . . . . . (ک ۲۳، ص ۱۶۱)

تری گورسکوئے والوں کی بڑی لڑکی آننا، اس کی بے رخی اور روکھے پن کی شکایت لیے ہوئے قصبے سے باہر چلی گئی۔ اور چھوٹی جسے گھر میں سب پیار سے زیزی (Zizi) کہتے تھے، بعد میں مسٹر وولف کی نامور بیوی کہلائی، اگر وہ پوری طرح پوشکن کے کلام کی شہرۂ آفاق ہیروئن تاتیانا نہیں تو کم از کم اس کا ایک رخ ضرور ہے۔ دوسری قصباتی دوشیزاؤں کا لہو پسینہ بھی اس کرداری رنگ آمیزش میں صرف ہوا ہے۔ مگر ایک بھولی بھالی کسان لڑکی کا ذکر کیے بغیر یہ ذکر نا تمام رہے گا۔ بڑی بی "ارلشیا" سے سینا پرونا سیکھنے کے لیے آس پاس کی دیہاتی الھڑ کنواریاں آجایا کرتی

تھیں ان میں سے "اولگا" نام کی ایک لڑکی کافی دنوں پوشکن کی منظورِ نظر رہی۔ ربط ضبط یہاں تک بڑھا کہ ہمسایوں کو شک ہونے لگا۔ کسی کمیرے کسان کی بیٹی کا یوں نوجوان جاگیردار سے وابستہ ہوجانا کوئی انوکھی بات نہ تھی ———— (خود پوشکن اپنی ۱۹۱۹ء کی ایک نظم میں اس کا رونا رو چکا تھا) تاہم جب اس میں پوشکن کے بچّے کی ماں بننے کے آثار ظاہر ہوئے تو شاعر، نہ جانے بدنامی کے ڈر سے، یا مستقل وابستگی کے اندیشے سے، احتیاطی تدبیریں کرنے لگا۔ وہ اس کی سادگی اور سپردگی کا دلدادہ ضرور تھا مگر واقعے کو کھلے عام اپنانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک خط اسی اولگا کلاشنی کووا (Ольга Клашникова) کا اور ایک پوشکن کا رقعہ اپنے عزیز دوست پرنس ویازیمسکی کے نام اس حادثے کے درپردہ گواہ باقی بچے ہیں :

> پیارے ویازیمسکی، تم اپنا منہ بند رکھو، میں اپنا۔ ہم دونوں اپنے اپنے منہ پر تالا ڈال لیں، کسی دن سوفتے میں اس پر بات ہوگی۔ فی الحال ایک معاملہ آن پڑا ہے۔ میرا یہ خط تم تک ایک نہایت دل کش اور نیک دل لڑکی کے ہاتھوں پہنچے گا؛ اس لڑکی کو تمھارے ایک عزیز دوست نے اپنی حماقت سے حاملہ کردیا۔ اب صرف تمھاری شرافت، مروت اور دوستی کا آسرا ہے۔ ماسکو میں کہیں اس کے سرچھپانے کا انتظام کردو، جتنی رقم کی ضرورت ہو اسے دے دو۔ بعد میں اسے بولدینو (میرے آبائی گاؤں پر، جہاں مُرغے، مرغیاں اور بھالو بھی ہیں) بھیج دینا . . . . . اور سنو، پدرانہ شفقت کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ بال بچّہ ہولے، بیٹا ہو تو اس کی دیکھ بھال کرنا۔ میں اسے دلاوارثی یتیم خانے کے سپرد نہیں کرنا چاہتا . . . . . دوست سچ کہوں، مجھے شرم آرہی ہے، یقین کرنا کہ شرمندہ ہوں، مگر میری شرمندگی کا اب کیا حاصل ! . . . . .

پوشکن نے اور کہیں اس واقعے کا ذکر نہیں کیا[1] البتہ کسانوں کے "حسنِ سادہ" اور "دل سادہ" کی داد دیتے وقت وہ ایک افسانوی کردار "ایدا" کا نام ضرور لیتا ہے[2]۔

---

[1] پوشکن کے عقیدت مند سوانح نگار، جنھیں بال کی کھال نکالنے میں مہارت حاصل ہے، اس حادثے کے ذکر سے دامن بچا گئے ہیں۔

[2] بہتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں — گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

(اچھا یہی ہے کہ اپنے محبوبوں کا ذکر دوسروں کا قصہ بناکر کہا جائے)

عجب نہیں کہ "رُسالکا" (جل پری) نام کا منظوم ڈرامہ اس سچوایشن پر پہنچ کر اسی لیے اٹک گیا ہو۔ ظ ا۔

یمخائیلوفسکوئے کی ایک رنگی سے ذرا فاصلے پر اور بھی رنگینیاں تھیں۔ عین انھی دنوں، جب پوشکن اپنے بھائی ''لیو'' (Leo) کو، دوستوں کو، ملاقاتیوں کو خط لکھ لکھ کر معاشیات، سیاسیات، تاریخ، فلسفے اور غیر ملکی ادبی تراجم پر کتابوں کے پارسل منگاتا اور ان سے بقول خود ''اپنے ذہنی خلا'' بھرتا جا رہا تھا، گاؤں کے میلے اور عُرس بھی تھے، ہاٹ بازار تھے۔ دیہاتی بولی، گاڑھے مذاق، جَن گان، محاورے اور کہاوتیں تھیں جن سے وہ جھولیاں بھرا کرتا تھا۔ سوتیا گورسک خانقاہ کے میلوں میں اسے بہت لوگوں نے مڑمڑ کر دیکھا کیوں کہ اس حُلیے کا آدمی امیرزادوں میں نظر نہیں آتا۔

ایک بیوپاری ''اپوچکا'' نے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھا ہے:

> حسنِ اتفاق سے مسٹر الیکساندر سرگے ئی وچ پوشکن کے دیدار ہوئے۔ ان کی سج دھج دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ تنکوں کا چوڑا ہیٹ، قرمزی کُرتی، اس پر نیلی ڈوری، لوہے کی چھڑی ہاتھ میں اور سیاہ قلمیں اتنی لمبی کہ ان پر داڑھی کا گمان ہو۔ ناخن بھی بڑھا رکھے تھے۔ موسمبیاں چھیلنے کا کام ناخن سے لیا اور آدھی درجن موسمبیاں بڑے شوق سے چھیل کر کھڑے کھڑے کھا گئے ..... (دک نمبر ۲۹، ص ۸۴)

پوشکن کے لمبے ناخنوں پر بہت لوگوں کی نظر پڑی ہے۔ ایک ناخن پر اس نے سنہرا خول بھی چڑھا رکھا تھا۔ ایک شخص والتیمن نے طنز کیا ہے:

> عجب حُلیے کا آدمی ہے۔ ناخن چینی علما کے ناخنوں سے بھی زیادہ بڑھا رکھے تھے۔ دوسرے ملاقاتی کا کہنا ہے کہ ملاقاتیوں سے بات کرتے وقت وہ اپنے ناخن جلدی جلدی رگڑتا، گھستا رہتا تھا۔ ناخن کیا تھے، اچھے خاصے پنجے تھے۔ (دک نمبر ۷، ص ۱۲۴)

گرمیاں شروع ہوتے ہوتے جا بجا دیہاتی میلے لگتے۔ وہ ان میلوں میں ضرور نظر آتا۔ خانقاہ کے میلے میں بڑی رونق رہتی، دو رویہ خوانچے اور کھوکھے، میدان میں کھیل تماشے، پہلوانی، جادوگری، ہاتھ کی صفائی، قلابازی کے میلے، لکڑی کے نقشین کام، مٹی کے برتن، کڑھے ہوئے رومال، تولیے، مٹی اور کاٹھ کے کھلونے، ہاتھ کرگھے کے کپڑے، تکیہ غلاف، چادریں، مشہور مستری خانے کے ڈھلے ہوئے کھیتی باڑی کے اوزار۔ گاؤں کی لڑکیاں ان موقعوں پر بَن سنور کر آتیں، چاندی کے سکوں کی مالائیں، کھنکاتیں، چھم چھم کرتی گزرتیں، بعضوں کی تو منگنی یہیں طے ہو جاتی —— اس شرط پر کہ مالک اس کی منظوری دے دیں[1]۔

---

[1] کسان رعایا میں شادی کی پہلی رات کا حق، یا منظوری کا اختیار جاگیردار کو حاصل ہوتا تھا، وہ چاہتا تو دولھا کو یہ حق سونپ دیتا۔

یہاں روسی گانے سنتا ہوں۔ ان گانوں میں عام طور سے ایک ہی رونا ہے، گاؤں کی گوری شکایت کر رہی ہے کہ اسے زبردستی بیاہ دیا۔ جوان دولہا کچوکے دے رہا ہے کہ کیا ٹھنڈی مٹی کی جورو ملی۔ ہمارے شادی بیاہ کے گیت ایسے سوگوار ہیں جیسے کسی کے مرنے پر بین کیے جا رہے ہوں.....

"نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی ہی سہی"، پوشکن ان بے ہنگم تماشوں میں، روسی جنتا کی روزمرہ زندگی کے اس مظاہرے میں خود بھی شریک رہتا۔ خانقاہ کے عرس میں ایک طرف بھجن گائے جاتے، کہیں وعظ ہوتا، روز قیامت سے ڈرایا جاتا، خدا کے نیک بندوں کے قصے (قصص الانبیا) پڑھ کر سنائے جاتے۔ مرد و زن آنکھوں میں آنسو اور دل میں عقیدت لیے سنا کرتے تھے۔

پوشکن کو بھجن منڈلی سے چپک کر بیٹھنا پسند تھا۔ ان کے الفاظ، تراکیب غور سے سنتا۔ خاص طرز کے قصے چن کر اپنی یادداشت میں رکھ لیتا ——— یہیں میخائیلوفسکوئے کے دیہات میں اس نے وہ گانے سُن سُن کر درج کیے جو نووو گرد اور پسکوئے ضلعوں میں استیپان رازین کے بیٹے پر گائے جاتے تھے۔ (ک نمبر ۲۲ ص ۲۵۴)

بورس گودونوف، استیپان رازین، ایمیلیان پگاچیوف ——— یہ روسی تاریخ کی افسانوی اور عوامی افسانے کی تاریخی شخصیتیں تھیں۔ پوشکن کو تاریخ کھنگالنے کی لگن تو پہلے سے تھی، یہاں پہنچ کر اس نے تیاری بھی شروع کر دی ——— اس تیاری میں اپنے پرنانا اور پیوتر اعظم کے رشتے کو بھی تاریخی افسانویت کا رنگ دیا۔ یہیں ان تاریخی تحریروں کی اول بنیاد پڑی جن میں المناک انجام تک پہنچتے پہنچتے روسی نوجوانوں کا لہو آنچ دینے لگتا ہے۔

اپنے بنگلے میں وہ تنہائی اور سکون کا پابند اور یہاں ہنگاموں کا، شور غل کا، خود کو ہجوم عام میں گم کر دینے کا دلدادہ تھا۔ اُجڈ دیہاتیوں کو اس سے غیریت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ بہتوں نے اس کے تعلق سے اپنی یادیں بیان کی ہیں؛ موت کے ساٹھ ستر سال بعد تک لگاتار یہ بیانات چھپتے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک نے نہایت اختصار کے باوجود تصویر کھینچ دی ہے:

"اوسط قد اور گٹھے ہوئے بدن کا آدمی تھا۔ بال گھنے گھونگھریالے، آنکھیں نیلی اور ان میں بلا کی کشش۔ کسی ایک تصویر میں بھی اس کے چہرے کی روحانی جاذبیت کا عشر عشیر ابھر کر نہیں آتا۔ خاص کر اس کی حیرت انگیز آنکھوں کا تو کوئی عکس اُترا ہی نہیں۔ جلدی جلدی بولا کرتا تھا، بڑی بے چین بوٹی، خوش مزاج، زور سے ایسے قہقہے مارتا کہ اوروں کو بھی ہنسی

چھوٹ جائے ـــــــ ہنستے میں ہموار بتیسی صاف نظر آجاتی تھی۔ بالکل ایک جیسے موتیوں کی طرح جڑے ہوئے چمکیلے دانت تھے۔ ہاتھ کی انگلیوں پر، البتہ ناخن بہت بڑھا رکھے تھے.....؛

(دک نمبر ۲۱، ص ۱۰۴)

دُور دُور سے کتابوں کے جو پارسل اور کلاسیکی ادبیات کے فرانسیسی ترجمے منگائے جا رہے تھے، اُنھی میں غالباً کہیں کالی داس کی "شکنتلا" کا فرنچ ترجمہ بھی ہوگا جو ۱۸۰۳ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ شکنتلا کی یہ جلد آج تک اس کے متروکہ ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے ـــــ اور انھی دنوں کی ہے۔
اب تک یہ خیال تھا کہ پوشکن نے ۲۹۔ ۱۹۲۸ء میں اپنے ناتمام منظوم ڈرامے "جل پری" (Русалка) کا مسودہ تیار کیا، لیکن "شکنتلا" اور "جل پری" کے خیال، اُٹھان اور معاملہ بندی میں مکمل مشابہت کا سراغ لگنے سے پہلے ہمیں صرف اتنی آگاہی تھی:

(دک ۴۲، مضمون D.Belkin)

"...ظاہر بات ہے کہ انھی دنوں [یعنی میخائیلوفسکوئے کے دورانِ قیام] شاعر کے دل و دماغ میں اس موضوع نے جگہ بنالی تھی بلکہ اس ڈرامے کا نقشِ اول بھی اُبھر آیا تھا جو چند سال بعد ۳۱۔ ۱۸۲۹ء کے دوران "جل پری" کے نام سے لکھ کر تکمیل کو پہنچا۔"

(دک نمبر ۱۱، جلد دوم، ص ۱۰۴)

گویا ہزار دشواریوں اور ناکہ بندیوں میں رہ کر بھی شاعر کی دانش اندوزی نے سنسکرت ڈرامے تک رسائی حاصل کرلی اور اس کے مطالعے سے سنسکرت ڈرامے کی معلومات حاصل کرنے کا شوق اتنا بڑھا کہ بعد میں ـــــ "ہندستانی تھیٹر کے شاہکار" کی دونوں جلدیں بھی منگا کر پڑھ ڈالیں۔

(دک نمبر ۴۲......)

دورپٹ جرمن یونیورسٹی کے نوجوانوں سے راہ و رسم ہونے کے بعد، فلسفے اور شاعری کے رسیا وولف اور ریزی کوف سے ملاقاتوں کے بعد نوجوانوں کی اس تحریک سے بھی تعلق ہوا جو شاعر کو، جابرانہ نظام کے مقابلے میں پیغمبرانہ فریضے کی نمائندہ سمجھتی تھی۔ ۱۹ویں صدی کے آغاز میں اسی تحریک کے علم برداروں نے مشرق کے صوفی شعرا خصوصاً حافظ و سعدی کو خاص طور سے توجہ کا مرکز بنایا تھا۔
پوشکن نے اس تحریک کی حرارت میں اپنے افسردہ و تاریک ماحول کے لیے روشنی کی جھلک دیکھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ روز روز اس کا ایک مقامی پادری سے ملنے کے لیے جانا، انجیل کی زبان

لیں قصّے سننا، عوامی کہانیوں اور مذہبی قصوں سے ان کی تہذیبی روح اخذ کرنا کبھی بے سبب یا اتفاقی نہیں تھا۔ جنوب کے سفر میں تاتاریوں[1] اور قفقازی مسلمانوں سے تعلقات اور فارسی شاعری کے علاوہ قرآن کے مطالعے نے ادھر بھی متوجہ کیا ہوگا، چنانچہ میخائیلوفسکوئے کے انھی دنوں میں اس نے کئی نظمیں ایسی لکھی ہیں جن کا پہلے کہیں سان گمان نہیں تھا۔

ایک "قرآن کی نقل میں" (Подражание корану)

اور دوسری "پیغمبر" (Пророк) پوشکن کی معرکے کی نظم شمار ہوتی ہے
اس نظم میں انجیل اور قرآن کی تلمیحات یکجا ہوگئی ہیں :

تشنگی روح کی ہلکان کیے دیتی تھی
خاک میں چھانتا تھا بیابانوں کی
دیکھتا کیا ہوں: دوراہے پہ نمودار ہوا
چھ پروں والا فرشتہ ملک اسرافیل
انگلیاں خواب کے مانند سبک اور مانوس
میری آنکھوں کو ہوا لمس جو ان کا محسوس
اک کرن دوڑ گئی، اُٹھ گئے آنکھوں کے حجاب
جیسے سہمے ہوئے شاہیں کی نظر میں تب و تاب
میرے کانوں کو چھوا تھا کہ صدا گونج گئی
گھگھرانے لگی آکاش کی چلتی چکی
کوہساروں میں فرشتوں کی انوکھی پرواز
گہرے پانی میں تھرکتے ہوئے آبی پیکر
سرسراتی ہوئی بیلیں کہیں وادی میں ادھر
دُور و نزدیک سے آنے لگی ایک اک آواز
کھول کر ہونٹ، دہن میرا دبایا اتنا
کہ مری فتنہ گر و شوخ و سخن ساز زباں
کھینچی تالو سے تو مُنہ سے نکل آیا فتنہ
سانپ دانا ہے مگر زہر بھرا سانپ کا پھن
دے دیا پنجۂ خونیں نے اسے میرا دہن
تیغ سے سینہ گریباں کی طرح چاک کیا
دل بے تاب سے سینے کو مرے پاک کیا
رکھ دیا دل کی جگہ شعلہ فشاں انگارہ
آگ بھڑکی تھی کہ شق ہو گیا سینہ سارا
لاش کی طرح بیاباں نے سہارا مجھ کو
دیر تک ہوش نہ آیا جو دوبارہ مجھ کو
دُور سے ہاتفِ غیبی نے پکارا مجھ کو:
"قم باذنی، بکشا چشم، سر اٹھا مرا اپنا
تو پیمبر ہے، مری رُوح ترے سینے میں
خشک و تر میں مری آواز، مرا حکم سنا
پھونک دے صور کہ سوتے ہوئے دل جاگ اٹھیں"

---

[1] تذکرہ نگاروں نے پوشکن کے عزیز دوستوں میں کسی منصور روف کا نام لیا ہے جس سے خط و کتابت رہتی تھی۔
قرآن کا ترجمہ روس میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ۱۸ ویں صدی کی زبان میں اس سے بہتر ترجمے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

سوتے ہوتے دلوں کو جگانے اور صور پھونکنے کے لیے، اوّل شاعر کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے حواس کو غیبی طاقت کی ترجمانی اور نئی قوت کی رازدانی کے قابل بنائے، یہ پیمبرانہ کارنامہ ہے۔ پوشکن اپنے فرض سے غافل نہیں رہا۔ ہر قسم کی ناگواری اور غلط کاری کا توڑ تھا اس کے پاس علم و آگہی، فکر اور فن کی ریاضت، اس ریاضت میں خود فراموشی ـــــ دس سال بعد خود اعتراف کرتا ہے:

مجھے شاعری نے [مرنے سے] بچالیا، نئی زندگی عطا کر دی، ورنہ سوسائٹی کے نام جہام اور رقید تنہائی کی گھٹن نے مار ہی ڈالا تھا۔

اب تک کے سوانحی خاکے سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں شاعری سے مُراد نہ تو قافیہ پیمائی ہے، نہ محض فکر سخن ـــــ بلکہ زندگی کا وہ باہمہ اور بے ہمہ رویّہ جسے غالب نے ان لفظوں میں جتایا ہے:

سخت جانیم و قماشِ خاطرِ ما نازک است
کارگاہِ شیشہ بنداری بود کہسارِ ما[1]

حدِ نظر تک برفیلی چادر بچھی ہوئی ہے، راستے پر برف کی سلیں جم گئی ہیں۔ ۱۱ جنوری (۱۸۲۵ء) کو صبح سویرے گاؤں آنے والی سڑک پر بے بہتہ برف گاڑی کی گھنٹیاں بجتی ہیں، گھوڑے بھاپ اُڑاتے ہانپتے احاطے کے پھاٹک میں داخل ہوئے، پوشکن گرم بستر سے اُچھل کر ننگے سر ننگے پاؤں باہر دوڑا اور اپنے عزیز دوست، ہم خیال اور ہمراز پوشیچن (Пущин) کو گلے لگا لیا، بڑی بی نے ٹوکا کہ سردی کھا جاؤ گے، مگر خوشی کے مارے پوشکن کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ سماوَر گرم کیا گیا، پوشیچن اپنے ساتھ شمپین کی تین بوتلیں لایا تھا، جام پر جام چلے، بچپن کے نام، روس کے نام، لیزیم کے، لیزیم والے دوستوں کے نام اور یہ خاص "اس" کے نام (اس سے مُراد زار شاہی سے آزادی کی دیوی)، پوشیچن نے سب دوستوں کا احوال سنایا، بتایا کہ پوشکن کی یوں دُور دیہات میں نظر بندی کا توڑ کرنے کی ساری تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ ریلئیف نے جو رسالہ "قطبی ستارہ" نکالا ہے، اس میں تمھارے کلام کی دھوم مچی ہوئی ہے ـــــ اور لو یہ خط اڈیٹر کا:

---

[1] ہم بڑے سخت جاں آدمی ہیں مگر طبیعت نازک پائی ہے۔ یوں جانو کہ ہمارے پہاڑوں میں شیشے کا کوئی کارخانہ لگا ہے، باہر زمانے کے مصائب کا سامنا کرنے کو ہم ایک چٹان اور اندر اپنے تاثرات کی دنیا میں نہایت حسّاس۔

بہت بہت پیار ! بنجارے نظم کی مبارک باد قبول کرو۔ تمھاری زبردست صلاحیتوں سے جتنی امیدیں تھیں، سب سچ نکلیں۔ واہ کیا دیو پیکر جیسے لمبے ڈگ بھر رہے ہو! واقعی روسی دلوں میں [تمھارے قلم نے] خوشی بھر دی ہے۔

پوشچن نے ایک ابھرتے ہوئے، ہم عمر اور ہم عصر فن کار گری بے ئیدف (Грибо едов) کی کامیڈی پڑھ کر سنائی (عقل کی بپتا) ـــــــ اس کی اشاعت پر پابندی لگ چکی تھی، لیکن کتاب نقل در نقل گھوم رہی تھی۔ پوشکن نے جی بھر کر داد دی۔ واقعی مزاحیہ شاہکار ہے یہ ! اس کے آدھے اشعار تو زبان زد ہوتے ہوتے ضرب المثل بن جائیں گے۔[1]

شام پھیل چکی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ سیاسی گفتگو، خفیہ سوسائٹی کی سرگرمیوں کا ذکر بند کر کے ممنوعہ مسودہ چھپا دیا گیا۔ اوٹ پٹانگ باتیں زور زور سے کی جانے لگیں، اتنے میں دروازہ کھلتے ہی پاس کی خانقاہ کے واعظ صاحب ٹپک پڑے۔

میں نے یہاں کسی سے پوشچن نام کے مہمان کی آمد سنی تو سوچا کہ چلوں، دیکھوں، وہی میرے پرانے کرم فرما جنرل پوشچن نہ ہوں، ایک زمانے سے ان کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔

کھل گیا کہ بچارے واعظ کو اندر کی سن گن لینے بھیجا گیا ہے۔ وہ دیر تک سونگھا کیے، پھر رخصت ہو گئے۔ ان سے نجات ہوئی تو پوشکن نے اپنی تازہ نظمیں سنائیں، تینوں بوتلیں فرش پر لڑھکا دیں۔ صبح کے آٹھ بجے سے اب رات کے تین بجے کا عمل ہو رہا تھا۔ وقت کیسے سرک گیا، پتہ ہی نہیں چلا۔

" رخصت ہوتے دل دُکھ رہا تھا۔ ہم اب بھی جام ٹکرائے جا رہے تھے لیکن اداسی چھائی تھی، گویا ہمارا ماتھا ٹھنکا ہوا تھا کہ آخری بار ایک ساتھ پی رہے ہیں۔ نہایت خاموشی سے میں اٹھا، لپک کر اپنا اوور کوٹ کاندھے پر ڈالا اور ڈیوڑھی سے نکل گیا ـــــــ وہ ہاتھ میں شمع دان سنبھالے دروازے تک آیا، دور تک آواز آتی رہی " رخصت اے دوست!

اگلے سال ہی پوشچن دسمبری سرفروشوں کے ساتھ عمر قید کاٹنے کے لیے جلاوطن ہوا، وہیں اسے پوشکن کا منظوم پیغام ملا، وہیں اس تک جوانا مرگ پوشکن کی سنائی پہنچی۔

مگر ملاقات کا یہ دن پوشچن کے نام ایسی درد پُرسوز نظموں میں امر ہو کر رہ گیا ہے جو پوشکن کی

---

[1] پیش گوئی سچ نکلی، "عقل کی بپتا" (Горе от ума) کے مصرعے آج تک زبان زد ہیں اور ان کو قوسین میں یا اُلٹے کاماؤں کے درمیان نہیں لکھا جاتا۔

ہی نہیں بلکہ عموماً ہم مذاق اہل قلم کی گہری دوستیوں کی بہترین نشانیاں ہیں۔

دوسری ایسی ہی اچانک آمد ڈِلوگ ([illegible]) کی تھی۔ وہ بھی اسی سال اپریل میں میخائیلوفسکوئے آیا اور کئی دن ٹھیرا۔ یہ شخص نوجوان فن کاروں کا دل بڑھاتا، ادبی حلقوں میں جوت جگاتا، ٹوٹے دلوں کو ملاتا تھا، خود بھی کوئی معمولی شاعر نہ تھا، مگر اس نے اپنا جوہر اوروں کی تربیت پر صرف کر دیا۔ پوشکن نے ایوگےنی انے گن کے جو پانچ باب مکمل کر لیے تھے۔ ڈِلوگ نے سنے، رائے دی، پوشکن اسے تری گورسکوئے والوں کے ہاں لے گیا، سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گاؤں میں کہیں بوسیدہ سا بلیرڈ رکھا تھا، اس کی تقدیر کھل گئی۔

پوشچن اگر سیاسی حالات اور خفیہ سرگرمیوں کا زندہ خبر نامہ تھا تو ڈیلوِگ ادبی سرگرمیوں، تحریکوں اور تحریروں کا متحرک شیرازہ۔ اس کی آمد پوشکن کی مختصر غنائی نظموں کے انتخاب، تحریف اور شیرازہ بندی میں بھی کارآمد ثابت ہوئی۔

اگر حالات نے مہلت دی ہوتی اور احباب بھی پوشکن کا دکھ بٹانے آتے، سال ابھی گزرا نہ تھا کہ ۱۴ر دسمبر ۱۸۲۵ء کو سینٹ چوک کا المناک (بلکہ عبرت ناک) ڈرامہ ہو گیا۔ پوشکن کو کئی دن بعد خبر ملی، سنتے ہی اس نے اپنے کئی مسودے، کاغذات، نوٹ، آتے پتے جلا ڈالے، لیکن وہ اُن کاغذات کو کیوں کر جلا سکتا تھا جو دسمبری جوانوں کی جامہ تلاشی یا خانہ تلاشی میں برآمد ہوئے اور جن پر پوشکن کی نظمیں، مصرعے، سیاسی ہجویں، پھبتیاں اور یادیں درج تھیں؟ وہ خود پہلے سے ہی مشتبہ اور معتوب تھا۔ اس واقعے نے اور بھی تائید کر دی۔

ژوکوفسکی نے، بادشاہ کے سابق آتالیق کی حیثیت سے شہنشاہ الیکساندر اوّل کو یاد دہانی کی ویازیمسکی نے اخبارات میں بیان نکلوایا، پوشکن نے لکھا کہ میرا دسمبری باغیوں سے براہ راست کوئی سیاسی تعلق نہیں تھا۔

۷ر مارچ ۱۸۲۶ء کو پھر اس نے ژوکوفسکی کے نام صفائی کا بیان بھیجا اور غالباً اس ہمدرد کلاسیکی شخصیت نے وہ بادشاہ یا وزیر داخلہ تک پہنچایا بھی، خلاصہ یہ کہ :

> سیاست اور مذہب میں چاہے میرا مسلک کچھ بھی رہا ہو، وہ مجھی تک محدود اور محفوظ ہے اور ہرگز یہ نیت نہیں کہ مقررہ یا مسلمہ نظام [حکومت] جو بہرحال لازم ہے اس کے خلاف عمل کرنے کی حماقت کر بیٹھوں۔

رپورٹیں آئیں اور گئیں۔ وزارت داخلہ کو محکمہ خفیہ کا نوٹ گزرا کہ اپنی تمام خلاف سرکار اور

خلاف مذہب گفتگو اور شاعری کے باوجود پوشکن قانونی گرفت میں نہیں آتا۔

نئے شہنشاہ نے وزارت داخلہ کا چارج ایک نئے، مگر کڑے افسر بینکن دورف (Бенкендорф) کو دیا تھا۔ خاص اسی کے حکم سے خفیہ کا ایک مُخبر "باشنیاک" پسکوئے ضلع کو روانہ کیا گیا اور اسی کے ساتھ پولیس افسر مقرر ہوا کہ اگر پوشکن کی گرفتاری لازم قرار پائے تو وارنٹ جاری کر کے ساتھ لایا جائے۔

مخبر اور پولیس افسر دونوں اس ضلع کے خاص خاص لوگوں اور قصبے کے چودھریوں سے معلومات کر کے رپورٹ لائے، رپورٹ میں وہ حلیہ درج تھا جو میلے ٹھیلے اور عرس کے موقعوں پر دیکھنے میں آیا اور چال چلن کے بارے میں خاص نکتے یہ تھے:

(۱) آدمی کم سخن ہے، محتاط رہتا ہے۔ سرکار کے بارے میں زبان نہیں کھولتا؛

(۲) کسانوں کے ساتھ برابر کے دوستوں کا سا برتاؤ کرتا ہے۔ سلام دُعا کر کے ان سے ہاتھ ملا لیتا ہے؛

(۳) بعض اوقات گھوڑا سواری کرتے دیکھا گیا اور منزل پر پہنچ کر اپنے آدمی سے کہتا ہے کہ گھوڑے کو کھلا چھوڑ دو، ہر ایک حیوان کو آزادی کا پورا حق حاصل ہے؛

(۴) عام خیال یہ ہے کہ پوشکن پہلے کے مقابلے میں اور بھی لیے دیے رہنے لگا ہے، احتیاط کرنے لگا ہے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسا یاتونی، بڑبولا اور بھڑبھڑیا آدمی اس قابل نہیں ہوتا کہ کوئی شر پسند (سازشی) گروہ اسے اپنے اندر سمو لے۔

گاؤں کے واعظ صاحب نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ بڑا بے ضرر آدمی ہے وہ، شرمیلی لڑکیوں کی طرح لجایا رہتا ہے۔ پوشکن کے بہروپ نے رپورٹ کو اور رپورٹ نے وزیر داخلہ کو متاثر کر دیا۔ حکم ہوا کہ فوراً ماسکو لا کر شہنشاہ کی پیشی میں حاضر کیا جائے۔ ۳ر اور ۴ر ستمبر کی درمیانی رات کو پولیس افسر پہنچا اور اسی وقت شاعر کو پہرے میں ماسکو روانہ کر دیا گیا۔

بڑی بی "ارلشیا" روئی دھوئی، گاؤں میں جتنے منھ اتنی باتیں، تری گورسکوئے والوں نے اس کی سلامتی کی منتیں مانیں، خانقاہ میں کئی لڑکیاں دعائیں مانگنے اور مناجات پڑھوانے گئیں، اور چار دن بعد پوشکن شہنشاہ نکولائی اول کی خدمت میں باریاب کیا گیا۔

والیِ حکومت نے دوٹوک سوال کیا:

"اگر تم ۱۴ر دسمبر کو پیترسبورگ میں ہوتے تو کیا کرتے؟"

"میں باغیوں کے ساتھ ہوتا" پوشکن نے دبنگ ہوکر تنی آواز میں جواب دیا۔ اعلاحضرت نے خندہ پیشانی سے شاعر کی راست بازی کو قبول کر لیا اور اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ ایسے آدمی کو ڈنک مارنے سے بہتر ہے کہ سر سہلا کر اس کا ڈنک نکال لیا جائے۔

جب تک ماسکو سے میخائیلوفسکوئے کے دور افتادہ گاؤں تک اس کی سلامتی اور رجاں بخشی کی خبر نہ پہنچ گئی، بوڑھی آیا کا کیا حال ہوا ہوگا، پوشکن کو اندر سے یہ فکر ستا رہی تھی۔ اس فکر نے ایک بے تکلف نظم کی صورت اختیار کی ــــــ اپنی "کامیابی" پر نہیں، آیا کی فکرمندی پر ــــــ

میری پیاری، میری بوڑھی آیا
اے مری ہمدم و ہمراز بُرے وقتوں کی!
دُور، اس ڈھاک کے بَن میں تنہا
تو مری راہ بڑی دیر سے تکتی ہوگی
اپنی کھڑکی کے تلے، گھر کے بڑے کمرے میں
جیسے پہرے پہ مقرر، مجبور
تکلیوں سے جو چلی آتی ہیں دھاگوں کی تہیں
جُھرّیوں پر ترے ہاتھوں کی چڑھی ہوں گی ضرور
ہے ڈگر دُور کی، ویران ہے پھاٹک گھر کا
اُٹھ کے رہ جاتی ہیں نظریں ہر بار
دل کی دھڑکن نے کیا سانس بھی لینا دشوار
وہم سے جان ہے کانٹوں پہ
جانے کیا بات ہے... کیوں؟...

ساتواں باب

۱۸۲۶ — ۱۸۳۱ء

ماسکو تک کا سفر چھ دن کا تھا، حکماً تین دن میں طے ہوا "فوراً حاضر کیا جائے" کی اس طرح تعمیل ہوئی کہ پوشکن کو حجامت بنانے، کپڑے بدلنے تک کی فرصت نہیں ملی، اس نے چاہا کہ لباس نہ سہی، حواس ہی درست کر لے، جواب ملا "نہیں ـــــ بعد میں" پیشی کے وقت اس کا تمام جسم اکڑا ہوا تھا۔ زار نکولائی نے (جو ابھی کریملن میں اپنی تخت نشینی کی دھوم دھام سے فارغ ہوا تھا) آخر مُہرِ سکوت توڑی:

"گڈ مارننگ پوشکن، کہو اپنی طلبی پر دل سے خوش ہو نا؟"

پوشکن نے بھویں اٹھائیں۔ پہلی بار زار کو نظر بھر کر دیکھا۔ بادشاہ ایسے مانوس لہجے میں اسے مخاطب کرے گا، گمان نہیں تھا۔ تعظیم کے لیے اس نے سر جھکایا۔ نکولائی نے چشم و ابرو سے اشارہ کیا کہ اور نزدیک آجائے۔

"میرے برادر بزرگ نے تمھیں جلاوطن کیا تھا، کوئی وجہ ہوگی، خیر میں تمھیں معافی دیتا ہوں، تم آزاد ہو۔ امید ہے کہ اس بار تم آزادی کی قدر جان سکو گے۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ اور بھی دلجوئی دکھانا چاہتا تھا۔ پوشکن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر شہ نشین میں ٹہلا۔ "سنو، صرف تمھیں تک رہے۔ تم نے بھی حماقتوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نوجوانی بے لگام ہوتی ہے، میں خوب جانتا ہوں، مگر اب آئندہ سے تم احتیاط کرنا، ہمارے تمھارے درمیان کوئی رخنہ نہ پڑے۔"

"اس سے زیادہ میرے لیے اور کیا خوشی کی بات ہے سرکار۔"

زار نے اپنا لمبا چوڑا، ٹھنڈا اور اُجلا ہاتھ آگے بڑھایا، پوشکن نے اپنا چھوٹا سا گرم ہاتھ اس کے سپرد کر دیا۔ ایک سوال بادشاہ کے لبوں پر شروع سے بیقرار تھا، آخر اس نے پوچھ ہی لیا:

"اگر تم ۱۴ر دسمبر کو سینٹ پیٹرسبورگ میں ہوتے تو کیا کرتے ؟"

"حضور، میرے، تمام دوست احباب سازش میں شریک تھے، میں انھی میں شامل ہوتا صرف غیر حاضری نے مجھے بچالیا" جواب میں تھوڑی ڈھیل دینی چاہیے تھی، یہ سوچ کر وہ فوراً بولا "حضور" اور آپ اس [غیر حاضری] پر بہت خوش ہوں"

زار مسکرادیا۔

"آج کل کیا لکھ پڑھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں حضور، سنسر کی گرفت بہت سخت ہے"

"ایسی چیزیں لکھتے ہی کیوں ہو جو سنسر کی گرفت سے نہیں گزر سکتیں ؟"

"سنسر کی گرفت سے تو کچھ بھی نہیں گزر سکتا"

"خیر، اگر تمھیں سنسر سے شکایت ہے تو آئندہ سے تمھاری تحریریں صرف ہماری نظر سے گزرا کریں گی، جو بھی لکھو، پہلے ہمیں دکھالیا کرو۔ تمھاری تصنیف کی اشاعت کے لیے محض ہماری منظوری کی مُہر کافی ہوا کرے گی"

پوشکن کا نڈھال چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

"حضور کا شکریہ! واقعی شاہانہ کرم ہے!"

نکولائی کا چہرہ بدلتے بدلتے رہ گیا: اُفوہ، اس تنگ بند کی یہ مجال! یہ جانچے گا کہ کیا "شاہانہ" ہوتا ہے، کیا نہیں! تاہم اُس نے درگزر سے کام لیا۔

"اچھا، تو اب چلا جائے، خوش خبری سنا دیں" وہ پوشکن کا بازو تھامے ہوئے باہر آیا۔

"حضرات" زار نے ان درباریوں پر جو باہر دیوان خاص میں اپنی اپنی وردیوں میں ملبوس منتظر تھے، ایک نظر گھماتے ہوئے بآوازِ بلند سنایا:

"حضرات ـــــ یہ لیجیے، نئے پوشکن سے ملیے۔ یہ ہے میرا پوشکن !"

(ک نمبر ۷ ۳ ص ۲۶ ـ ۱۳۵)

اسی سال کی پہلی تاریخ کو پوشکن کی مختصر نظموں کا مجموعہ نکل کر ہاتھوں ہاتھ بک چکا تھا، دسمبریوں کی تحقیقات کے لیے جو کمیٹی بٹھائی گئی، اس کے سامنے گزری ہوئی شہادتوں کا چرچا تھا؛ سیاسی اور باغیانہ نظمیں قلمی نسخوں میں گشت کر رہی تھیں، طویل نظموں کے کچھ حصے شائع ہو چکے تھے، ماسکو میں ہر طرف دھوم ہو گئی کہ پوشکن نظربندی سے رہا ہو گیا۔ وہ اپنے ایک ہم قلم دوست ـــــ

(سبولیفکی) کے ہاں ٹھیرا تھا، ہر طرف سے بلاوے آنے شروع ہو گئے۔ لوگ اس کی زیارت کے لیے بے تاب تھے[1]۔

آخر ۱۲ ستمبر کو وہ ماسکو کے شاندار بالشوئے تھیٹر میں قدر دانوں کے ایک گروہ کے ساتھ تماشائی کی حیثیت سے داخل ہوا، اور خود تماشا بن گیا۔ چشم دید گواہ کا بیان ہے:

تھیٹر میں پوشکن کا قدم رکھنا تھا کہ ہر طرف خبر پھیل گئی۔ لب بر لب یہ نام گھومتا چلا گیا۔ سب التفات، ساری نگاہیں اسی کی طرف اُٹھنے لگیں، باہر نکلنے کے دروازے پر اس کے چوطرفہ جھمگٹا ہو گیا.....

گھومنے نکلا تو ایک ہجوم اس نامور مغنّی کے پیچھے لگ گیا جو الُبزا اور باغچہ سرائے کے نغمے گا چکا تھا۔ ہر طرف سے ایک ہی پکار تھی ـــــ دکھاؤ، دکھاؤ، ارے اسے دیکھنے تو دو!"

(ک نمبر ۲۷، باب دوم ص ۳۵۵)

ہر ایک حلقہ اسے لبیک کہہ رہا تھا: چھ سال کی مسلسل بدنامی، جلاوطنی، اور نظربندی کے بعد گردشِ ایّام نے یہ پہلا (اور غالباً آخری) موقع فراہم کیا کہ قوم کے ایک مخصوص نظریے کا شاعر، بلا تفریق عام پرستش کا مرکز بن گیا، اس کی سماجی اور فن کارانہ مقبولیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔

آزاد خیال نوجوان خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ دسمبریوں کا ایک ترجمان منظرِ عام پر نمودار ہوا۔ پرانے سرکار پرستوں کو خوشی تھی کہ اب اس کا قلم کھلے بندوں سرکار کے منشا کی تعمیل کرے گا؛ ہم عصروں میں جو باہر تھے، وہ اس کی نیّت اور دلیری سے باخبر تھے، قدیم خیال کے زبان داں اس کے کلاسیکی کارنامے کے قدرداں اور سلاست و فصاحت کے قائل تھے۔ امیروں اور امیرزادوں کے ڈرائنگ روم اس کے لیے چشم براہ تھے کیوں کہ روس کے شہنشاہ، یوروپ کے پشت پناہ نکولائی کے دستِ شفقت کے تذکرے تمام اونچی ڈیوڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ اور عوام میں مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی کہ ان کی بولی کو ادب کے اعلا پائے تک پہنچانے والا سلامت رہ گیا۔

دوستوں کے اصرار پر طے پایا کہ ۱۲ اکتوبر کو پوشکن اپنا تازہ کلام سنائے گا؛ ایک ہم قلم پگودین کا

---

[1] قریب قریب سبھی تذکرہ نگاروں نے ۱۸۲۶ء کے اِن دنوں کی تفصیلات لکھی ہیں اور غالباً سبھی کا ماخذ ۱۸۴۱ء کی وہ یادداشتیں ہیں جو اخبارات و رسائل میں چھپی تھیں، مثلاً Москвитянин ч-1 стр 522

بیان ہے کہ :

اس دن ہم سب لوگ صبح سے وینے وتی توف (Венавцтинов) کے ہاں جمع ہو گئے، بے چینی سے پوشکن کا انتظار کرنے لگے، آخر وہ بارہ بجے دن کو آپہنچا۔ اس شعر خوانی کا ہم سب پر کیا اثر ہوا، بیان سے باہر ہے۔ آج اس واقعے کو چالیس برس ہوئے ہیں اس دن کو یاد کرتا ہوں تو خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔

اوّل اوّل تو ہم خاموشی سے نیچے بیٹھے سنتے رہے ـــــ بلکہ ذرا اکڑ بڑائے ہوئے تھے، مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا، بدن میں لہر دوڑتی چلی گئی۔ اس نے اپنا کلام سنانا بند کیا، ہم ایک دوسرے کو تکتے رہ گئے، پھر سب کے سب پوشکن پر جھپٹ پڑے، اسے گلے لگایا، شور برپا ہو گیا، ہنسی قہقہے، آنسوؤں کی قطار، مبارک بادیں، کیسی عجیب و غریب صبح تھی، عمر بھر کے لیے اپنے نشان چھوڑ گئی . . . . .

اور سنایا کیا تھا پوشکن نے؟ "بورلیس گودونوف" (Борис Годунов) منظوم ڈرامہ، جسے چھ سال تک یہ سوچ کر روکے رہا کہ پبلک کا مذاق اور تنقید کا معیار اس کے ساتھ انصاف نہ کر سکے گا۔ حقیقت میں اس کی اشاعت کے وقت (۱۸۳۱ء) میں ایسا ہی ہوا بھی۔ ہر طرف سے اس پر لے دے ہوتی رہی۔ جب تک کہ خود تاریخ نے اپنا فیصلہ شاعر کے حق میں نہ سنا دیا۔

پوشکن کی شخصیت، جو قربانی اور عظمت کے ہالے میں آگئی تھی، اس کی تاثیر تھی کہ دو سال تک (۲۷-۱۸۲۶ء) کسی نے اشارۃً بھی اسے نہیں ٹوکا ـــــ سوائے وزیر داخلہ بینکن دورف (Бенкендорф) کے، جو بادشاہ سلامت کی طرف سے یہ جواب طلب کرنے کا مجاز تھا کہ سرکار عالی کی منظوری لیے بغیر کسی پرائیویٹ نشست میں کلام کیوں سنایا۔

روس کے عظیم الشان مفکر اور عالم ہیرتسن (Герцен) نے اس بے پناہ مقبولیت کا سبب یوں بتایا ہے :

بغاوت کی ناکامی کے بعد "لے دے کے پوشکن کا ہی، جھنکتا، گونجتا نغمہ رہ گیا تھا جو ظلم اور جبر کی وادیوں میں سنائی دے رہا تھا؛ یہ نغمہ ماضی کے دور کو برقرار رکھے ہوئے مردانہ آوازوں سے حال کو جگائے ہوئے، دور مستقبل تک اپنی صدا پہنچائے ہوئے بلند تھا۔"

شام کی محفلیں، بال روم کے جلوے، چہلیں، گلچھرّے اور ناز برداریاں، سب سامان مہیا تھا لیکن شاعر کو کچھ اور ہی دھن تھی۔ ملک میں اخبار نویسی، ادبی صحافت اور تعلیمی معیار سے بددل

ہو کر وہ بے چین تھا کہ ان محاذوں پر کام کرے۔ اوّل تو اس نے عوامی تعلیم و تربیت (Народное воспитание) پر ایک مفصل مضمون لکھا اور زار نکولائی کو پیش کیا، جس میں شہنشاہ کی دُکھتی رگ کو بھی سہلا دیا گیا تھا یہ کہہ کر کہ :

"غالباً وہ بھائی، دوست اور کامریڈ، جو (بغاوت میں) برباد ہوئے، وقت اور غور و فکر کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے پڑ جائیں گے (زخم سوکھ جائیں گے)..... البتہ تعلیمی روشنی ہی وہ شے ہے جو نئی دیوانگیوں کو، نئی سماجی بربادیوں کو روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"

وزیر داخلہ کی نظر میں یہ مقالہ بھی مردود ٹھہرا کیوں کہ اس میں علم، روشنی اور ذہانت و صلاحیت کو اخلاق، ڈسپلن اور قانون کی فرماں برداری سے زیادہ اہمیت دے دی گئی تھی۔

دوسرے اپنے ارد گرد کے نہایت ہونہار دانش وروں کو ساتھ لے کر ایک ادبی سماجی رسالے "نقیب ماسکو"[1] (Московски Вестник) کا اجرا کیا۔ پگودین کو (جو بعد میں بہت چمکا) اس کا اڈیٹر بنایا گیا۔ پوشکن پس پردہ ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ادبی نقاد ڈلوگ کا رسالہ "شمالی پھول" (Северние цветы) نکل ہی رہا تھا، اس کی مدد کی اور یوں نئے سماجی اور تہذیبی مباحث کے لیے ایک نیا فرنٹ کھول دیا۔ اب اس نے تنقیدی، تاریخی اور علمی مضامین لکھنے اور لکھوانے پر پوری توجہ دینی شروع کی۔

مگر ان تمام چوطرفہ "اصلاحی" کوششوں کی بابت 19 ویں صدی کے آخر کا ایک "ماہر پوشکنیات" لکھتا ہے :

"تاہم ماسکو والے حلقے کے ساتھ اس کے برتاؤ میں کوئی دُورُخا پن ضرور نظر آتا ہے۔ ادب کے متعلق اس حلقے کی سنجیدہ نظرے اسے دلی ہمدردی تھی، وہ اس بات میں بھی ہم خیال تھا کہ آرٹ کو بے قید و بند آزادی کا پورا حق ہونا چاہیے اور فرانسیسی ذوق کے غلبے سے اسے نجات ملنی چاہیے، لیکن وہ ہرگز اس کا روادار نہیں تھا کہ ہمارے یہاں کی نوعمر ادبیات جرمن فلسفیانہ نظریات کی پابند یا مُقلِّد ہو کر رہ جائے۔"[2]

---

[1] اس رسالے کے جو شمارے محفوظ ہیں ان پر نام یوں لکھا ہے: Московски Вестник

[2] Москва 1903 Проф А. Кирпичников

۲۷-۱۸۲۶ء کی سردیاں زیادہ تر ماسکو میں گزاریں اور گرمیاں آتے ہی بڑے اصرار اور سفارشوں سے کے بعد پیٹرسبورگ میں داخل ہونے کی چھوٹ مل گئی۔ راجدھانی میں اقلیم سخن کا شہزادہ سات برس بعد یوں داخل ہوا کہ مہینوں اسے خود اپنا سُراغ نہ مل سکا۔ مضامین، خطوط، تنقیدی نوٹ تو برابر لکھے جارہا تھا مگر جم کر شعر کہنے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ پھر ادھر اس کی نظم انقلاب فرانس کے مظلوم شاعر "آندرے شینئے (Andre Chenier) کی یاد میں" نکل گئی، یہاں شینئے کے پردے میں سیاست اور آرٹ کے ٹکراؤ کو ابھارا گیا ہے:

خفیہ والوں کی نظریں ہر جگہ اس کا پیچھا کرتی رہیں، کاؤنٹ بنیکن دورف اسے ذرا نرم لفظوں میں روکتا ٹوکتا رہا ـــــ اور پوشکن کو محسوس ہوا کہ اصل قید و بند کا زمانہ اب شروع ہوا ہے۔

یہ نظم تو خیر شاعرانہ تعلّی کے پردے میں بچ نکلی، لیکن ۱۸۲۷ء میں ہی دو واقعے اور ہوئے:

زینائیدا وال کونسکی (اُن جنرل وال کونسکی کی بہن، جنھوں نے رائیفکی خاندان کی چھوٹی بیٹی سے شادی کی تھی) کے یہاں ممتاز شہریوں کی دعوت تھی۔ ابھی ان خاتون کے بھائی کو ہتھکڑی بیڑی میں سائبیریا گئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ جو حضرات و خواتین زرق برق لباس اور خوش و خرم چہروں کے ساتھ یہاں دعوت میں شریک ہوئے ان میں ہر ایک کا کوئی نہ کوئی عزیز یا دوست گولی، قید، کوڑے یا جلاوطنی کی زد میں آچکا تھا۔ مگر جواں مرد شرفا وارثِ تاج و تخت سے اپنی وفاداری کا پُرتکلف مظاہرہ کرنے میں لگے تھے۔ (ک نمبر ۵ اص ۳۱۳)

مہمان پوشکن گردن ڈالے اسی سوچ میں گم بیٹھا تھا کہ نازک اندام ماریا نے ہال میں قدم رکھا ابھی اس کی شادی کو دو برس ہوئے تھے، اور پہلی زچگی کو سال بھر۔ جنرل وال کونسکی کو عمر قید اور جلاوطنی کی سزا کا اعلان ہوا تھا کہ گھر والوں نے بیٹی کو تسلی و تشفی دی: کوئی حرج نہیں، ابھی نوجوان ہو، ذی علم ہو، ہزاروں لاکھوں میں ایک ہو ـــــ اور شوہر یوں بھی تم سے بیس برس بڑے تھے، زندگی دیکھ چکے، تم نے ابھی کیا دیکھا۔ ماریا چپ سنتی رہی، بچہ میکے میں چھوڑا اور سامان سفر باندھ کر شوہر کے ساتھ عمر قید بسر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ خبر آگ کی طرح پھیلی اور اب وہ عزیزوں سے رخصت ہونے کے لیے اس محفل میں آئی تھی۔ اس پھول سی بچی کے جلال کے آگے سب دم بخود تھے اور پوشکن، ماریا کا سب سے پہلا خاموش تمنائی اسے دیکھتے ہی شدتِ جذبات، شرم اور شردھا کے مارے سرخ ہوگیا۔

"ماریا، سب کو میرا سلام کہنا، میں اپنا فرض بھولا نہیں ہوں، میں کسی نہ کسی حیلے سے ملنے آؤں گا"

مشکل سے ہفتہ بھر گزرا ہوگا کہ ایک عزیز دوست اور ہم خیال دسمبری نکیتا موراویئف (Никита Моравьев) کی نوجوان بیوی اسی راہ پر گامزن ہوئی۔ پوشکن اسے رخصت کرنے گیا اور چلتے ہوئے دو نظمیں دے آیا۔

ایک پوشچن کے نام:

"اوّلین دوست، بے بہا ہمدم"

اور دوسری وہ جو روسی ادب کی تاریخ میں یوں بھی لازوال ہوگئی کہ اُدھر سے شاعر اودئیفسکی (одоевский) نے اس کا ویسا ہی جواب لکھا — پوشکن نے پیغام دیا تھا کہ:[1]

سائبیریا کے سنگلاخ دُور دشت میں
تمھارے دل قوی رہیں، عزم سربلند ہو!
رائگاں نہ جائیں گی تمھاری کاوشیں
نظر کی لو اٹھتی رہے، یہ ولولہ دوچند ہو!
بُرے سمے کا ساتھ دینے والی ایک آس ہے
غموں کی باوفا بہن، سدا غموں کے پاس ہے
ہنسی خوشی گزار دے گی دن برے، رکھے گی تم کو تازہ دم
وہ صبح جس کی آرزو ہے، لے گی ایک دن جنم
ہرے بھرے ہیں الفتوں کے، یادیار کے چمن
مہک اڑے گی سیخچوں کے پار جا کے چوم لے گی پیرہن
مری نوائے شوق جس طرح اڑی، ادھر گئی
تمھاری قید کے مہیب غار میں اُتر گئی
یہ بھاری بھاری بیڑیاں گریں گی کٹ کے ایک دن
قفس کی تیلیاں اچٹ کے ایک دن

---

[1] میرے مرحوم دوست اور خوش گو شاعر نریش کمار شاد نے پوشکن پر اپنے ایک سرسری مضمون میں کئی نظموں کا ترجمہ دیا تھا (ماہنامہ پونم، حیدرآباد ۱۹۶۴ء) یہ نظم بھی انھی میں شامل تھی (ن۔ا)

تمھیں خوشی سے راہ دیں گی، جب قدم بڑھاؤ گے
تو ہم دموں سے، بھائیوں سے تیغ اپنی پاؤ گے

پرچہ لگا کر پوشکن اندر رخانہ ان حرکتوں میں مصروف ہے۔ یہاں تک تو بادشاہ سلامت پی گئے، لیکن جب ایک مشتبہ چال چلن کے کپتان متکوف (Метков) کی تلاشی میں نظم "گوریلیادا" (Gavriliada) برآمد ہوئی ـــــ اور قرینے سے ثابت ہو گیا کہ کفر کے یہ کلمات بے دین پوشکن کے سوا کسی کے نہیں ہو سکتے تو شاعر کی شامت آئی۔ اوّل اوّل تو شاعر سمیت سب مُکر گئے، کسی نے تصنیف کی حامی نہیں بھری، جب کسی طرح جان نہ چھوٹی تو آخر پوشکن نے نکولائی کے نام پشیمانی کا ایک خط لکھ کر "اپنے قصور کا اعتراف کر لیا" اس کے چند ہفتے بعد ہی اس کی نظم پشیمانی یا اعمالنامہ (Воспоминание) شائع ہوئی، رات گئے، جب آنکھ نہیں لگتی تو یادیں میرا اعمالنامہ سامنے پھیلا دیتی ہیں:

غم زدہ آپ بیتی ہے پیشِ نظر
ہوں پشیمان رہ رہ کے روتا ہوں میں
پر یہ تحریر اشکوں سے دُھلتی نہیں

دوستوں اور ہم نشینوں کی یادداشتیں گواہ ہیں کہ پوشکن پر، ہزار طرح کی شبانہ روز مصروفیتوں کے باوجود، ایسی جان لیوا راتیں گزرا کرتی تھیں ـــــ خود تنقیدی کی شب زندہ داریاں۔

اسی سال (۱۸۲۸ء) بہن کی شادی ہو گئی، بھائی دور فوج میں اپنی ملازمت پر چلا گیا، ماں باپ سے جو خط و کتابت کا رشتہ تھا، بہن بھائی کے دم تک تھا، وہ گئے تو یہ بھی چھوٹا ـــــ ماسکو اور پیتیر سبورگ میں وہ پھر شاموں کی شراب اور راتوں کی رونقوں میں پڑ گیا۔ دولتمند قدردانوں کی بھی کچھ کمی نہ تھی۔ طوفانی راتوں کے بعد آخر کسی کو تو ایسی نظمیں مخاطب کرتی ہوں گی:

پالا کٹتا ہے، دُھوپ بھری
اور روشنی پھیلی ہے دن کی
تم، جانِ جہاں، کیا سوتی ہو؟ اٹھ جاؤ، یہ منظر دیکھو تو
اے حسن کی دیوی، مل ڈالو اب نیند کی ماتی آنکھوں کو

اُتّر سے اجالا آتا ہے
دن کیا متوالا آتا ہے!
اِس دن کا سواگت کرنے کو، تم صبح کا تارا بن جاؤ۔

کل رات بڑا طوفان رہا
کچھ یاد ہے، کیا طوفان رہا؟
بر فیلے بگولے دھرتی سے آکاش کو بڑھتے جاتے تھے
تھی چاند کی ٹکیا سہمی سی، بادل سر چڑھتے جاتے تھے
وہ کل کی اُداسی دُور ہوئی
تھا جس سے تمھارا مَن میلا، وہ رات گئی، کافور ہوئی

اب نیلے گنبد کے نیچے
پھیلے ہیں برف کے غالیچے
کیا شان دکھاتے ہیں دن میں، کیا دھوپ میں جھم جھم کرتے ہیں
اِس اُجلے ستھرے منظر میں شفاف سا جنگل بکھرا ہے
پالے کی ہلکی چھینٹوں سے دیودار کا سبزہ نکھرا ہے
اور پتھر جیسے برف تلے دھارے بھی نرم گزرتے ہیں
کمرے میں روپہلی دھوپ لیے
دن آیا اُجلا روپ لیے
چولھے میں بھرے ہوں انگارے اور چٹ چٹ اُڑتی چنگاری
بستر پر پڑے ہوں سوچ میں گم، تب لُطف ہے موسم کا پیاری

پر آؤ، ذرا جی بہلا لیں
مشکی پر ساز کسا جائے
بے پہیئے کی گاڑی میں ہم تم سیر کریں، پھسلا جائے

اِس برف میں پھسلن زور کی ہے
بو باس ہوا میں سجھور کی ہے
بے تاب ہے گھوڑا اُڑنے کو، فراٹے بھرتے جائیں گے
اے جان، یہ صبحیں عیش کی ہیں، ہم عیش ہی کرتے جائیں گے
خالی کھیتوں، میدانوں سے،
جنگل سے اور ویرانوں سے،
[ہیں مجھ کو بہت پیارے ساحل] ساحل سے گزرتے جائیں گے

• (۱۹ اکتوبر ۱۸۲۶ء) فکر و فن کی ملازمت دنیا کے جھمیلوں کو گوارا نہیں کرتی" پوشکن نے اپنے لیزیم کی سالگرہ کے موقع پر لکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قیام ماسکو کے اول دو مہینوں کے ہنگامی زندگی میں اسے قلم پکڑنے کی فرصت نہیں ملی۔ یہاں تک کہ خط وکتابت کے لیے وقت نہ رہا..... دو مہینے بعد وہ کسی طرح جان چھڑا کر اپنے گاؤں میخائیلوفسکوئے پہنچا تو آتے ہی اس نے ویازیمسکی کو خط لکھا کہ "کچھ بات ہے کہ گاؤں میرے جی کو بھا گیا ہے۔ چھوڑے ہوئے جیل خانے میں آزادانہ واپسی بڑی ہی کوئی شاعرانہ لذت رکھتی ہے، تمھیں خبر ہے میں کوئی جذباتی بندھنوں کا مارا ہوا آدمی نہیں، پھر بھی اپنے چوکیدار سے، رعایا کے آدمیوں سے اور اپنی بڑی بی سے ملنے میں جو مزا ہے، دل میں جو گدگدی سی ہوتی ہے، اس پر نام و نمود، خود پسندی کی بھڑک، تفریحیں اور خود فراموشیاں قربان . . . . "

(ک نمبر ۱۲، ص ۱۰۲)

۲۷ء کی خزاں نے اسے پھر اپنے گاؤں میں پایا۔ انھی دنوں اس کی دو اور مختصر نظمیں فضا میں گونج رہی تھیں "سوگوار" (Apuon) اور "شاعر" (Poem) دونوں کا موضوع مختلف لیکن سمت ایک۔ دوسری نظم میں شاعر خود فراموشیوں پر معذرت طلب ہے "جہاں کے کاروبار میں" اپنی گم شدگی کو محض وقتی اور شاعر کو اس لمحے کا منتظر بتاتا ہے جب غیب سے کوئی صدا آئے اور وہ چونک کر اُٹھے، اپنے فریضے کی تعمیل میں لگ جائے۔

مگر شاعری تو "مے مرد افگن" ہے، دیر تک سوگواری کی سنگت برداشت نہیں کرتی۔ پوشکن نئے منصوبوں میں لگ گیا۔ اس نے تاریخ اور افسانے کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں میں سے اپنے نانا ابراہیم

ہنی بال اور پیتر اعظم کا رشتہ تلاش کرنا شروع کیا۔ اس تلاش کا ایک مقصد ممکن ہے بادشاہ سلامت سے نئے رابطے کی استواری ہو، ممکن ہے ہم چشموں میں اپنے افریقی خون اور مشرقی بھڑکیلے پن کو ایک وصف بنا کر پیش کرنا ہو، مگر تلاش کا نتیجہ زبردست نکلا۔ موڈرن روس کے بانی مبانی پیتر اعظم کو ہیرو کے روپ میں ابھار کر اس نے طویل تاریخی نظم پلتاوا (Полтава) لکھ ڈالی، یعنی جنگ پلتاوا کے تاریخی کرداروں کی داستان، اور پیتر اعظم کا خادم خاص Арап Петра Великого رومانی ناول کا سانچہ تیار ہو گیا (یہ ناول مکمل نہ ہو سکا) "پلتاوا" کے دیباچے میں اس نے یہ بھی جتایا تھا کہ پیتر اعظم نے جو تہذیب اور جدید تنظیم کی مہم اٹھائی تھی وہ آج بھی تکمیل کا تقاضا کرتی ہے۔ پوشکن کا یہ تاریخی، رومانی منظوم ڈرامہ بری طرح تنقیدوں کا شکار ہوا۔ ۲۸ء کے ختم ہوتے ہوتے، جب یہ نظم منظرِ عام پر آئی، پوشکن کا زیادہ تر وقت علم و فن کے مرکز پیتر سبورگ میں بسر ہوتا تھا۔ اور یہی شہر اس کے لیے کانٹوں کی سیج بن گیا۔

پوشکن پر یہ دن بھاری گزرنے لگے، چوتھی بار اس نے غیر ممالک کی "تازہ ہوا" کھانے کی کوششیں شروع کیں:

۱۸۲۸ء کا موسم بہار تھا، پوشکن کی طرف سے درخواست گزری کہ قفقاز میں جنگ روس و ترکی کے محاذ پر اسے خدمت کا موقع دیا جائے، انکار ملا، پھر دوسری درخواست دی کہ صحت اچھی نہیں رہتی، تبدیل آب و ہوا کے لیے کہیں باہر ــــــ اور کہیں نہیں تو چین میں روسی سفارتخانے پر تعینات کر دیا جائے۔ اس کا جواب وزیر داخلہ کے نام سے اور شاہی ایما سے یہ آیا کہ جب تک خود چینی حکومت نہ چاہے، کسی نئے کام کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

پوشکن سر پٹک کے بیٹھ گیا۔ اس پر خاموشی اور تفکر کے دورے پڑنے لگے۔ ایک طرف یہ بے قراری تھی کہ اس عادی ماحول سے بھاگ نکلے، دوسری طرف یہ احساس کہ کہیں مستقل ٹھکانا کر لینے، زندگی اور ادب، دونوں کی گمبھیر نثر میں سر کھپانے کا وقت آ گیا ہے۔ چوطرفہ معاشقوں میں سے کسی ایک نشانے کو وہ اپنا محفوظ آشیانہ بنا لینے کی تدبیر سوچتا رہا اور انھی تدبیروں کے کارن نئی شکارگاہوں میں الجھتا چلا گیا۔

۲۹ - ۱۸۲۸ء کی سردیوں میں وہ ماسکو کے ایک بڑے دیوان خانے میں مدعو تھا۔ رقص و موسیقی کی محفل تھی۔ درباریوں اور رئیسوں کی بہو بیٹیاں بن سج کر، بڑے رکھ رکھاؤ سے رونق افروز تھیں۔ خود بادشاہ سلامت نے جو خود بھی، قناعت پسند شوہر کہلانے کے باوجود، نہایت حسن

پسند طبیعت رکھتے تھے، اس محفل کو اپنی موجودگی کا شرف بخشتا تھا۔ پوشکن بال روم ڈانس کا رسیا، ایک گوشے میں چپ چاپ گم، گویا موسیقی کا لطف لے رہا ہے۔ اتنے میں میزبان خاتون خوش اخلاقی کے ساتھ متوجہ ہوئیں اور چھریرے بدن کی ایک ترشی ہوئی نوخیز لڑکی سے، جس پر پوشکن کی نظریں جمی ہوئی تھیں، پوشکن کو خیال آیا کہ وہ عمر کی ۲۹ بہاریں دیکھ چکا ہے اور اسے پہلی بار خزاں کی آہٹ محسوس ہوئی۔

والز کی موسیقی بلند ہوئی تو وہ ادب سے اس لڑکی کی طرف بڑھا، ساتھ ناچنے کی درخواست کی اور موسیقی کی دُھن پر قدم سے قدم ملاتے، چکر کاٹتے وقت اس بار یوں محسوس ہوا کہ بے خودی طاری ہوئی جاتی ہے۔ اطالوی مصور رفائیل (Refael) نے فلورنس میں جس "میدونا" (Medonna) کو خواب میں دیکھ کر تصویر کے پردے پر اتارا تھا ــــــ وہ ڈریسڈن (Dresden) کی گیلری سے اُتر کر اس کے بازوؤں میں، سانسوں کے قریب آگئی ہے۔ پوشکن کو گویا اس نیم روشن رات جگمگاتی محفل میں اپنے ایک طویل خواب کی تعبیر مل گئی۔ زار کی نگاہ بھی کئی بار اس کمسن صبر آزما حسن کی طرف اُٹھ اٹھ کر پھسل چکی تھی۔ یہ تھی نتالیا نکولائیونا گنچاروا۔ پوشکن نے تیسرے ہی دن پیغام بھجوا دیا۔ بعد کے دو مہینے کسی نہ کسی حیلے بہانے سے وہ گنچاروف خاندان کے چکر لگاتا رہا۔

معلوم ہوا لڑکی کے پردادا نے کالوگا ضلع میں روس کا پہلا کپڑا مل لگایا تھا۔ خوب چلا۔ تیسری نسل نے فضول خرچی، بدعنوانی اور بدانتظامی میں ساری دولت لٹا دی۔ اب نقد رقم نہ ہونے سے کارخانے کے نیلام ہونے کی نوبت آچکی ہے۔

نتالیا نکولائیونا کی دو بہنیں تھیں، ایک بھائی اور ان تینوں میں اگر ماں کو کسی سے مدد کی، مستقبل سُدھر جانے کی امید تھی تو اسی سولہ برس کی بیٹی سے، جس کے حسن کی دھوم تھی لیکن قابل ذکر رشتہ کہیں سے نہیں آیا تھا۔ ماں باپ کے مزاج اور حالات کے کارن شریف زادے کتراتے ہوں گے پہلا باقاعدہ رشتہ ایک ایسے شاعر کا پہنچا جو اپنے سیاسی اور مذہبی عقائد کے علاوہ چال چلن کے حساب سے بھی شہر میں کافی بدنام تھا۔ ماں نے صاف انکار تو نہ کیا، لڑکی کی کم عمری پر ٹال دیا۔

دوسری بار پوشکن خود اس حویلی میں پختہ ارادہ کر کے داخل ہوا کہ بات طے کر کے نکلے گا، مگر اس بار بھی دال نہ گلی، اگلی صبح کو، وہ سرکار کی اجازت یا اطلاع کے بغیر دور قفقاز میں محاذ جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں روس اور ترکی کے آخری فیصلہ کن معرکے ہو رہے تھے (آرمینیا اور گرزیا دگرجستان) کی ہمدردیاں روس کے ساتھ تھیں) اور چھوٹا بھائی اسی فوج میں ایک افسر تھا۔

۱۴؍جون ۱۸۲۸ء کو وہ عین میدان کارزار میں دیکھا گیا۔

"پوشکن سرفروشی کی تمنا میں سرشار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کود پڑا۔ کسی مقتول قزاق (Kazak) کے پنجے سے نیزہ چھین کر دشمن کے سواروں کی طرف جھپٹا، ہمارے قزاق جنگجو اپنی آنکھوں کے سامنے ایسے ایک اجنبی سورما کو دیکھ کر ششدر رہ گئے جو گول فیلٹ کیپ منڈھے، شہریوں کے سے کُرتے میں گھوم رہا تھا۔ قفقاز کی شاعرانہ فضا کے پرستار کا یہ اولین اور آخری جنگی معرکہ تھا۔" (بیان اُوشاکوف Moscow کی نمبر۲، ص ۱۲۰)

شہر ارضِ روم ترکی سے اسی معرکے میں چھینا گیا ——— اور پوشکن نے یوں گویا سرحد پار کا پہلا اور آخری سفر کر لیا۔ نظم "ارضِ روم" (Арзрум) کا خیال یہیں آیا۔

ڈیفنس اور ہوم منسٹری اس "بانکے" کی جولانیِ طبع سے بے خبر نہ تھی۔ خفیہ حکم صادر ہو چکا تھا کہ نظر رکھی جائے لیکن صفِ کارزار کے بالکل قریب جانے نہ دیا جائے (کہیں فرار نہ ہو لے!) آخر اسے فوجی نگرانی میں پیٹرسبورگ واپس کر دیا گیا۔

قفقاز جاتے وقت وہ راستے میں جنرل یرمولوف کے ہاں ایک دن ٹھیر گیا تھا۔ شہنشاہ نے اس حوصلہ مند روشن خیال جنرل کو نہ صرف اپنا مدمقابل بلکہ دسمبریوں کا درپردہ پیرِ مغاں شمار کر کے فوج سے بے دخل کر دیا تھا۔ اول تو بے اجازت راجدھانی سے فرار، پھر ایک مشتبہ شخصیت سے رازدارانہ ملاقات، طرّہ یہ کہ میدان جنگ میں کرتب دکھاتے، شاعرانہ نعرے لگاتے پھرنا ——— واپس آتے ہی وزیر داخلہ نے جواب طلب کر لیا اور حکم نافذ ہو گیا کہ آئندہ بلا اجازت ایک دن کے لیے بھی باہر نہ جائے۔ لیکن پوشکن اپنے اس مختصر سفر با سرکشانہ مظاہرے سے خالی ہاتھ نہیں پھرا۔

——یہ گرم مزاج شاعر نے نہ جانے کیسے چند ہفتے کے اندر پانچ نظمیں لکھ ڈالیں جو براہ راست اس سفر کے مشاہدوں کا نتیجہ تھیں۔ اور ایک نثر پارہ: ارضِ روم کا سفر۔ اس سفرنامے میں یہ واقعہ بھی بیان ہوا ہے:

میں نے دریا پار کیا۔ خم کھائی ہوئی سڑک پر دو تابوت بردار (Дьавола) گھوڑا گاڑی اوپر چڑھیں۔ کئی گرجستانی بھی اس گاڑی کے ساتھ ساتھ تھے۔ میں نے پوچھا "کدھر سے"؟ جواب ملا "تہران سے" "یہ کیا لیے جا رہے ہو؟" "گریبائیدوف کی لاش"۔ گاڑی میں، گریبائیدوف کی لاش طفلس لے جائی جا رہی تھی۔

شاعر نے اپنی آنکھوں سے ایک سلطنت کو بنتے، پھیلتے اور پسپا ہوتے، زخم کھاتے دیکھا انجانے بے نام روسیوں، قزاقوں کی لاشیں دیکھیں اور گریبائیدوف جیسے باکمال جوان، ہونہار صاحب قلم کا یہ تابوت، جو اپنے علم، قلم اور جوانمردی میں خود پوشکن کا جواب تھا ــــ وہ ایک ہوشیار ڈپلومیٹ کی حیثیت میں اپنے ملک کی سرحدیں آگے تک بڑھانے کی پاداش میں مارا گیا۔
تقریباً انھی دنوں کی یہ بظاہر سادہ مگر حقیقت میں سلطنت کی توسیع پر کٹیلی طنزیہ نظم مشہور ہے!

"Анчар"

لو چلتی ہے، خاک اڑتی ہے، تپتی ہوئی ہر سانس
اک دشت ہے سوکھا ہوا، پودا نہ کہیں گھانس
زہریلا ببول اس میں کھڑا ہے تن تنہا
سناٹے میں جیسے کسی جلاد کا پہرا

چٹخی ہوئی دھرتی نے کوئی طیش کا لمحہ
اِس زہر بھرے تخم کے جننے کو چنا تھا
مُرجھائی ہوئی ٹہنی میں پتہ نہ تری ہے
رگ رگ میں ہے اک بس کی لہر آگ بھری ہے
دوپہر کی گرمی سے دہک اٹھتی ہیں شاخیں
(جیسے کسی بھٹی سے نکل آئیں سلاخیں)
رِستا ہے بہت چھال سے جب زہر ہلاہل
تب شام پڑے رال سے جم جاتے ہیں بکل
نزدیک بھی پر ماریں نہ دہشت سے پرندے
خود شیر بدکتا ہے، لرزتے ہیں درندے
اس تک جو کہیں جھونک میں، آ جائے بگولا
مسموم ہوا چاٹ کے بل کھائے بگولا
بھولے سے جو بدلی کوئی شاخوں سے لپٹ جائے

اِن اونگھتے پتوں کی اگر نیند اچٹ جائے
کڑوائی ہوئی آنکھوں میں بھر لاتے ہیں آنسو
سینے پہ جلی ریت کے ٹپکاتے ہیں آنسو
لیکن کسی اک شخص نے اک شخص کو گھورا
نظروں کا تقاضا تھا کہ فرمان ہو پورا
وہ حکم کا بندہ گیا "انچار" کی جانب
اور زہریلے صبح کو سرکار کی جانب
جس سے کہ جگر ٹکڑے ہو، چھلنی ہو کلیجا
وہ گوند، وہ مرجھائی ہوئی شاخوں کا گٹھا
لے آیا مگر چھائی تھی اس چہرے پہ زردی
پھر سرد پسینے سے لگی زور کی سردی
وہ نذر تو لے آیا مگر درد کے مارے
چھپّر کے تلے لیٹ گیا، پاؤں پسارے
سرکار کے چرنوں میں گرا، چھوڑ دیے پران
اک تن سے گئی جان تو اک تن کا بڑھا مان
حاکم نے اسی زہر میں تیر اپنے بجھا کر
بے چوک نشانہ لیا چِلّے میں چڑھا کر
سرحد کو چلے موت کے اُڑتے ہوئے پیغام
ہمسایوں کو چن چن کے دیے زہر بھرے جام

واپسی پر وہ پھر ماسکو گیا، پھر سلسلہ جنبانی کی، روکھے پن کے برتاؤ سے دل شکستہ، پیٹرسبورگ واپس آیا "ادبی اخبار" (Литературная газета) نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈِلوگ اس پرچے کا اڈیٹر اور سارے ہم خیال اس کی پشت پر تھے۔ پوشکن نے "نقیب ماسکو" کے علاوہ "ادبی اخبار" کے بنانے اور اُبھارنے پر بھی بڑی محنت کی۔

قریب قریب دو برس کی اُمیدواری کے بعد، منظوم خطوط کے ذریعہ درجہ حرارت قائم

رکھنے کے بعد آخر ۵ رمئی ۱۸۳۰ء کو بات پکی ہوئی اور چھ مئی کو نتالیا نکولائیونا گنچاروواسے پوشکن کی منگنی کا اعلان ہوگیا۔ مگر ابھی شرطوں کی تعمیل باقی تھی۔ شرطیں یہ کہ پوشکن کو سرکار کی طرف سے نیک چلنی کی سند ملے، بدنامیوں اور رسوائیوں سے نجات ہو، کوئی آبائی جائداد اس کے نام ہو، لڑکی کے خاندان کو خاص شاہی فرمان کے ذریعے بعض سہولتیں ملیں۔ شاعر اپنی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ یا منصب حاصل کرے۔ ان شرطوں کی تعمیل میں زود رنج شاعر کو اتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کہ دو ایک بار منگنی ٹوٹنے کی نوبت آگئی۔

ایک طرف تو پوشکن اہل قلم نوجوانوں کی جو خود کو انقلابی کہتے یا سمجھتے تھے ——— طنزیہ اور تنقیدی تحریروں کا سامنا کر رہا تھا، دوسری طرف جرنلزم اور ادب میں حکومت کا ایک تنخواہ دار مخبر بلہارین (Булгарин) اپنے پورے گروہ سمیت اس پر حملہ آور تھا، پھر اُجلا خرچ، مہنگے ہوٹل کی رہائش[1]، پُرانے معاشقوں کا نباہ، نئی اخباری مصروفیتوں کی کشمکش اور پھر شہری زندگی کے ہاتھوں فن کارانہ خلوت کی لوٹ۔ اِن دنوں کی مختصر نظموں میں پوشکن کے ہاں سوز و درد کی، کسی قدر مایوسی کی، اور بے زاری سے ہاتھ جھٹک دینے کی کیفیت طاری ہے۔ "ٹھکانا ہو کہیں میرا"

(Брожу ли я вдоль улиц шумных ?)

کبھی سڑکوں کے شور و شر میں، ہنگاموں میں آوارہ
کبھی مَیں اور عبادت گاہ کے مجمع کا نظارہ
کبھی جا بیٹھتا ہوں سر پھرے ان نوجوانوں میں
مگر میں اپنی ہی دُھن میں ہوں، گم اپنے گمانوں میں

کبھی کہتا ہوں، ماہ و سال بہہ جاتے ہیں پانی سے
بچھڑ کر دوستوں سے کس قدر لاچار بیٹھے ہیں
گزرنا ہے ہمیں بھی اس کمانِ جاودانی سے
"بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"

---

[1] رہنے سے لفظ رہائش لغوی اعتبار سے غلط ہے۔ لیکن اس کے ہم وزن کوئی اور لفظ ہے بھی نہیں۔

یہ برگد، دیکھتی ہیں جس کو مجھ ناشاد کی آنکھیں
تنِ تنہا، درختوں کے کُنَم کا مورثِ اعلا
یہ میرے عہدِ رفتہ کا تماشا دیکھنے والا
اِسی برگد نے دیکھی ہیں مرے اجداد کی آنکھیں

کبھی جو پھول سے بچّے کو لے لوں، گود پھیلائے
خیال آتا ہے، کہہ دوں: لے مبارک تجھ کو یہ کیاری
یہ جلوہ اب ترے حصّے کا ہے، ہم بھر چکے باری
چمن میں میرے مُرجھانے، ترے کھلنے کے دن آئے

کبھی میں سوچتا ہوں: موت برحق ہے، مُقدر ہے
صبح سے شام ہوتی ہے، گزر جاتا ہے یوں دن بھر
اسی اک فکر میں ڈوبا ہوا رہتا ہوں میں اکثر
ذرا دیکھیں تو کس دن، کون سا لمحہ مقرر ہے!

نہ جانے کس جگہ میرا اَجل کا سامنا ہوگا
کہیں میدان میں، لہروں میں یا گھمسان کے رَن میں؟
بھلا کیا جانیے، نزدیک ہی وادی کے دامن میں
اجل کو سردِ خاکستر کا دامن تھامنا ہوگا؟

غبارِ راہ کو کیا ہے، ٹھکانا ہو کہیں میرا
ہُوا جب جسم بے جاں، کوئی مٹی ہو، کوئی نگری
مگر اک آرزو تھی: مجھ کو پیاری ہے مری نگری
جب آنکھیں بند ہو جائیں، سرھانا ہو یہیں میرا

سرہانے زندگی کچھ گُل کھلائے، رنگ بھر جائے
زمیں بے مہرِ فطرت سبز کر دے، ڈال دے بیلیں
جوانوں کے پرے گھوما کریں، بچے یہاں کھیلیں
ہمیشہ مسکرائے حسن اور مٹی سنور جائے

کچھ دن بعد ہی "شامِ زندگی" (Evening Elegy) شائع ہوئی جس میں آس نراس کی کشمکش بالآخر ایک توقع پر تمام ہوتی ہے:

اب نہ وہ دَورِ جنوں ہے، نہ وہ محفل کی بہار
بوجھ سینے پہ ہے میرے شبِ رفتہ کا خمار
روح میں ہے غمِ ایام بھی صہبا کی نظیر
جس قدر دیر کیے بڑھتی ہے نشے کی تاثیر
راہ دشوار ہے میری، غم و محنت کا عمل
اک پُرآشوب سمندر ہے، مچی ہے ہلچل
موت کیا چاہوں کہ جینے کے ہیں ارمان مجھے
ربط ہے فکر سے بھی، غم کا بھی عرفان مجھے
اپنے افکار میں، دنیا کے ستم سہنے میں
زیست کا لطف ارے شعلہ بجاں رہنے میں!
کبھی آواز کی لہروں میں ملے دل کو سُرور
اور کبھی یوں ہی کسی بات پہ اشکوں کا وفور
کیا خبر، جب ہو مری عمر کی ڈھلتی ہوئی شام
عشق دے جائے تبسم کا کوئی آخری جام!

انھی دنوں اس نے "فن برائے فن" کے نظریے کی تبلیغ شروع کی؛ اسے بالکل ہی دوسری صفوں سے اپنے حلیف ملنے لگے اور پچھلے کئی حلیف حریف بن گئے۔ اگست (۱۸۳۰ء) تمام ہو رہا تھا، خزاں کا رنگ

فضا میں بکھرنے لگا تھا کہ پوشکن اجازت لے کر اپنے آبائی گاؤں بولدی نو (Болдино) پہنچا۔
گیا تھا اس خیال سے کہ باپ نے شادی کے مصارف کے سلسلے میں بولدی نو کی جاگیر کا ایک حصہ اس کے نام کرنے کا وعدہ کیا ہے اسے دستاویزی شکل دے، جاگیر کا انتظام دیکھے، وہاں کالرا پھوٹ پڑا۔ اور قرنطینہ کی پابندیوں نے اسے یہیں خزاں کے تین مہینے گزارنے پر مجبور کر دیا۔

وبائی حالات اور آبائی دیہات نے پوشکن کے دل و دماغ پر کیا ستم نہ توڑا ہوگا مگر جس دن وہاں سے رہائی ہوئی، شہر آتے ہی اپنے ہم قلم دوست اڈیٹر پلیتنیف (Плетнев) کو بڑے جوش وخروش سے خبر دیتا ہے:

"دیکھو کیا کیا لایا ہوں "اَنے گن" کے آخری باب ..... پریس بھیجنے کے لیے بالکل تیار۔ ایک طویل منظوم افسانہ مُثمّن (Октавии) جو اپنا نام دیے بغیر شائع کراؤں گا۔ کئی ڈرامائی مناظر یا یوں کہو چھوٹے المیہ (ڈرامے) یعنی کنجوس ایر، موزارٹ اور سلیری، پلیگ کی وبا میں دھوم کی دعوت، اور دون جوآن[1] ان کے علاوہ کوئی ۳۰ مختصر نظمیں، خوب؟ اور ابھی فہرست تمام نہیں ہوئی۔

درازمیں صرف تمھیں سے کہنا ہے) نثر میں پانچ طویل افسانے لکھے ہیں ..... وہ بھی ہم مصنف کا نام دیے بغیر چھاپیں گے۔ میرا نام دینا مناسب نہیں ورنہ وہ بلہارین کیڑے نکالے گا۔"

ان عذابوں میں رہ کر کوئی شخص اتنا نقل نہیں کر سکتا جتنا پوشکن نے لکھ لیا۔ شاید آزمائشوں کی بھٹی میں اس کی روح پگھلتی رہتی تھی اور خلوت میں یکسوئی کے ساتھ وہ پگھلی ہوئی دھات کو طرح طرح کے سانچوں میں ڈھال لیتا تھا۔

یہ محض قیاس نہیں، پوشکن خود بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ ۱۸۳۱ء کی شروع تاریخوں میں جوان ڈلوگ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ شاعر کا بیان ہے کہ ایک وہی رہ گیا تھا میرا مونس و ہمدم، دنیا میں سب سے زیادہ عزیز، ۱۲ر جنوری کے ایک خط میں اور اس کے چند روز بعد شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں ۱۰ر فروری کو لکھا:

"میں بالکل سرد مہری سے دیکھتا ہوں اس صورت حال کے نفع نقصان کو، جو خود میں

---

[1] "Don Juan" کی روپ ریکھا کئی شعرا نے پیش کی ہے، خصوصاً بائرن نے، پوشکن نے پتھر کا مہمان (Каменный гость) کے نام سے اس قصے کو نئی شکل دی۔

نے اپنے لیے چُنی ہے۔ نوجوانی شور و شغب میں، لاحاصل گزر گئی۔ آج کے دن تک میں زندگی کی روشِ عام کے خلاف چلا، اس کے برخلاف جیا۔ "شادمانی صرف عام ڈگر پر [کھڑی] ملتی ہے"۔ میں اب ۳۰ سال کا ہو گیا۔ اس عمر تک لوگ عموماً شادی شدہ ہو جاتے ہیں۔ میں بھی اب اوروں کی طرح اس سمت میں بڑھتا ہوں۔ شاید پچھتانا نہ پڑے۔ . . .
اسی لیے کسی ترنگ کے بغیر نوجوانی کی سی اُمنگ کے بغیر شادی کر لوں گا۔ مستقبل کی تصویر میرے لیے گلاب کی سی خوش آئند نہیں ہونے والی سخت احتیاجوں میں گزرے گی۔ غم میرے لیے کوئی انہونی بات نہیں وہ تو روزمرہ کا خانگی معمول ہیں، البتہ جو بھی خوشی میسر آئے گی، وہ انہونی ضرور ہو گی"۔
ہم قلم، ہم خیال، ہمسر دوست کی موت پر غمزدہ، پُر شکن گرراں لمحات میں اُداس رہنے کے باوجود کسی وقت بھی اُمنگوں بھرے ارمانوں سے خالی نہیں رہا۔ اوپر کے تعزیتی خط سے صرف چند ہفتہ پہلے وہ پیٹرسبورگ کے بازار سے گزر رہا ہے۔ مصوری نمائش میں ایک تصویر دیکھتا ہے "میدونا" کی۔ ایک ارمان چمک اٹھتا ہے اور وہیں کھڑے کھڑے نظم نازل ہوتی ہے جسے وہ خط کی صورت میں اپنی منگیتر نتالیا گنچاروا کو ڈاک سے بھیج دیتا ہے:

کبھی تمنا نہ تھی کہ میں اپنا گھر سجا لوں
پُرانے وقتوں کے شاہکاروں کو چُن کے دیوار و در سجا لوں
جو آئے تکتا رہے وہ پہروں، بڑی توجہ سے دیکھے بھالے
کہ جیسے اہلِ نظر ہی ہیں پر لکھنے والے۔
یہ آرزو تھی کہ میرے گھر میں جہاں مشقت ہے ریشہ ریشہ
بس اک تصویر روبرو ہو، اسی کو دیکھا کرے دل ہمیشہ
شبیہِ دوشیزہ حسنِ مریم، مسیحِ پاکیزہ ابنِ مریم
نگاہ ایسے اٹھے کہ رنگوں کے پیرہن میں نہیں، وہ بادل میں ہیں مجسم
وہ دونوں قُدسی صفات چہرے، کیے ہوئے نور اُن کا ہالہ
جبیں پہ عظمت، نظر میں معصومیت کا جادہ
نہ ہو ملائک کا دخل، نخلِ "زیون"[1] کے سائے میں ہوں وہ تنہا

---

[1] پہاڑی پر وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی Zion

مراد بر آئی دل کی — پروردگار نے تجھ کو میری خاطر
زمیں پر نازل کیا، سنوارا یہ روپ دے کر مری "میدونا"
لطافت و دل کشی کا پیکر، نفاست و حسن کا نمونہ

پوشکن کا یہ ارمان پورا ہوا اور ۱۸ فروری ۱۸۳۱ء کی دوپہر کو ماسکو کے ایک پرانے چرچ میں شادی انجام پا گئی۔ آدھا شہر یہ تقریب دیکھنے ٹوٹ پڑا تھا۔ چھ دن بعد اس نے پلیتنیف کو اپنا تاثر لکھ دیا: "اب میں شادی شدہ ہوں، شاد ہوں، اب اگر کچھ آرزو ہے تو یہ کہ زندگی میں ردّ و بدل نہ ہو۔ اس سے بہتر کی توقع نہیں رکھتا۔ یہ کیفیت میرے لیے اس قدر انجانی ہے گویا میں نے نئے سرے سے جنم لے لیا۔"

"ایوگے نی انے گن" منظوم ناول میں ہیروئن تاتیانا کی خیالی تصویر — تاتیانا آیا کے ساتھ

آٹھواں باب

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ
گوہرِ ہر سُود در جیبِ زیاں انداختہ

(عرفی[1])

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ پوشکن جیسا باکمال فنکار اور خار در پیرہن نہ رہے، زندگی اپنی بخشی ہوئی نعمتوں کا حساب طلب نہ کرے!

۱۸۳۱ء اس کے لیے انتہائے غم اور انتہاہ راحت۔لیے ہوئے آیا۔ ایک طرف ڈلوگ کی موت سے "نقیب ماسکو" کی اُٹھان پر اور پورے حلقے کی ذہنی تربیت پر اثر پڑا۔ پرچہ بند ہوگیا۔" ادبی اخبار" کو حکماً بند کردیا گیا۔ دوسری طرف نتالیا گنچاروا اب نتالیا پوشکینا ہوگئی۔ منظوم ناول "ایوگے نی انے گن" کی مکمل اشاعت نے، جو، سال سے قسطوں میں چھپ رہا تھا، پورے ملک کے تہذیبی حلقوں میں دھوم مچادی — اور ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں دوہرے رنگ تھے؛ تفصیل اس کی یوں ہے:۔

پوشکن نے شادی سے پہلے ۴۵ ہزار روبل میں اپنی جاگیر رہن رکھ دی تھی اس میں سے گیارہ ہزار تو جہیز کی تیاری کے طفیل ساس کے حوالے کیے، باقی سے پرانے قرضے سود در سود ادا ہوئے، نہ جاگیر ہاتھ میں رہی، نہ رقم۔ ادھر باپ کا ہاتھ تنگ تھا، ادھر سسرال والوں کی آمد و رفت، رنجشیں، شاہی خرچے، پھر مہمان داریاں شاعر نے خیریت اسی میں دیکھی کہ ماسکو سے کنارہ کرکے پیتر سبورگ کے باہر شاہ دیہہ (زارسکوئے سیلو) میں پڑاؤ ڈالے جہاں کبھی لڑکپن گزارا تھا۔ مئی کے آخر میں روانہ ہوا، اکتوبر تک یہیں رہا — روس میں کالرا پھیلا ہوا تھا؛ بادشاہ سلامت بھی اپنے تمام جھام اور اعیانِ مملکت کے ساتھ یہیں سنہرے در و دیوار اور فواروں والے گرمائی محل میں منتقل ہوگئے۔ ژوکوفسکی ان کے ہمراہ تھے۔ روز کی محفلیں جمنے لگیں۔ آتشبازیاں چھوٹیں، سرکس

---

[1] فارسی شاعر عرفی شیرازی کے اوّل قصیدے کا مطلع ہے۔ کہتا ہے کہ اے وہ جس نے درد کا سرمایہ روح کے بازار میں رکھ دیا ہے اور ہر ایک نفع کا موتی نقصان کی جیب میں ڈال رکھا ہے۔ یعنی اس عالمِ اضداد میں جہاں روح دئیں درد اور جہاں نفع دئیں نقصان۔

تماشے، ڈرامے، اوپیرا اور بال روم کی رونقیں۔ پوشکن اور اس کی بیوی کو ہر جگہ سے دعوت آتی اور شاہی دعوتوں میں تو خصوصیت سے بلائے جاتے۔ وہ اپنے وقت کا بے مثال شاعر، یہ پائے تخت کی بے مثل حسینہ، دونوں وارثِ تاج وتخت کے "پسندیدہ"۔

شاہی پسندیدگی کا ایک نیا سبب پیدا ہوگیا تھا (ایک نہیں ـــــ دو)

۳۱ - ۱۸۳۰ء میں فرانس اور پولینڈ میں سیاسی ہلچل ہوئی۔ پولینڈ، جو سلاف نسل اور قدیم تاریخی بندھنوں کے سبب روس کا اکثر حلیف اور بعض اوقات حریف رہا، جرمنی کے سینے پر روس کی بھری ہوئی پستول کی طرح دھرا تھا جو ناچاقی کی حالت میں کسی وقت بھی داغی جا سکتی ہے۔ پولینڈ کے درمیانی طبقے اور اکثر آزادی پسند نوجوانوں نے بغاوت کردی اور روس سے اپنا ناتہ توڑ لیا۔ باغی فوج نے بڑھ کر بیلوروس اور یوکرین کے بعض علاقوں پر پولینڈ کا دعوا قائم اور علم بلند کردیا۔ یوروپ میں، جہاں جہاں روسی غلبے کے خلاف غصہ تھا، پولینڈ کی تائید میں جلوس نکلنے لگے۔ پیرس میں اسے پولینڈ کی تحریک آزادی کی کامیابی کہا گیا۔ وہاں کی سینٹ نے ایک گرما گرم ریزولیوشن پاس کردیا جس میں روس کی غاصبانہ دھاندلی کی طرف اشارے تھے۔

ایسے وقت خود روس کے آزادی پسند، دانش وروں اور جمہوری روشن خیالوں نے عالی ظرفی اور بلند نظری کا ثبوت دیا۔ انہوں نے اس "اینٹی روس" تحریک کو خود روسی جمہوری تحریک کا دست و بازو شمار کیا۔ انقلابی شاعر اوتیفسکی نے (جو پوشکن کو سائبیریائی جلا وطنوں کی طرف سے جواب دینے کی جرأت کر چکا تھا) وارسائی بغاوت کو لبیک کہا کہ روسی اور پولش عوام کا مقصد اور منزل ایک ہے۔ روس زار کا نہیں، ہمارا بھی ہے اور ہم اس بغاوت کا، جو انقلاب کی پیش رو ہے، استقبال کرتے ہیں۔ اس زمانے کے بہترین روسی اہل قلم، ہیرتسن Герцен اور اگاریوف (Огерев) نے وارسا کو مبارکباد کے پیغام بھیجے کہ اس طرح ایک دن روس میں بھی انقلاب برپا ہوگا۔

روسی نوجوانوں میں ان دنوں پھر بے چینی پھیل گئی تھی اور دسمبریوں کی دبائی ہوئی چنگاری کو ہوا ملنے لگی تھی۔

پوشکن، جو پیتر اعظم اور موڈرن روس کے تاریخی کاغذات کھنگالنے میں مصروف اور درباردار دوست ژوکوفسکی کا شرمندہ احسان تھا، ان واقعات سے اس کے امیر ابن امیر ہونے کا شعور جاگا یا قوم پرستی کی رگ پھڑک اٹھی کہ چھوٹتے ہی پے در پے تین زوردار نظمیں داغ دیں،

روس پر کیچڑ اچھالنے والوں سے خطاب ـــــ مقدس قبرستان کے حضور میں

جنگ بورودینو کی سالگرہ پر [1]

---

[1] ماسکو کے باہر بورودینو کے بڑے میدان میں نپولین اور کوتوزوفسکی (Кутузовский) خط نوٹ جاری

تینوں کا مدعا یہ تھا کہ الزام تراشنے والے روس کی عظمت کے حاسد ہیں، یہ تو ہم سلاف لوگوں کے آپس کا معاملہ ہے، باہر کی قوموں کو بولنے کا کیا حق! باہر سے دخل اندازی کرنے والے جانتے نہیں کہ روس، جس نے نپولین کے چھکے چھڑا دیے، پھر ایک بار وارسا پہنچ کر اپنے جوانوں کے لہو کا حساب بے باق کر دے گا۔[1]

ان نظموں میں زار شاہی روس اور خود زار کی قوت و عظمت کا پہلو بھی نکلتا ہے[2]

زار نکولائی کچھ اس وجہ سے بھی پسیجے۔ جولائی میں پوشکن نے وزیر داخلہ بینکن دورف کی معرفت درخواست گزاری کہ ایک تو مجھے سیاسی ادبی رسالہ شائع کرنے کی اجازت دی جائے، دوسرے پیتر اعظم سے پیتر سوم تک کے عہد کی مفصل تاریخ لکھنے کے لیے سرکاری محافظ خانے کے دروازے مجھ پر کھولے جائیں۔ پہلی درخواست زیر غور رہی، دوسری اس شان سے منظور ہوئی کہ شاعر کو گمان نہ ہوگا، حکم ہوا کہ وزارت خارجہ میں (جہاں سے ۷ برس پہلے برطرف کیا گیا تھا) ایک اعلا عہدے پر مامور کیا جاتا ہے، ڈیوٹی کچھ نہیں، تنخواہ پانچ ہزار روبل سالانہ اور وزارت کے ایک عہدہ دار کی حیثیت سے محافظ خانے کے ہر ایک ریکارڈ تک اس کی رسائی ہوگی۔

زار دیکھ رہا تھا کہ کل کا باغی، آتش فشاں شاعر "سیدھے راستے" پر آرہا ہے، جمہوریت پسند نوجوان اور اہل قلم دیکھ رہے تھے کہ شاعر کو دھوپ نہیں، یہ سایہ جلا ڈالے گا۔ پوشکن اس دھوپ چھاؤں کے معاملے کو کسی اور ہی رنگ میں دیکھتا ہوگا۔ بس اتنی آسائش کہ فنکار جی لگا کر اپنا ہمیبرانہ فریضہ انجام دے سکے۔ زندگی کے باقی ۶ سال اس نے انتہائی شدید فنی جدوجہد اور ذہنی کشمکش میں بسر کیے مگر ارادے، جو اردوں کی پُر پیچ راہ کاٹتے رہتے ہیں، اس کی راہ بھی روکے کھڑے تھے۔

پوشکن بہت دن سے اس فکر میں تھا کہ ذہنوں کی تربیت اور نثر کے فروغ کے لیے محض ادبی سرگرمی کافی نہیں، وہ "ادبی اخبار" کو سیاسی ادبی زندگی کا آئینہ بنانا چاہتا تھا؛ ۱۸۳۲ء کی گرمیوں میں جب اس قسم کا پرچہ نکالنے کی اجازت ملی تو پتہ چلا کہ ارادے اور اجازت دونوں سے کام نہیں چلنے والا، ایسے اہل قلم اور اہل نیر بھی درکار ہیں جو روپے سے مدد کر سکیں اور ہم خیال ہوں۔

اس تلاش میں وہ جا بجا گھومتا پھرا۔ ماسکو یونیورسٹی بھی گیا۔ کل تک جو مخالف تھے، ان سے بھی ملا۔

کی فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا تھا (۱۸۱۲ء) آج تک اس کی سال گرہ منائی جاتی ہے۔

[1] مئی اور جون ۱۸۱۳ء میں پولینڈ کے محاذ پر روسی لشکر کو کئی مقابلوں میں ناکامی کا سامنا ہوا۔

[2] اس پر روشن خیال حلقے اور انقلابی نوجوان اہل قلم نے پوشکن کو طنز و ملامت کا نشانہ بنایا کہ وہ سرکار پرستی میں مبتلا ہو گیا۔

مخالفوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ یہیں پاویل نشچوکن (П. Нащокин) سے ملاقات ہوئی جو آخری برسوں میں بہترین پشت پناہ ثابت ہوا۔ باتوں باتوں میں نشچوکن نے کسی استروفسکی کا قصہ سنایا جو اپنے ایک ضدی اور جابر تعلقہ دار ہمسائے کی دھاندلیوں کے سبب زمین جائیداد سے محروم ہوا اور بعد میں سارے علاقے کے لیے دہشت پسند ڈاکو بن گیا۔

پوشکن نے اپنے رومانی ناول " دبروفسکی (Дубровский)[1] کا نقش اول یہیں سے لیا۔ اس میں دو تین ڈرامائی منظر ڈالے اور تین مہینے کے اندر ناول کا مسودہ مکمل کر کے رکھ دیا۔ اشاعت کی باری کہیں شاعر کی موت کے بعد ۱۸۴۱ء میں آئی کیوں کہ وہ لکھ کر اس سے بے نیاز ہو گیا۔ دل تاریخی ناول نگاری میں اٹکا ہوا تھا۔

جن دنوں " دبروفسکی " ناول زیر تحریر تھا، اس نے میخائیلوفسکوئے، بولدنیو اور دوسرے دیہات سے چنے ہوئے " مغربی سلافوں کے گیت " مرتب کر لیے۔ اس سے پہلے کسی اہم ادیب نے یہ کام نہ کیا تھا۔ پوشکن نے نہ صرف یہ گیت جمع کیے، بلکہ ان کی روح، ان کا پس منظر، ان میں روتی بسورتی اور کھلکھلاتی زندگی بھی محفوظ کر لی۔ عجب نہیں کہ انھی گیتوں کے موضوع نے، ایک ایسی کنواری ماں کا تصور ابھارا ہو جسے اس کے وقتی عاشق نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ رُسالکا (Русалка) یا جل پری کا یہی موضوع ہے۔[2]

۲۴-۱۸۲۳ء کا زمانہ انتہائی سختیوں، پریشانیوں اور نئی لگن کا دور ہے ــــ اور اسی کے ساتھ پوشکن کا

---

[1] یہ ناول اردو میں اسی نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (پروگریس پبلشرز - زوبوفسکی بلوار - ماسکو)

[2] میرسکی نے اس منظوم (اور نا تمام) ڈرامے کا اصل سرچشمہ ویانا کے ایک طربیہ اوپیرا Das Donauweibchen. کو بتایا ہے، پھر خیال ظاہر کیا ہے کہ روسی زبان کا پرانا قصہ، جو ڈرامہ نگار استروفسکی نے " Snegurochka " کے نام سے لکھا، وہاں سے موضوع لیا ہوگا۔ تاہم پختگی، سلاست اور سوز بیان میں اس ڈرامے کا جواب نہیں۔ پروفیسر سلانیمسکی نے اول یہ بیان نقل کیا کہ جرمن قصے کی بنیاد پر کراسنا پولسکی نے دنیپروسکایا رُسالکا (Днепровская Русалка) ایک لبریٹو لکھا تھا۔ پھر اسے رد کیا کہ پوشکن کی رُسالکا کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ تو روسی جن گان کی بحریں (رنگ رنگی یا مب) انہی کی بنیاد پر " خالص روسی نوٹنکی ہے " ماہر پوشکنیات دمیتری بلاگوئے نے اس پر زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں، لیکن ۱۹۷۴ء میں د۔ بیلکن کی تحقیق (سوویت لینڈ ۱۱۔ دہلی) سے اس نتیجے پر پہنچنا غلط نہیں کہ شاعر نے " رُسالکا " لکھنے سے پہلے " شکنتلا " (کالی داس) کا مطالعہ کیا تھا اور وہی اس کا اصل سرچشمہ ہے۔ ظ۔ ا

ذہن اپنی آخری بلندیوں کو پہنچ کر، بہترین نثری کارناموں کی عمارت چن کر ایک ایسی جاں گداز صورت حال میں گرفتار ہو جاتا ہے جس میں کسی بڑے فن پارے کی تخلیق یا تکمیل ممکن نہیں ہوا کرتی۔

شاہی درباروں اور درباریوں میں آمد و رفت، آمدنی سے بڑھا ہوا خرچ، امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ، ہم چشموں کے بیچ کے اور ان میں ممتاز رہنے کے جتن، یہ سب ایک طرف اور بادشاہ سلامت کی وہ نگاہ کرم جو شاعر کو اپنے شانوں پر سے نتالیا کی طرف پھسلتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی، پھر سنسر کی پابندیاں ادبی دشمنوں کی ریشہ دوانیاں، تنقیدی اور تاریخی مضامین کو نیا معیار اور سماجی وقار عطا کرنے کی بیقراری ان تمام پیچیدگیوں نے اس کا جینا دشوار کر دیا۔

"جھمیلوں میں پڑ گیا ہوں - میری شریک حیات فیشن کی بڑی دلدادہ - ان سب چیزوں کو چاہیے رقم - اور رقم ہاتھ آتی ہے محنت کر کے (ذہنی کاوشوں سے) ذہنی کاوش کو چاہیے خلوت و سکون...... بتاؤ، جیوں تو کیا کھا کے جیوں!...."

یہ خط فروری ۱۸۳۳ء کا ہے اور اسی نشچوکن کو لکھا گیا ہے جو آخری برسوں میں پوشکن کا دیوانہ تھا اور جیسے بن پڑتا شاعر کی دلداری کرتا رہتا تھا۔

۱۸۳۳ء کی انہی گرمیوں میں اس نے بیوی کو میکے بھیجا اور خود شہر سے ذرا دور پر" داچا "کرائے سے لے لیا۔ روزانہ وہ کاغذات کا پلندا بغل میں دابے سرکاری محافظ خانے کو جاتا، دن چھپے تک پرانی دستاویزوں پر آنکھیں ٹپکایا کرتا۔ اور شام ہوتے شمع اور رنگین گلاس روشن کر کے نوٹ تیار کرنے، خاکے بنانے اور بکھرے ہوئے اوراق جوڑنے میں جٹ جاتا۔ آخر اسے جاتی گرمیوں میں محسوس ہوا کہ تاریخی دستاویزوں میں سے ایک افسانوی طلسم کا تانا بانا بھی ابھر رہا ہے۔ یہی ہے جو روسی زبان کا پہلا نیم تاریخی ناول۔

کپتان کی بیٹی (Каиитаиская Дочка)

کہلایا، جسے مکمل ہونے میں ڈیڑھ سال نکل گیا اور بھرپور داد ملی بھی تو شاعر کی آنکھ بند ہونے کے بعد۔ انہی دنوں ایک مختصر مگر ہیبت انگیز ناول اور لکھا گیا" حکم کی بیگم " (*Пиковая дама*) جس کا نوجوان ہیرو، ہیرمن (Герцен) ایک داؤ سے دولت کمانے کی خاطر جذبات کی نرمی، تازگی، خلوص اور شرافت سب کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور کسی دولتمند بوڑھیا سے راز اگلوانے کے لیے اس کی نوعمر خواص پر محبت کے ڈورے ڈالتا ہے۔ دولت اس کا نصب العین اور ناپ تول (احتیاط) ہوشیاری اور جی توڑ محنت ـــ یہ ہیں ترپ کے تین پتے،

یوں کہنے کو یہ مختصر سا ایک گمبھیر ناول تھا، لیکن دنیا کی کوئی بڑی زبان، یہاں تک کہ اوپیرا اور فلم آرٹ بھی اسے اپنے دامن میں لیے بغیر نہ رہے ـــــ اس ناول کے کردار پرانی اور نئی دنیا، جاگیرداری اور سرمایہ داری اخلاقیات، نئے بیوپاری کرداروں کی بے رحمی اور بے مروتی کا گہرا مطالعہ اور باریک نقش ہیں۔ عجب نہیں کہ شاعر کو جن لوگوں سے مالی امداد کا طالب ہونا پڑتا تھا، ان کے برتاؤ نے یہ موضوع سُجھایا ہو۔

مگر پوشکن کو جانہار جواریوں اور ڈاکوؤں کی زندگی لکھنے کے لیے نہیں، روس کے عہد آفرین تاریخ ساز پیتر اعظم کے کردار کو اُبھارنے (اور یوں گویا پشتینی بادشاہت کا جاہ و جلال دکھانے) کی سرپرستانہ تنخواہ ملتی تھی۔

سرکاری محافظ خانے کے کاغذات سے نمٹتے ہی شاعر نے درخواست گزاری کہ پگاچیوف کی کسان بغاوت پر دستاویزیں دیکھ چکنے کے ساتھ ساتھ اب وہ ان مقامات پر بھی نظر ڈالنا چاہتا ہے جہاں بغاوت کی چنگاریاں شعلے بنی تھیں۔ درخواست کے علاوہ زبانی سفارشوں سے اس نے یہ مدعا بھی ظاہر کیا کہ بغاوت کی تفصیلات خود سرکاری پالیسی سازوں کے لیے بھی کارآمد ثابت ہوں گی۔ اجازت مل گئی۔

پوشکن اگست میں دو مہینے کے دورے پر نکلا۔ جنوب کی طرف، جہاں تاتاری، باشکیر، کرغیز قصبے تھے، ہوتا ہوتا یورال تک پہنچا، ارادہ تھا کہ سائبیریا کی طرف بڑھے، پرانے جلاوطن رفیقوں سے رابطہ قائم کرے، وقت نے وفا نہ کی اور پھر جا بجا خفیہ احکامات پہنچتے رہے کہ کڑی نظر رکھی جائے۔

خزاں کی جھڑی لگ گئی تھی کہ وہ سفر سے سیدھا اپنی آبائی جاگیر بولدی نو پہنچا، یہاں مطالعے اور براہ راست مشاہدے کے نچوڑ کا آمیزہ تیار کرنا تھا۔ یہاں چھ ہفتے جم کر، جی لگا کر، جو محنت کی اس کا حاصل تھا، پگاچیوف کی تاریخ "История Пугачёва" کہ جب وہ شاہی ملاحظے کے لیے پیش ہوئی تو یہ کہہ کر رد کر دی گئی کہ بھلا اَن پڑھ باغی کسانوں کی بھی کوئی تاریخ ہوتی ہے؟ آخر اس کا نام قرار پایا، "پگاچیوف کی بغاوت کی تاریخ"

شاید اس چند روزہ گردش میں پوشکن کا اُن "گنواروں" سے سابقہ رہا جو بے علم تو ہوتے ہیں، بے عقل نہیں اور جن کی باغیانہ تب و تاب کو پگاچیوف کی پھانسی اب تک بُجھا نہ سکی تھی۔ اس تاریخ میں، تمام احتیاطوں کے باوجود باغی کسان رہنما مظلوم رعایا کا ترجمان اور صاحب کردار ہیرو بن کر اُبھرتا ہے، جو کسر بھی وہ ناول میں پگاچیوف کی کردار نگاری نے پوری کر دی۔

بالدی نو نے پھر پوشکن کو یوں لوح و قلم میں مُنہمک نہیں دیکھا۔ انگریزی کے فرانسیسی ترجموں سے، اپنے ورق ورق پُلندے سے سر اُٹھاتا ہے تو دوستوں عزیزوں کو خط لکھنے بیٹھ جاتا ہے:

"...... آجکل میں والٹر اسکاٹ (Welter Scott) کے ناول پڑھ رہا ہوں،
بڑا لطف آرہا ہے۔ والٹر اسکاٹ اور انجیل دونوں کے مطالعے میں منہمک ہوں......"

تبھی والٹر اسکاٹ کے طرز کا ناول 'پگاچیوف کی بغاوت کا نیم رومانی' نیم تاریخی ناول "کپتان کی بیٹی" وجود میں آیا۔ یہیں اس نے پولینڈ کے قومی شاعر اور اپنے پرانے دوست آدم میتسکے وچ - Agam (Мицкевич کی دو نغماتی مثنویاں "Баллада" ترجمہ کیں، ایک زندہ جاوید قصہ، جو اس کے چھپیوں قصوں میں سب سے عمدہ تصور کیا جاتا ہے، "قصہ سونے کی مچھلی کا"۔ بطرز مثنوی مکمل نظم گرڑالا۔ نظم "انجلو" (Анджело) لکھی اور ان سب تحریروں پر مہر لگادی اپنی عظیم الشان طویل نظم "تانبے کا سوار" (Медный всадник) لکھ کر، جو پیتر اعظم کے جاہ و جلال، عظمت و جبروت کے سامنے کسی گمنام شہری "یے ؤگن" کا بے بس احتجاج ہے، سلطنت کے بالمقابل فرد کی پکار — نقار خانے میں طوطی کی آواز —

ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوشکن نے اس نظم کے بعد اور اس سے بڑھ کر کوئی فنی کارنامہ پیش نہیں کیا جو ۱۸۳۴ء تک کاغذ پر منتقل ہو چکا تھا — اور جب یہ کارنامہ تیار ہوا تو اس میں بانیِ اعظم کے لیے توہین کا پہلو نکلتا تھا جس میں پوشکن کو بار بار کتر بیونت کرنی پڑی۔

کسان بغاوت اور اس کی ہولناک ناکامی کی تاریخ تیار ہوئی تو مصنف اسے اپنے اہتمام سے شائع کرنا چاہتا تھا، رقم نہ تھی۔ نجانے کیوں کر، بہر حال شاہی خزانے سے 'خاص فرمان کے ذریعے ۲۰ ہزار روبل کی خطیر رقم بطور امداد دی گئی — صرف رقم نہیں بلکہ ایوانِ خاص کے حاضر باشوں کی وردی بھی ملی: دھاری دار پتلون' اوپر تک کسا ہوا کوٹ، ترچھی مُنڈھی ہوئی ٹوپی۔ اِس وردی کا ایک عہدہ تھا جو بانکے نوجوانوں کے لیے مخصوص تھا "کامر یُنکر" (Камер юнкер) پوشکن نے پہننے کو یہ وردی بادلِ ناخواستہ پہن لی — مگر اس میں وہ خود کو سمو نہ سکا۔

مجھے یہ ملازمت قبول ہی نہ کرنی چاہیے تھی۔ اس سے بدتر یہ کہ رقموں کا بار اپنے سر لیا۔
خود پسندی یا احتیاج کے مارے دوسروں پر تکیہ کرنا ہمیں ڈبو دیتا ہے۔ اب یہ لوگ
مجھے اس طرح دیکھتے ہیں گویا میں کوئی چھوکرا ہوں — کہ جیسے جی چاہے' برتاؤ کرو — یہ
(بدسلوکی) نفرت کی نظر سے بھی بدتر ہے۔ لومونوسف کی طرح ' میں بھی خداوند عالم سے

بچے کسی کے آگے مسخرا بننا نہیں چاہتا۔

یہ جملے پوشکن نے ۸ جون ۱۸۳۴ء کو اپنی بیوی کے نام ذاتی خط میں لکھے تھے۔ اس سے پہلے کے خطوط میں بھی ناگواری کا رنگ کافی تیز تھا۔ ایک خط میں تو اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ تین بادشاہوں کو دیکھ چکا ہوں۔ ایک نے، جب میں اپنی آیا کی گود میں تھا، میری ٹوپی جھٹک کر پھینک دی تھی اور آیا کو ڈانٹا تھا، دوسرے نے تنخواہ بند کر دی تھی، تیسرے نے اس عمر میں "حاضر باشی" عطا کر کے سرپرستی فرمائی۔ چوتھے کی اب آرزو نہیں رہی، نہ تب تک زندہ رہوں گا، البتہ

دیکھتے ہیں کہ آئندہ ہمارا بچہ ساشکا اپنے ہمنام شاہزادے سے کیسے نبھاتا ہے۔ میں تو اپنے ہمنام بادشاہ سے نہ نبھا سکا۔ خدانخواستہ، کہیں وہ بھی میرے نقش قدم پر نہ چلے، کہ اشعار پڑھے جا رہے ہیں اور بادشاہوں سے تناتنی چل رہی ہے.....

ڈاک میں ایک ایک پُرزہ کھلتا تھا۔ جب ان خطوں کے جملے شاہی ملاحظے میں پیش ہوئے ہوں گے تو شاعر کی تقدیر کے محضر پر کس کس کی مہر لگی ہوگی، اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شاعر عجب گومگو میں گرفتار ہے۔ بیوی نے اپنی دونوں بہنوں کو ماسکو سے بلا کر گھر رکھ لیا۔ دونوں کی شادی کی عمر نکلی جا رہی تھی۔ تین بچے ہو گئے، دو بیٹے، ایک بیٹی، نوکر چاکر بڑھ گئے۔ ماں نے تقاضے کے خط لکھنے شروع کر دیے کہ باپ مقروض اور تنگ دست ہو چکے ہیں۔ ایسے وقت میں تمہاری طرف نظر اٹھتی ہے۔ دوست احباب میں پرانے وقتوں کے بعض بگڑے رئیس بھی شاعر کی ناموری اور "دولتمندی" سے کچھ توقعات رکھنے لگے۔ روز روز کے بال روم ڈانس، اور اونچی سوسائٹی کے چونچلوں نے مصارف بھی بڑھا دیے، مصروفیات بھی۔ آخر پوشکن نے ہر طرف سے قرض لینا شروع کیا۔ پہلے جائداد رہن رکھی، پھر گھر کے زیور۔ یہاں تک کہ قیمتی پوشاک گروی رکھنے کی نوبت آگئی۔ ۱۸۳۴ء ختم ہوتے ہوتے ساٹھ ہزار ۶۰,۰۰۰ روبل قرض چڑھ چکا تھا۔ اس نے آخری کوشش کی کہ درباری داری کے جنجال سے نکل جائے، دیہات میں رہ کر مطالعے اور فکر سخن پر بسر کرے، بیوی کو سمجھایا مگر وہ شاہانہ محفلوں کے آسمان پر چمکنے والا ستارہ" لطافت و دلکشی کا پیکر، نفاست و حسن کا نمونہ" اس کرب کو کیا جانے۔ آخر اس نے ایک سلگتی ہوئی نظم میں عرض حال یا اپیل کی:

چلو، مرے عزیز، وقت ہے، نکل چلیں! ہے دل کو عافیت کی جستجو
دنوں پہ دن اڑے چلے؛ ہر اک پہر، ہر اک گھڑی
اٹھا کے لے چلی مرے ترے وجود کی کڑی کڑی
نہیں ہے موت سے مفر، مگر ہمیں بہت ہے زندگی کی آرزو۔

خوشی کہاں زمین پر ، کچھ اپنا اختیار ، کچھ سکوں سہی
تھکے ہوئے غلام کو یہ فکر ہے ، جو یوں نہیں تو یوں سہی :
اٹھا کے اپنا بار اس طرف کہیں فرار ہو
جہاں لگن ہو کام کی ، وجود کو قرار ہو

اس نے جھنجھلا کر ملازمت سے استعفا دے دیا ۔ لیکن سدا سینہ سپر ژوکوفسکی اور دوسرے سنجیدہ رفیقوں کے سمجھانے بجھانے پر استعفا واپس لے لیا ۔ ہر طرف سے مجبور ہو کر اس نے سرکار کا دروازہ کھٹکھٹایا ، تین درخواستیں کی تھیں ، راجدھانی سے باہر رہنے کی طویل چھٹی ، ادبی سیاسی (آزادانہ) رسالہ شائع کرنے کی اجازت ، اور آدھی تنخواہ رہن رکھ کر ۳۰۰۰۰ ہزار روبل کا قرضہ ۔ پہلی درخواست نامنظور ، دوسری زیر غور ، تیسری قبول —— رقم خزانے سے مل گئی ۔ بڑے قرضے ادا ہو گئے ۔

ستمبر ۱۸۳۵ ء کے آخر میں وہ بیوی کو میخائیلوفسکوئے گاؤں سے ، جہاں خزاں بسر کرنے گیا تھا ، لکھتا ہے :

> ہماری مستقل آمدنی کچھ ہے نہیں مستقل خرچ البتہ ہے (سالانہ) ۳۰ ہزار روبل کا ...
> سرکار نے اخبار کی اجازت کا وعدہ کیا تھا ، اس پر روک لگ گئی ، مجھے پیٹرسبورگ میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور یہ سہولت نہیں دی جاتی کہ اپنی محنت پر بسر کر سکوں ۔ وقت نکلا جا رہا ہے اور ذہنی قوت برباد ہوئی جاتی ہے ۔ گاڑھے پسینے کی کمائی اپنے ہاتھوں لٹا رہا ہوں اور آئندہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ باپ نے جائداد بے مصرف بے حساب اڑا دینے کی ٹھان لی ہے ...... انجام نجانے کیا ہوگا ......

انجام میں اول تو یہی پیش آیا کہ ۳۵-۱۸۳۴ ء کے دونوں موسم لاحاصل گزر گئے ۔ ۳۶ ء کی بہار تک نظم و نثر میں کوئی ایسی تحریر کاغذ پر نہ اتری ، جو پوشکن کے ہم عصروں کی امیدیں پوری کر سکتی یا وقت کے برہم نوجوانوں کو چونکا سکتی ۔ زخم خوردہ شاعر اور تو سب کچھ سہہ گیا تھا ، روح سخن کی بے وفائی نہ سہہ سکا ، موت کا خیال اس پر طاری ہونے لگا ۔

۲۹ مارچ ۱۸۳۶ ء کو جب پیٹرسبورگ میں اس کی بیمار ماں کا انتقال ہوا تو شاعر کئی دن تک شب و روز تیمارداری میں مصروف تھا ۔ لاش وہاں سے خاندانی ہڑداڑ تری گورسکوئے (میخائیلوفسکوئے کے نزدیک) لے جائی گئی ۔ ماں کی لاش قبر میں اتارتے ہی پوشکن نے بھی اپنے لیے برابر میں قبر کی جگہ خرید لی ۔ اور قبر تیار رکھنے کی ہدایت کر دی ۔

نواں باب

کیا پوچھے ہے وجود و عدم اہلِ شوق کا
خود اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

"ملکہ زارینہ کی خواص، مس الیکساندرا روزیتی (Alexndra Rossetti) نے نتالیا کا ماتھا چوما اور آرام کرسی میں دھنس گئی۔ بیٹھتے ہی اپنا ایک دستانہ ہاتھ سے نکالا اور اس کا پنکھا بنا کر جھلنے لگی۔

"تمہارے شوہر گھر پر ہیں؟" الھڑ بیوی کے چہرے پر بڑی بڑی کالی آنکھیں جماتے ہوئے اس نے پوچھا۔

نتالیا کشیدہ کاری میں مصروف ایک نیچی کرسی پر بیٹھی تھی۔

"ہیں تو — تمہیں ان سے کیا؟"

"کیوں؟ جل گئیں؟" الیکساندرا نے سکون سے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ جب تمہارے الیکساندر (پوشکن) کو مجھ سے محبت نہیں تو میں بھی کوئی ان کے عشق میں مبتلا نہیں رہنے والی۔ تمہارا کیا جاتا ہے اگر میں اوپر جا کر ان سے مل لوں — اُن کا کلام سن لوں؟"

"مجھے تو وہ یہی جتاتے رہے ہیں کہ اِن معاملات کا عورتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا" نتالیا نے منہ پھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"لو، اور بھی ثابت ہو گیا کہ وہ مجھے عورت شمار نہیں کرتے۔" الیکساندرا نے وضاحت کی اور بولی:

"چلو، بس، نتالیا۔ نادان مت بنو۔ میں اوپر جاتی ہوں تمہارے شوہر سے ملنے"

وہ دھم دھم گلدان پھلانگتی، سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی اور دروازہ کھٹکھٹائے بغیر کمرے میں داخل ہوئی، پوشکن اونچی پشت کی لمبی آرام کرسی میں دراز تھا، اس کے بال صبح کے غسل سے بھیگے ہوئے تھے۔ کرسی کے اندر اس قدر دھنسا ہوا لیٹا تھا کہ چھریرا بدن اور بھی نازک بلکہ لاغر نظر آ رہا تھا۔ رسبری شربت کی ایک بوتل نظموں کی کسی قلمی کتاب پر نزدیک رکھی تھی کہ آسانی سے ہاتھ پہنچ سکے۔

"گڈ مارننگ، عزیز من" اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لیے اُٹھتے ہوئے پوشکن نے کہا — اے یہ شاہی محل کی "Demi Vierge" بڑی بڑی "میڈونا" جیسی آنکھوں اور مردانہ خصلت والی لڑکی دل سے

پسند تھی۔ اس کے سامنے حسین اور بے زبان نتالیا بے لطف معلوم ہوتی تھی۔ بادشاہ سلامت اس لڑکی کو الیکسانڈرا کہہ کر (بے تکلفی سے) پکارتے، ژوکوفسکی اور ویازیمسکی (جیسے پختہ کار) اس سے ادب پر بحثیں کرتے۔ عشق عاشقی کی کئی افواہیں اس کے دم کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ بڑی بے ڈھب لڑکی تھی۔ شائستہ دیوان خانوں میں بیٹھ کر روسی زبان بولنے سے اسے کوئی عار نہ تھا۔ "جہنم میں جائے وہ، پیاز کی سی باس آتی ہے اس میں سے" یہ اس کا تکیہ کلام تھا۔ سرکاری ڈنر کی میز پہ بے تکلف دوبارہ شوربے کی فرمائش کر دیتی۔ وہ ان چند عورتوں میں سے تھی جن کے ساتھ پوشکن ادب کے معاملات پر تبادلۂ خیال کر لیتا۔ روزانہ صبح پوشکن کے گھر کا پھیرا کرتی کہ کل رات جو لکھا ہو، اسے سنا ڈالے۔

الیکسانڈرا ابھی اپنے لباس کا کسا ہوا فیتہ کھول رہی تھی کہ الیکساندر (پوشکن) نے پانی کا گلاس غٹ غٹ پیا اور پڑھ کر سنانے لگا۔"

ایک یہ الیکسانڈرا تھی جس کی آمد شاعر کو گراں گذرتی تھی — ایک اور الیکسانڈرا گھر کے اندر موجود تھی، نتالیا پوشکینا کی بڑی بہن اور قریب قریب ہمشکل، جس نے خانہ داری کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں؛ جو شاعر پرست، سخن فہم اور ہمدرد ہونے کے باعث پوشکن کا اس درجہ خیال رکھتی تھی کہ باہر سے دیکھنے والے، اگر اجنبی ہوتے تو اسی کو شاعر کی رفیقہ حیات سمجھ بیٹھتے۔ بہنوں میں اسی بات نے مستقل شکر رنجی کی صورت اختیار کر لی تھی۔

پھر شہر میں صحبت یافتہ رئیس زادوں اور فن و ادب میں دخل رکھنے والوں کے دیوان خانے تھے جہاں نوخیز حسینائیں اور آزمودہ کار امیر زادیاں فنکاروں پر مہربان رہتی تھیں — پوشکن کی ہر جگہ رسائی اور پذیرائی تھی۔ پرانی "رسوائیاں" بھی ابھی تک چل رہی تھیں۔ جو بیوی کے کانوں تک پہنچتی ہوں گی — حسن اور اقتدار، دونوں، یوں بھی کان کے کچے ہوتے ہیں سبب جو بھی ہو، لیکن نتالیا میں اپنے کثیر الاحباب، انتہائی مصروف اور نسبتہً شکستہ حال شوہر کی طرف سے کسی قدر بے رخی بلکہ بدگمانی بڑھتی گئی — خود پوشکن کی ایک نظم سے ۱۸۳۲ء یہ اشارہ ملتا ہے:

ایک سانچے میں ڈھلا اور سڈول
جب میں آغوش میں بھرتا ہوں تمہارا یہ بدن
پیار کے نرم دلآویز سے بول
خود بخود تم کو سنا دیتے ہیں اس دل کی لگن
تم سُنی اَن سُنی کرنے والی

ڈھیلے ہاتھوں سے چھڑاتی ہو جھکتی ڈالی ؟
لب پہ آتی ہے کٹیلی مُسکان
ایسی مُسکان جو کہتی ہے کہ جھوٹے ہو سجن
یاد میں سینت کے رکھتے ہو پرانی باتیں
بے وفائی کی وہ سچ جھوٹ کہانی باتیں
نہ لگاوٹ، نہ توجہ، نہ جواب
بے رخی کی یہ اُدا، روپ کا یہ روکھا پن !
کتنے پُرکار تھے کمبخت، انہیں آگ لگے
اس خطاوار جوانی کے تھے ایسے لچھن !
باغ میں، رات کے سناٹوں میں
وہ ملاقات کے حیلے، وہ کسی کے درشن
کچے کانوں میں کبھی پریم کے منتر پھونکے
رازداری سے کہیں شعر بھی پڑھ کر پھونکے
کتنے عیار تھے، غارت ہوں وہ الفت کے جتن
پہلے تو لاڈ، پھر آنسو کی جھڑی، پھر ان بن۔

۱۸۳۵ء کے آخر میں رسالہ شائع کرنے کی اجازت ملی۔ طے کیا کہ سہ ماہی رسالہ نکلے۔ نام "معاصر" (سوورمینک Современник) پوشکن اپنے ہم عمر دوستوں اور ہم خیال نوجوانوں کے ساتھ رسالے کی تیاری میں لگ گیا اور جب اپریل ۱۸۳۶ء میں اس کا پہلا شمارہ نکلا تو روسی جرنلزم نے اپنی تاریخ کا وہ پہلا نمونہ دیکھا جو ظاہر و باطن، دونوں میں دنیا کی بہترین صحافت سے آنکھ ملا سکتا تھا۔ شدید محنت، گہری بصیرت، نفاست، ذہنی تربیت اور خیالات کی وسعت میں روسی ادبی صحافت ابھی تک اس مقام کو نہیں پہنچی تھی۔ اُبھرتے ہوئے فنکار گوگول کا طنزیہ، نوجوان غنائی شاعر تیوچیف کی ۲۷ نظمیں ژوکوفسکی کے منظوم ترجمے، تنقیدی نوٹ اور مضامین، پوشکن کی تازہ ترین تحریریں اسی پرچے میں شائع ہوئیں۔ پوشکن کو سوورمینک رسالے سے بڑی امیدیں تھیں؛ تیاری میں ہو پسینہ ایک کیا تھا، لیکن منافقوں اور مخالفوں نے، سرکاری کٹھ پتلی جرنلسٹوں اور ادیبوں نے، اس پرچے پر چُپ سادھ لی۔ رسالے کا انتظام بھی نہ سنبھل سکا۔ لگی ہوئی رقم تک واپس نہ آئی۔ پوشکن کو سال میں صرف چار شمارے نکالنے نصیب ہوئے، چاروں کاروباری لحاظ سے ڈوبے۔

ان پرچوں پر اگر تبصرہ ہوا بھی تو یہ کہ شاعر نے شاعری سے ہاتھ دھو لیے اور اب وہ محض ایک جرنلسٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ دراصل انہی شماروں میں پوشکن کی تنقیدی نظر، تاریخی بصیرت اور بے باک فلسفیانہ فکر اُبھر کر آتی ہے ـــ اُسے خود بھی اپنے صحافی یا مضمون نگار کہلانے میں کچھ عار نہ تھا۔ فکر تھی تو یہ کہ نوعمر بیلنسکی ایک تنقید نگار کی حیثیت سے گوگول افسانے اور طنز کے افق پر، تیوچیوف غنائی شاعری میں، کولتسوف بیانیہ اندازِ سخن کے ساتھ پوری قوت سے اُبھریں اور بے باک، لائق اہل قلم کی تربیت یافتہ نسل ادبی تہذیبی رہنمائی کی باگ ڈور سنبھالنے کے قابل ہو جائے۔

یہی کچھ ہُوا بھی، مگر سنسر کی سختیوں نے، مصارف کی زیادتی اور آمدنی کی کمی نے چو طرفہ محنت و مصروفیت کی شدت نے، کینہ پرور سازشی ماحول نے اُسے وہ دن دیکھنا نصیب نہ کیا۔

ان دنوں پوشکن کا جگر خراب ہو گیا۔ اکثر کھانسی اٹھنے لگی بیقرار آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے بایاں ہاتھ کوٹ کے اندر داہنی طرف سینے پر دھرا، گردن لٹکی ہوئی، چہرے کا سانولا رنگ مٹیالا، بال بکھرے اور لباس بے ترتیب رہنے لگا۔ بلیرڈ اور تاش کی محفلوں میں اسی طرح بے نیاز سا نظر آتا۔ پرانے خواجہ تاش للکارتے:

"آؤ ـــ پوشکن، ایک ایک بازی ہو جائے"

"نہیں"

"کیوں نہیں؟"

"قرض بہت چڑھ گیا"

"یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی! قرض تو ہم پر بھی ہے"

"جناب، آپ رئیس زادے ہیں۔ تین ہزار جانوں کی جاگیر رکھتے ہیں۔ میرا کیا۔ مجھے تو روسی حروف تہجی کے صرف ۳۲ حروف سے روزی پیدا کرنی پڑتی ہے"

۳۲ حروف سے جو روزی پوشکن نے پیدا کی، وہ تب تک کسی اہل قلم کو میسر نہ آئی تھی۔ لیکن انہی دنوں پے در پے تین واقعے ایسے ہوئے جنہوں نے روزی روزگار میں بھی کھنڈت ڈالی اور حروف تہجی بھی دھندلا دیے ـــ تینوں واقعات کا تعلق ایک ہی نوجوان سے تھا ـــ مردانہ حسن کے زندہ پیکر، فرانسیسی پناہ گزیں نووارد بیرن جارج دانتھیس BARON D' ANTHES سے۔

۲۴ سال کا یہ کڑیل جوان جب دو سال پہلے سفارشی خط لیے ہوئے روس میں داخل ہوا اور اسے براہ راست خاص شاہی دستے میں افسر کا عہدہ ملا، تبھی پوشکن کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ روس میں نیدرلینڈ کے سفیر بیرن ہیکرن (Baron L. D. Heekeren) نے اسے متبنّیٰ کر لیا۔ نہایت شستہ فرانسیسی لہجے

اور بانکپن کے ساتھ وہ جس محفل میں جاتا، صنفِ نازک کی چور نظریں اسی طرف بچھ جاتیں۔ نتالیا اور اس کی نظریں کئی بار ٹکرائیں۔ کچھ تو روباہ صفت سفیر کی چرب زبانی، کچھ یہ کہ بادشاہ سلامت اپنے خاص محافظ دستے میں غیر روسی افسروں کی موجودگی کو "زیادہ محفوظ" سمجھتے تھے، اس منچلے نوجوان کو شاہی خزانے سے ساٹھ ہزار ۶۰,۰۰۰ روبل کی رقم صرف سرو سامان کرنے کے لیے عطا ہوئی (جب کہ پوشکن جیسا شاعر اپنی تنخواہ سرکاری قرض میں گنوا رہا تھا) پھر ہر ایک محفل رقص و سرور میں، جہاں بھی نتالیا موجود ہوتی، دانتھیس کو بھی اس کے نزدیک دیکھا جانے لگا۔ فتنہ انگیزوں کو، جو پہلے ہی پوشکن کی "بدمزاجی" اور "خود پسندی"، "ہجو گوئی" اور "سرکشی" سے خار کھائے بیٹھے تھے موقع ہاتھ آیا۔ شاعر کے نام گمنام خط آنے لگے، خطوں میں بیوی کی بے وفائی کے طعنے دیے جانے لگے۔ پوشکن کو رہ رہ کے یہ خلش ستا رہی تھی کہ دانتھیس کے پس پردہ کوئی اور ہی کارفرما ہے۔ شہنشاہ کی یہ ضد کہ شاعر بلا اجازت پائے تخت سے باہر نہ جانے پائے، اور اسی کے ساتھ سرپرستانہ انداز، یہ اعزاز کہ اس کی بیوی شاہی ضیافتوں میں حاضر رہے — اسے ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی تھیں۔

۱۸۳۶ کا موسم خزاں ہے۔ پوشکن نے اپنے سہ ماہی رسالے کا دوسرا نمبر شائع کیا۔ صدائے برنخواست۔

۲۱ اگست کو اس نے اپنی زندگی کی تقریباً آخری نظم کہی: یادگار، جس میں احتجاج بھی تھا، دعوا بھی، فخر بھی۔

میں زمانے کو دیے جاتا ہوں ایسی یادگار
دستکاری کے نمونوں میں نہیں جس کا شمار
سبزۂ بیگانہ جس کی راہ میں اُگنے نہ پائے
جس کے آگے قصرِ شاہی کا منارہ سر جھکائے

میری ہستی کو بھلا کیا موت کر سکتی ہے پست!
"گو جسم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن"
چاندنی میں سانس لے جب تک کسی شاعر کا فن

سرزمینِ روس میں پھیلے گا اک دن میرا نام
ملک کی ساری زبانوں پر رواں ہو گا کلام

"فن" ہوں یا صحرا نشیں "قلیق" یا "تنگس" غریب
یا "سلاف" اسلاف کے خوددار بیٹے۔ خوش نصیب

یاد رکھیں گے محبت سے کہ تھا اک نے نواز
جس نے اکسایا شرافت کو، جگایا سوز و ساز۔
میں نے اِس کلجگ میں کھل کر گائے آزادی کے گن
تھی مجھے مجبور انسانوں سے ہمدردی کی دھن

سُن، مری جانِ سخن، فرمانِ یزداں سُن سدا
داد کی تجھ کو تمنا ہو، نہ ڈر بیداد کا
مت الجھ نادان سے، نافہم کو مت کر قبول
نیک نامی کیا ہے، بدنامی ہے کیا، دونوں فضول۔

اس کے چند روز بعد اپنے اسکول "لیزیم" کی ۲۵ دیں سال گرہ پر (۱۹؍اکتوبر ۳۶ء) جب وہ نظم پڑھنے کو کھڑا ہوا تو گلا شدتِ جذبات سے رندھ گیا اور وہ نظم تمام نہ کر سکا۔ یارانِ رفتہ کی اس یاد میں آپ بیتی کی تلخی بھی گھُل گئی تھی۔

۴؍نومبر ۱۸۳۶ء کی ڈاک سے تین گمنام خط پوشکن تک پہنچے جن میں اسے "مُکرّم ساق شوہر" کا خطاب[1] دیا گیا تھا۔ شاعر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دوسرے ہی دن اس نے دانتھیس کے منہ بولے باپ ہیکرن کو ایک نہایت اشتعال انگیز، توہین آمیز خط لکھ مارا جس میں ڈوئل[2] لڑنے کا چیلنج دیا گیا تھا۔

---

[1] "Ордена рогоносцев" یعنی ان لوگوں میں صاحب امتیاز جن کے سر پر بیویاں سینگ اُگا دیتی ہیں "سینگ دار" کی پھبتی اُن پر چپکائی جاتی تھی جن کی بیوی کسی اور سے اختلاط رکھتی ہو۔ ان میں سب سے بڑا نام ایک وزیر کا تھا جس کے متعلق اپنے پرائے سبھی یقین رکھتے تھے کہ وہ زار ایلکساندر کو اپنی بیوی میں شریک کرتا ہے۔ چناں چہ پوشکن کو ایک خط میں یہی اطلاع دی گئی ہے کہ ان موصوف کی صدارت میں کونسل نے یہ خطاب شاعر کے لئے تجویز کیا ہے۔

[2] DUEL کی رسم یورپ کے شرفا میں عام تھی کسی تحقیر کا انتقام لینے کے دونوں فریق کسی مقام پر اپنے اپنے وکیلوں سمیت پہنچ کر ایک دوسرے پر گولی چلاتے تھے۔ زخمی ہوتے یا مارے جاتے تو قانون اسے جرم شمار نہ کرتا۔ البتہ ثبوت ملنے پر فریقین کو ہلکی سی سزا دی جاتی تھی۔

ژوکوفسکی جب تیسرے دن پوشکن کو ٹھنڈا کرنے پہنچے تو یہ کورا جواب ملا :

اِس شخص کی حرکتوں نے میری زندگی میں دو سال سے زہر گھول رکھا ہے۔ اب اس قصے کو نمٹانا ہی پڑے گا۔ اگر میں نے ڈوئل میں اسے جان سے مار ڈالا تو مجھے سزا ہوگی، جلاوطن کردیا جاؤں گا۔ یہی میری آرزو ہے کہ کچھ ہو مگر پائے تخت سے دور نکل جاؤں۔ اور اگر اس نے مجھے مار دیا تو یوں نجات ہوجائے گی۔ وزیر مالیات کو میں نے لکھ دیا ہے کہ حکومت کا ۴۵ ہزار روبل قرض بقایا ہے۔ دو سو آدمی کی رعایا اور وہ گاؤں جو باپ نے شادی کے موقع پر میرے نام لکھا تھا، دونوں چھوڑتا ہوں، حساب بے باق ...... دوسرے قرضے بعد میں دیکھوں گا۔

یہی ژوکوفسکی ڈچ سفیر ہیکرن سے بات کرنے گئے تو پتہ چلا کہ پوشکن غلط فہمی میں مبتلا ہے، توجہ کا مرکز اس کی بیوی نہیں بلکہ بڑی سالی ہے ایکاترینا، جس سے دانتھس شادی کا امیدوار ہے۔ رشتہ منظور ہوا، چیلنج واپس لے لیا گیا۔ ۱۰ر جنوری کو شادی ہوگئی۔ شادی بہت ہی بے جوڑ تھی۔ چرچ میں لوگ اس قابل رشک حسین نوجوان اور اتری ہوئی دُلہن کے جوڑے کو عروسی لباس میں دیکھ کر صرف اس رعایت سے مسکرا رہے تھے کہ بہرحال یہ خونیں کفن کا بدل تو ہے۔

لیکن اب نتالیا اور دانتھس کی ملاقاتوں میں رشتہ داری کا حیلہ بہانہ بھی شامل ہوگیا۔ افواہ بازوں نے اس پر پھر گمنام خطوں کا طومار باندھا۔ کئی راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ کئی دن کمرے میں ٹہلتے بیت گئے۔ آخر اس دروغ مصلحت آمیز شادی کے عین ۱۵ دیں دن یہ واقعہ پوشکن کے علم میں آیا کہ جان پہچان کی ایک کینہ پرور عورت ایدالیا پولی تیکا (IDALIA POLITICA) [1] نے نتالیا کو اپنے گھر مہمان بلاکر خلوت میں دانتھس سے بھڑا دیا۔ اسی وقت قلم برداشتہ ایک ایسا زہرآلود خط بیرن ہیکرن کو لکھا جس کی سیاہی کو فریقین میں سے کسی ایک کا خون ہی دھو سکتا تھا۔

اس بار پوشکن نے بڑی رازداری برتی۔ رسالے کا کام حسب معمول کرتا رہا۔ نوجوان اہل قلم کو مشورے، ضروری خطوں کے جواب، ترجمہ کرنے والوں کو مسودے، بیوی کو پیار اور ملنے جلنے والوں کو ملاقات کا وقت دیتا رہا۔ اندر

---

[1] عجیب وغریب نام کی اس عجیب وغریب عورت کو پوشکن سے یوں بھی عداوت تھی کہ اس نے عشق کو رسوا کیا، مذاق اڑایا اور ایک ایسی عورت کو شریک حیات بنایا جس میں حسن کی دمک کے سوا کچھ نہیں دھرا۔ اسی عورت کی ایک رقیب لڑکی سے پوشکن کی منگنی بھی قریب قریب طے ہوچکی تھی۔ بعد میں ٹوٹ گئی۔ ادالیا پوشکن سے اپنا انتقام لینے کی تاک میں تھی اور اس نے یوں انتقام لے لیا۔

اندر اس نے اپنے لڑکپن کے ایک دوست کرنل دنزاس (Данзас) کو ڈچ سفارت خانے بھیج کر ڈوئل کی شرطیں طلب کرلیں۔ دنزاس ادھر روانہ ہوا، دن کے چار بجے تک پوشکن راجدھانی کی صاف ستھری جرمن بیکریوں اور فرنچ ریستورانوں کے سامنے گھومتا رہا۔ آخر دنزاس وہ خط لے کر جرمن کیفے وولف (Cafe Wolf) میں آ پہنچا۔ شرطیں تین تھیں :

(۱) فریقین کے درمیان بیس قدم کا فاصلہ؛ (۲) فریقین بھرے پستول تان کر پانچ پانچ قدم آگے بڑھیں گے اور پہلے سے مقررہ نشان تک بڑھ کر گولی چلائیں گے؛ (۳) فریقین کے وکیل گواہ اور ان شرائط کی تعمیل کے پابند رہیں گے۔

دن کے ڈھائی بجے اس پر ڈچ سفارت خانے کے اتاشی نے اور دنزاس نے دستخط کیے اور کوئی ساڑھے چار بجے شہر سے ذرا باہر ایک خود رُو پارک میں درختوں کی آڑ میں دونوں وکیلوں نے بیس قدم گن کر اپنے اوور کوٹ ڈال دیے۔ سردی بہت سخت اور ہوا کٹیلی تھی۔ راہ گیر دور دور نظر نہ آتے تھے۔ پوشکن نے اپنے حریف کو خطاب کر کے بے اختیار وہی جملہ کہا جو اس کے ناول "ایوگے نی انے گن" کے ہیرو کی زبان سے ایسے موقع پر ادا ہوا تھا "ذرا جلدی کیجئے جناب!"

وکیل نے آہستہ آہستہ اپنا ہیٹ سگنل دینے کے لیے جھکایا ہی تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ پوشکن نے، نجانے کتنے ڈوئلوں کے آزمودہ کار نشانہ باز پوشکن کے قدموں نے ابھی مقررہ نشان چھوا نہ تھا کہ حریف کی سنسناتی گولی اس کے پیٹ میں اتر گئی، وہ کوٹ پر گرا، پستول برف میں دھنس گیا لیکن فوراً خود کو سنبھال کر بائیں ہاتھ کا سہارا لیا، پکارا :

ٹھہرو، ابھی میرا وار باقی ہے۔

اپنے وکیل دنزاس کے ہاتھ سے دوسرا پستول لے کر بلبی دبادی۔ سامنے دانتھیس گرا۔ اور پوشکن نے بیہوش ہونے سے پہلے نعرہ لگایا — واہ وا، مارلیا!

مگر دشمن کا صرف بازو اور ایک شانہ زخمی ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر میں اُٹھ کر زخم بندھوانے میں مصروف ہوگیا۔ پوشکن کو برف گاڑی میں ڈال کر گھر لائے۔ بار بار اس پر بیہوشی طاری ہوتی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا بھی کہ چیخو، آہ کرو — اس سے شاید تکلیف کی شدت کم ہو — مگر وہ موت سے ذرا پہلے تک آہوں کو سینے میں گھونٹتا رہا۔ "میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ درد مجھ پر غالب آجائے"۔ اس کا خانہ زاد ملازم نکیتا، غم سے نڈھال تمام وقت اس کی پٹی سے لگا وہیں بیٹھا رہا۔ جہاں غمزدہ بیوی کو آنے سے روکا جا رہا تھا۔ آخری بار جب اسے ہوش آیا تو سوکھے ہونٹوں سے صرف اتنا کہا :

میری بیوی بے قصور ہے۔ اس نے اپنی جان روتے روتے ہلکان کر لی ہوگی۔ تم طفل تسلی میں مت رکھوائے۔ اگر دلاسا دیتے رہے، وہ صبر کر گئی تو دنیا بعد میں تہمتیں تراشے گی۔ زار سے کہنا کہ دنزاس کو سزا نہ دے۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ میں اسے راستے میں سے پکڑ کر ڈوئل کے میدان تک لے گیا تھا۔ میرے قاتل سے انتقام نہ لیا جائے۔

۲۹ جنوری کی صبح کو اس نے اشارے سے پوچھا، کون کون موجود ہے۔ معلوم ہوا ژوکوفسکی اور پرنس ویازیمسکی۔

اچھا، مادام کرامزین کو بھی بلاؤ[1]۔

شاہی ڈاکٹر نے شہنشاہ روس کا یہ پیغام پڑھ کر سنایا:

عزیز من، الیکساندر سرگے یچ، اگر ہماری قسمت میں یہاں آئندہ ملاقات نہیں لکھی ہے تو مابدولت آپ کی خطائیں معاف کرتے ہیں۔ اور آخری نصیحت یہ کرتے ہیں کہ آپ ایک مسیحی کی موت مرنا قبول کریں۔ اہل و عیال کی کچھ فکر نہ کیجیے، ان کی تمام ذمہ داری ہم لیتے ہیں۔

صبح سات بجے اس نے بیوی کو آخری دیدار کے لیے بلوایا۔ مادام کرامزین نے نیم بیہوش پوشکن پر صلیب کا نشان بنایا۔ تجہیز و تکفین کے لیے ایک پادری سرکاری حکم سے بھیجا گیا۔ اور اسی دن آنکھ بند کرنے سے صرف چالیس منٹ پہلے اس نے پوری قوت سمیٹ کر، تکیے کے سہارے سر اٹھایا، کتابوں سے بھری الماریوں پر رخصتی نگاہ ڈالی۔ بیوی کے ہاتھ سے ایک چمچہ کھٹے اچار کا لیا، بچوں اور دوستوں کو خدا حافظ کہا اور ٹھیک پونے تین بجے دن کو اس کی پتلی پھر گئی۔ سر ڈھلک گیا۔

دیوار گھڑی کی سوئی آج تک وہیں تھمی ہوئی ہے۔

شہر میں ماتم برپا ہوگیا۔ پوشکن کے ہزاروں اجنبی قدر داں نکل پڑے۔ دروازے سے سڑک کے موڑ تک

---

[1] بزرگ کرامزین کے دیوان خانے میں نوجوان اہل قلم سرپرستی اور ہدایت کی طلب میں آیا کرتے تھے۔ پختہ عمر کی مہذب خاتون مادام کرامزین سب کی خاطرداری کرتیں اور پوشکن پر خاص نظر عنایت رکھتی تھیں۔ پوشکن نے خوش فہمی میں مبتلا ہو کر انہیں جذباتی خط لکھ مارا۔ انہوں نے شوہر کو دکھا دیا۔ اس بچگانہ مذاق کے بعد مراسم خوردانہ و بزرگانہ عمر بھر چلتے رہے۔ پوشکن ان کا احسان مند رہا۔

راستہ اٹ گیا۔ سرکار، دربار کو گمان نہ تھا کہ ایک خستہ حال دیسی شاعر کی موت ایسا ہیجان برپا کردے گی۔ اس اندیشے سے کہ کہیں بلوہ نہ ہوجائے، شہر کے ایک مرکزی گرجا گھر میں نماز جنازہ کا اعلان کرایا گیا، لیکن ایک رات پہلے ہی چپکے سے میت کی رسوم ادا ہوگئیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

۴ فروری ۱۸۳۷ء کو دن نکلنے سے پہلے پوشکن کا تابوت ایک پولیس کپتان کی نگرانی اور ممتاز شہری الیکساندر تورگنیف کی حفاظت میں پیتر اعظم کے پائے تخت سے باہر تری گورسکوئے کے اسی خاندانی قبرستان کی طرف روانہ کردیا گیا جہاں پوشکن نے اپنے لیے قبر کی جگہ خریدی تھی۔

صوبے کے گورنر کو خفیہ ہدایات موصول ہوچکی تھیں کہ دھوم دھام کی ضرورت نہیں، لاش سیدھے سبھاؤ قبر میں اتار کر دفن کردی جائے۔ ژوکوفسکی نے بہت زور لگایا کہ روس کے سب سے بڑے شاعر کی آخری رسوم سرکاری اعزاز اور احترام سے محروم نہ رہیں، لیکن وزارتِ داخلہ نے ان اخباروں تک کو، جو بڑے بڑے تعزیتی مضامین چھاپ رہے تھے، یہ کہہ کر چپ کرادیا کہ مرحوم دربار کے ایک حاضر باش تھے، کوئی جنرل، وزیر یا جنگی سورما نہیں تھے کہ ان کے معرکوں سے اخباری کالم سیاہ پوش ہوں۔

شہنشاہ روس نے "خاص اپنے پوشکن" کی روح کو راحت پہنچانے کی خاطر یہ فرمان جاری کیا:

مقتول کے سارے قرض شاہی خزانے سے ادا کیے جائیں گے؛

مقتول کے والد کی جاگیر کو ادائگیوں سے معافی دی جائے گی؛

مقتول کی بیوہ کو حین حیات اور بیٹی کو تا عقد پنشن ملے گی؛

تینوں بیٹوں کو ملازمت ملنے تک ۱۵۰۰ روبل سالانہ وظیفہ ملے گا۔

مقتول کی قابل اشاعت تحریریں سرکاری مصارف سے شائع کی جائیں گی؛

فوری امداد کے طور پر مقتول کے اہل و عیال کو دس ہزار روبل رقم عطا کی جاتی ہے۔

اس فرمان سے زیادہ شہرت اس ہنگامہ خیز مرثیے نے پائی جو ٹھیک انہی دنوں پورے ملک میں سینہ بہ سینہ گشت کررہا تھا۔ اسی مرثیے کے ساتھ شاعر لیرمنتوف (Lermontov) کا نام پہلی بار خاص و عام تک پہنچا، جس کو زندگی اور موت دونوں نے پوشکن کی شاگردی کے لیے چن لیا تھا۔

پوشکن کی بیوی نے لگاتار سات سال تک اپنے شوہر کا سوگ منایا۔ سیاہ گلوبند کے بغیر اسے کسی محفل میں نہیں دیکھا گیا۔ تمام عرصے بادشاہ سلامت بیچاری نوعمر بیوہ پر خصوصیت سے مہربان رہے۔ ہوگوار حسن قابل رشک افواہوں کے ہالے میں اور بھی دلکش نظر آنے لگا۔ آخر چار بچوں کی ماں نے یادیں

لانسکوئے (П. Ланской) کو اپنا دوسرا شوہر بنانا منظور کر لیا۔[1]

یہ وہی فوجی افسر تھا جس نے ۸ سال پہلے نتالیا کو پوشکن کی بیوی کی حیثیت میں دانتھیس کے بازوؤں تک پہنچانے کی چال چلی تھی۔ وہ کپتان سے کرنل بنا، پھر جلدی ہی ترقی پاکر جنرل کے عہدے پر پہنچا۔ بادشاہ سلامت اس کی گھریلو ضیافتوں میں بہ نفس نفیس شریک ہوا کرتے تھے۔ لیکن نتالیا کے لیے خود کو پوشکن کی قبر پر پھول چڑھانے کے لیے جانا مصیبت ہو گیا۔ میخائیلو فسکوئے علاقے کے دیہاتی اسے خونخوار نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ ایک بار گئی، پھر نہ جا سکی۔

تب سے آج تک پوشکن کے مزار پر ہر سال جون کے مہینے میں ہزاروں عقیدتمند حاضری دیتے ہیں، میلہ لگ جاتا ہے اور بڑے بڑے شہروں، خصوصاً ماسکو میں اس کے سنگین مجسمے پر کڑاکے کی اُن سردیوں میں بھی تازہ گلدستے چڑھائے جاتے ہیں جب کھلے آسمان کے نیچے پھول نہیں جی سکتے۔

---

[1] لانسکوئے کو پوشکن سے اس لیے بھی کینہ تھا کہ اس کی ایک سالی سے شاعر کے خفیہ تعلقات بیان کیے جاتے تھے۔

دسواں باب

پوشکن شناسی

پوشکن کی موت کے ٹھیک ۱۳۵ سال بعد اس کی حیات و سیرت کے چند گم شدہ ورق ملے ہیں؛
۹ خط اور ایک خاص تحریر — بغاوت کے بارے میں قابلِ ذکر باتیں۔
انہیں میں ایک خط عزیز دوست اور حمایتی ژدکوفسکی کے نام ہے ۴ جولائی ۱۸۳۴ء کا لکھا ہوا۔ نیت یہ کہ ژدکوفسکی خود پڑھ کر زار نکولائی کے ملاحظے میں گزار دیں۔
پوشکن کو آخری برسوں میں پائے تخت سے بھاگ نکلنے اور شب و روز فنی مصروفیت میں بسر کرنے کی کھلی ہوا میں سکون سے وقت گزارنے کی بڑی تمنا تھی۔ اس نے درباری ملازمت سے استعفا دے دیا لیکن استعفے پر جواب ملا کہ اگر یہ خدمت چھوڑی تو جو آسانیاں دی گئی ہیں، وہ بھی یکسر موقوف ہو جائیں گی؛ سرکاری محافظ خانے کے (تاریخی) کاغذات تک پہنچنے کا اجازت نامہ بھی واپس لے لیا جائے گا۔ شاعر نے اپنے بارسوخ شاعر دوست کو بیچ میں ڈال کر صفائی پیش کی ہے اور استعفا واپس لیا ہے۔[1]
پوشکن کو جتنی آرزو تھی پرانی تاریخ اور تاریخی کرداروں کے واقعات کھنگالنے کی، اتنی ہی بے تابی تھی اپنی آزادی، علم، عَلَم اور قلم کی آزادی بچانے کی — لیکن صاحبانِ اقتدار کے ہاتھ میں دونوں چابیوں کا ایک ہی گُچھا تھا۔ ہر طرح کی پابندی، بلکہ نظر بندی قبول کرو، خوشنودی حاصل کرو تو سرکاری دستاویزوں کا قفل کھلے۔ پوشکن کو ایک کی خاطر دوسرے کی قربانی دینی پڑی۔ اور اگر اس کے مرنے کے بعد، سود و زیاں سے بے نیاز ہو چکنے کے بعد، ہیں

---

[1] شہنشاہ کے محکمۂ خفیہ کا ایک سربراہ پاویل ایوانووچ ملر (Miller)، جو اسی لیزیم کا تعلیم یافتہ، روشن خیال اور صاحب ذوق فرد تھا، عمر بھر ایک فائل میں اِن تحریروں کو سنبھالے رہا۔ پوشکن کے کفن دفن سے ذرا پہلے اس نے مقتول کی خون آلود قمیص میں سے بھی ایک خط علیحدہ کر لیا تھا۔ اب اسی کے خاندان میں سے پوشکن شناسوں کو یہ امانت دستیاب ہوئی ہے (Литертурная газета No 15 - 1972)

وقتاً فوقتاً مسودے، مخطوطے اور گم شدہ ورق اصلی حالت میں نہ مل گئے ہوتے تو یہ ثابت کرنا دشوار ہوتا کہ وہ شاہ پرست تھا یا آزادی پسند آسائشوں کا طلب گار تھا یا آزمائشوں کا۔

زندگی کے ہر ایک مرحلے پر پوشکن کو سخت کشمکش سے، متضاد حالات سے واسطہ پڑا؛ طبیعت زُود رنج، ذہن درّاک، زبان بے لگام، لہجہ بے نیام۔ ہر بار موت اور زندگی کے دوراہے[1] پر پہنچ کر قدم ڈگمگاتے تھے اور فنی تکمیل کی مراد اس کا دامن تھام کر سمجھاتی تھی:

تاب لائے ہی بنے گی — غالبؔ!

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اس نے زار سے تو اپنا استعفا واپس لے لیا، زندگی سے واپس نہیں لیا — ہرچہ بادا باد......!

تمام شہرتوں اور شہادتوں کے باوجود اُس کی زندگی اور فن —— دونوں سالہا سال اختلافات کا شکار رہے، یہاں تک کہ قدردانوں نے ۴۳ برس بعد، جب اس کا یادگار مجسمہ ماسکو کی شاہراہ پر نصب کیا اور شہرۂ آفاق روسی ناول نگار فیودر دستوئیفسکی کو نقاب کشائی کے لیے بلایا تو اس نے شاعر کے اور خود اپنے شایانِ شان ایسی ہنگامہ خیز تقریر کی جس نے اختلافات کے دروازے بھیڑ دیے اور روسی دانشوروں کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا

> گوگول نے کہا تھا کہ پوشکن ایک حیرت انگیز مظہر ہے۔ بلکہ تعجب نہیں جو وہ اکیلا ہی مظہر ہو روسی روح کا۔ میں یہاں پیغمبرانہ کا لفظ بڑھاتا ہوں۔ اس کے وجود میں، واقعی، ہم سب کے لیے، سبھی روسیوں کے لیے، کوئی نہ کوئی بات پیغمبرانہ ضرور ہے.........

"پیغمبرانہ" کا لفظ یہاں اپنے دور کے عظیم الشان ناول نگار نے بے سبب نہیں بڑھایا؛ واقعی پوشکن کے لفظ روس کے حق میں پیغمبرانہ ثابت ہوتے ہیں۔

دستوئیفسکی نے پوشکن کی ذہنی کاوشوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے: "ایوگینی اُنے گن" شروع کرنے سے پہلے کا بلکہ اس منظوم ناول کے آغاز (۳۲-۱۸۳۱ء) تک کا دَور، پھر "جب پوشکن نے وطن کی سرزمین میں اپنے آئیڈیل پالیے، سینے سے لگالیے اور تن مَن میں بسالیے" اس دوسرے دور میں ناول تمام کیا، تیسرے دور میں وہ

---

[1] یہ یادگار تقریر دستوئیفسکی نے بیماری کی حالت میں ۸ جون ۱۸۸۰ء کو پوشکن کے یوم ولادت پر کی تھی۔ یہاں مجھے اقرار کرنا ہے کہ اسی تقریر کی تنقیدی نظر اور بیان کی بے باکی نے مجھے پوشکن کی روح سے روشناس کیا اور "پوشکنیات" کے دَر کھولے۔ آج تک اس تقریر کے حوالے دیے جاتے ہیں اور " ادیب کا روزنامچہ " (Записки писателя) بلد ۲ میں شامل ہے۔

کلام شامل ہے جس میں دوسری قوموں اور ملکوں کے شاعرانہ نمونوں اور عالمی خیالات اور معیاروں نے جگہ پائی
۱۹ ویں صدی کے آغاز کا وہ آدمی' وہ منچلا ، بے فکرا ، بے عمل نوجوان جو بے وطن ، بے مقام اور بے
آدرش تھا ، جسے خود اپنی آتما کا روگ کھائے جاتا تھا ' پوشکن کے دوسرے دَور میں پورے وجود کی گہرائی
کے ساتھ آتا ہے۔ دستوئیفسکی نے ، اور اُس سے پہلے بیلنسکی نے اسے " روسی صداقت " کا نام دیا ہے کہ شاعر
زندگی کے جس رُخ سے' جن کرداروں سے' مسایل سے کہ بیسے خوب واقف ہے' وہی اس نے اپنی نظموں
میں " پیغمبرانہ بصیرت اور فنکارانہ صداقت کے ساتھ پیش کر دیے ہیں اور یوں اس کی نظم و نثر گویا اپنے وقت کی
شاعرانہ " انسائیکلوپیڈیا " بن گئی ہے ۔ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ روس کے سیاسی منظر پر جو حیثیت یا اہمیت
پیٹر اعظم کی ہے' عین وہی ادبی منظر پر پوشکن کی ہے ۔ دوسرے لفظوں میں روسی ادب کا دَورِ حاضر اسی کے دَم سے
شروع ہوتا ہے ۔

اس میں مبالغہ نہیں کہ پوشکن ایک شاعر ، افسانہ نگار ، مورّخ ، ڈرامہ نگار اپنی تلاش' تجربے ، کامیابی
اور ناکامی ، تشکیک اور تذبذب' جھنجھلاہٹ اور شادمانی کے اظہار میں دو تاریخی ادوار کے درمیان کی کڑی ہے'
دو تہذیبی دائروں کے درمیان ایک حلقہ ۔

ماضی کا ورثہ اس پر آکر مکمل ہوتا ہے اور زبان و ادب کی جدید تحریک کو اُس سے شہ بھی ملتی' قابلِ تقلید نمونے
بھی ـــــ تاریخی اعتبار سے وہ غالبؔ کا معاصر ہے اور اہمیت کے لحاظ سے بھی ـــــ لیکن تجربات کی رنگارنگی میں' بیانیہ
اور خطابیہ شاعری میں' خود کو آگ میں جھونک کر " شعلۂ عشق " کے " سیہ پوش " ہونے کی داستان بیان کرنے میں ،
عالمی ادب کے وسیع مطالعے میں' اپنے دَور کی تفصیلی ترجمانی میں ، اپنی ہم عصر نسل کی ظاہری اور باطنی ۔ سوانح عمری
کے نشانات اُبھارنے میں اور آنے والے دَور کے پیمانے مقرر کرنے میں' ادبی زبان و بیان کو زندہ بولی کی لذت
اور سلاست عطا کرنے میں وہ غالبؔ سے قطعی مختلف ہے ۔ اس اختلاف کے پہلو میں بھی اس کی قومی شاعرانہ حیثیت
کا راز پوشیدہ ہے ۔

لڑکپن کی شوخ نظموں' پھبتیوں اور عُریاں تُک بندیوں میں مشقِ سخن کر چکنے کے بعد جب وہ باقاعدہ شاعر کی
پوشاک میں نمودار ہوا تو اس کے سر پر فرانس کی چلتی ہوئی جذباتی شاعری کا جادو بول رہا تھا ۔ وقت کے مشاہیر شعرائے
روس باتیوشکوف اور ژوکوفسکی کی نقل میں اس نے زبان کھولی اور انہیں کو راہبر سمجھ کر تھوڑی دور چلا بھی ـــــ
۲۱ کی عمر کو پہنچتے پہنچتے جب اپنی طویل' نیم خیالی' مثنوی جیسی نظم " رُسلان و لودمیلا " پیش کی تو اس میں سے قومی
شاعری کی بو باس غائب تھی ۔ جنات کی سلطنت' پریوں کا راج ، بھوت پریت' شہزادی کا حجلۂ عروسی سے گم ہو جانا ،
پھر رُسلان (ژرتم کے معنوی فرزند) کا اس کی تلاش میں ہفتخواں طے کرنا اور بچھڑے ہوؤں کا ملاپ ـــــ شاعرانہ

خوبیوں کے باوجود یہ قصہ اور اس کا بیان کسی بھی زبان یا زمین کی پیداوار ہو سکتے تھے۔ لیکن ابھی روس کی ہوا کھائے ہوئے زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اس نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو زبان دینی شروع کی، ضروری تفصیلات اور شوخ رنگ اشاروں کو آمیز کر کے پورا ایک پنوراما (Panorama) پھیلا دیا اور طویل و مختصر نظموں کا وہ سلسلہ، جسے جنوبی نظمیں کہا جاتا ہے۔ (جس میں کی دو نظمیں "فوارہ" اور "بنجارے" اسی کتاب میں نمونتہً شامل ہیں) خاص روس کے چہرے، ماحول اور کیفیات لے کر منظر عام پر آئیں۔ کرداروں کی زبانی اُن کی اور اپنے دل کی بات کہی، عام منظرکشی سے خاص کی جانب بڑھا، ریل کی پٹری کی طرح لہجہ اور زمین بدلتا گیا تاکہ واقعے کے موڑ اور منظر سے میل کھائے، اصنافِ سخن کی حد بندی کو توڑ کر، جو گرہ کھلنے والی نہیں تھی اُسے قلم کی دھار سے کاٹ کر نکل گیا اور اُن الفاظ کو گرے پڑے "غیر شاعرانہ" الفاظ اور "نامناسب" حرکتوں کو شعر کی محفل میں یوں سجا دیا کہ گمبھیر، خوبصورت، دلنواز استعارے منہ تکتے رہ گئے۔

نظم "بنجارے" میں شہر سے اُکتایا ہوا، نازپروردہ، آزادی پسند، نوجوان الیکو، جب خانہ بدوشوں میں گھل مل جاتا ہے (یا کم از کم خود کو خانہ بدوش شمار کرنے لگتا ہے) پوشکن نے دکھایا ہے کہ وہ گاؤں گاؤں بھالو نچاتا پھرتا ہے اور اس کی سکھی سہیلی بنجارن "زمفیرا" جھولی پھیلا کر پیسے اُگھاتی ہے۔ نظم خوب تھی؛ دوستوں نے جی بھر کر داد دی۔ ایک آدھ کو ناگوار گزرا کہ کم بخت نے ہماری ہی تصویر کھینچی ہے۔ صورتیں اور خاص جملے تک وہی ہیں۔ تنقید نگار اور دوست ویازیمسکی نے ڈانٹ کر لکھا کہ اور جو ستم کیے، وہ تو خیر کیے، لیکن بھلا افسانے کے ہیرو سے بھالو نچوانا کیا ضرور تھا؟ اگر کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم اسے لوہار یا ستری بنا دو کہ اوزار بنا کر بیچا کرے اور ایک شریف زادے کی یوں مٹی پلید نہ ہو۔ پوشکن نے، جو احباب کی رائے پر اور خود اپنے منشا سے مسودوں کی بار بار ترمیم کیا کرتا تھا، اس عزیز کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ اس نے اپنے برتاؤ سے جتا دیا کہ :

شاعری اور وضعداری کا، مروت اور فنکاری کا کوئی میل نہیں۔

پوشکن نے پانچ بار ملک سے فرار ہونے کی کوشش کی، دو بار استعفا دیا اور اس ذہنی و جسمانی آزادی کو، جو روس کے سخت گیر ماحول میں ناپید تھی، سرحد پار کی دل رُبا سمجھ کر باہر کی طرف نظریں دوڑائیں۔ بائرن کے جانبار، دل پھینک اور سرفروش کردار اور روسو کے معاہدۂ عمرانی اور "اعترافات" والے شہری بہت دنوں اس کے ہیرو رہے؟ روس کی "فرماں بردارانہ ذہنیت" پر بار بار پھبتیاں کس کر اس نے جتایا کہ آزادی کی تلاش انسان کی سب سے مقدس آرزو ہے۔ منظم مذہب کے ٹکے بندھے عقیدوں سے آزادی (مثلاً روح القدس اور مریم مجدلانی کے معاملے کو ارضی رنگ دینا (Gavriliada) جس پر پمصراور "سرپرست" دونوں خفا ہوئے)

شاعری میں شائستہ استعاروں اور بھاری بھرکم ترکیبوں کے پیرائے سے آزادی؛ بحروں کی یکسانی سے آزادی، قوم پرستی کے پاپولر نظریوں کے بہروپ میں چھپی تنگ نظر ذہنیت کے نعروں اور فتنوں سے آزادی؛ اس آزادی کی اُمنگ، نغمہ سرائی اور تڑپ اس کی نظم و نثر میں اول سے آخر تک جاری و ساری ہے۔ یہی اس کی فنی کاوشوں کا اصل جوہر ہے ــــ اور یہیں روس کا یہ قومی شاعر اپنے غیر ملکی ہمعصروں اور رومانوی انداز کے منچلوں سے خود کو جدا کر لیتا ہے۔ اس کی بصیرت گھوم پھر کر اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ تہذیب سے فرار ممکن نہیں۔ وہ "قفقاز کا قیدی" ہو جو چرکس آزاد قبائلیوں میں پھنس کر، انہیں چرکا دے کر، یہاں تک کہ ایک معصوم لڑکی کے عشق کو ٹھکرا کر بھاگ نکلتا ہے اور پھر اپنی شہریت کی زنجیریں پہن لیتا ہے؛ "بنجارے" کا "الیکو" ہو جو خانہ بدوشوں کی آزاد زندگی سے نباہ نہیں کر سکتا اور دو دو قتل کر کے تنہا رہ جاتا ہے ــــ "جائیں تو کہاں جائیں ؟" "ایوگینی انے گن" کا دل برداشتہ ہیرو ہو جو خود اپنی بے لگام آزادی سے اُکتا چکا ہے اور دامنِ دولت سے وابستہ ہونا چاہتا ہے؛ "دیردفسکی" ناول کا جیالا اور بے قصور ڈاکو ہو جو مسلسل انتقام کی جان لیوا کاروائیوں سے بھی آزادی کی پیاس بجھا لینے میں ناکام رہا، یا خود پوشکن ہو، جو اپنی فکر اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو "در حدیثِ دیگراں" پیش کر کے بھی زندگی کے تضاد اور تضادوں کی زندگی سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس کی بصیرت فتوے تو صادر نہیں کرتی، تاہم یہاں آکر ٹھیرتی ہے کہ آزادی اور پابندی کے درمیان کہیں کوئی توازن کا مرحلہ ہے جس تک ہم فرض شناسی اور سماجی شعور کی راہ سے پہنچ سکتے ہیں۔ چناں چہ اپنے شاہکار منظوم ناول (.... انے گن) میں خود پسند، مَن موجی ہیرو دب کر رہ جاتا ہے اور فرض شناس روسی لڑکی تاتیانا کا کردار یوں حاوی ہو جاتا ہے گویا وہی اس ناول کی ہیروئن اور اصل کردار ہے۔

> انے گن محبت تو میں آج بھی تمہی سے کرتی ہوں، لیکن کیا کروں، دوسرے کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دیا جا چکا، اب عمر بھر اسی سے وفا کروں گی ....

دستوئیفسکی، انقلابی دہشت پسندی سے 'مکرنے' والا، پھانسی کے پھندے اور سائبیریا کی جلا وطنی سے پھرا ہوا۔ دستوئیفسکی ان کرداروں کی آڑ میں پوشکن کی عظمت و صداقت کی پرچھائیں پھرتی دیکھتا ہے اور پکار اٹھتا ہے:

> اگر پوشکن اور کچھ عرصے جیا ہوتا تو روسی آتما کو ایسی اَمر اور مہان مورتیاں دے جاتا جو ہمارے یوروپی برادروں کی اچھی طرح سمجھ میں آتیں جتنا اور جیسا وہ اب ہمیں پہچانتے ہیں، اس سے زیادہ اور بہتر پہچان پاتے، ہماری امنگوں اور آرزوؤں کی تمام تر صداقت اُن پر آشکار ہو جاتی، وہ (یوروپ والے) ہمیں اب سے کہیں بہتر سمجھ سکتے، قیاس کر سکتے،

ہم کو جس بے اعتباری سے، جتنی تحقیر سے دیکھتے ہیں ویسے نہ دیکھتے (بلکہ ہمارا صحیح تصور قائم کر سکتے) ......

آزادی اور مسرت کے درمیان اگر کوئی فرق کیا جا سکے تو ہمارا یہ منچلا شاعر انسانی مسرت کو لذتوں کے مختلف رنگوں میں یوں تلاش کرتا پھرتا ہے جیسے بچے تتلیوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ ٹھوکریں کھاتا ہے، گرتا ہے، سنبھلتا ہے، اقبال جرم کرتا رہتا ہے اور پھر جا بجا مکمل آزادی اور بھرپور خوشی کا سراب نظر کے آگے ہریں لینے لگتا ہے۔ "قیدی" اور "آزادی" دونوں نظمیں تقریباً ایک زمانے کی ہیں، جب وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ شکرا لوہے کے پنجرے میں ہے، آزادی اور مسرت سے محروم، روٹی روٹی پر اس کا سر جھکا ہوا، یہ گویا شاعر کا ہمزاد ہے، دوسرے موقع پر شاعر پرندے کا پنجرا کھول دیتا ہے اور اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہے کہ ہم سے اور کچھ بن نہ پڑا، چلو، ایک پرندے کو آزادی کی مسرت تو عطا کر دی۔ سائبیریا میں جلاوطن قیدی دوستوں کے لیے وہ "شکستِ زنداں کا خواب" دیکھتا ہے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور گاؤں کی سادہ دلفریب فضا کی طرف لپکتا ہے کہ شاید وہاں مسرت کی دیوی کیری کی طرح پتوں میں چھپی بیٹھی ہو، مگر وہاں کسان مفلس و مجبور، رمیں توہمات کا شکار، گیت اُداس اور جوانیاں نامراد۔ شاعر کو موت کا خیال ستانے لگتا ہے لیکن موت اس کے لیے مسرت کی پیامی نہیں، زندگی اور حرکت کے نغمے کی ناتمامی ہے۔ وہ آدمی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے لَو لگائے رہتا ہے کہ کیا خبر، چلتے چلاتے زندگی مسکرا کر مسرت و محبت کا کوئی آخری جام دے جائے۔ آرزو مند ہے کہ بے رحم فطرت میری قبر پر سبزہ بچھائے، جوانوں کے پرے گھوما کریں، بچے یہاں کھیلیں۔

آزادی اور مسرت کے راگ اس نے اتنی بار الاپے ہیں (خود "بنجارے" میں یہ لفظ پہلو بدل کر ۱۲ دفعہ آیا ہے) امید اور ناامیدی، خوشی و ناخوشی کو اس نے یوں کرید کرید کر دکھایا ہے کہ غالب کا وہ شعر اس کی ذہنی کشمکش پر صادق آتا ہے۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی،
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

یہ کشمکش، جو فانی انسانوں کی آزمائش گاہ ہے، فنکاروں کے لیے خیر و برکت کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے، یہ کشمکش پیغمبرانہ بصیرت اور معصومانہ نادانی میں ایک ساتھ جینے والوں کے لیے ٹریجیڈی کا سبب بن جاتی ہے اور فنکار زخمی ہیرو کی طرح منظر پر اُبھر آتا ہے۔ یہ مسئلہ سیدھا سادہ قنوطیت یا رجائیت کا نہیں بلکہ قنوطیت سمیت رجائیت کا ہے۔ پوشکن نے ان کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں بنائی اور یہاں پھر وہ چائلڈ ہیرالڈ کے مصنف اور اپنے اوّلین استاد بائرن سے کئی قدم آگے نکل گیا۔

بے سبب نہیں کہ محبت، مسرت اور آزادی کے موضوع پر اس کے مصرعے زبان زد ہو گئے اور روسی ادب کے دل میں اُتر گئے۔

تب خوشی ممکن بھی تھی، نزدیک بھی لیکن اب تقدیر فیصل ہو چکی

آسرا آدمی کو ہے کل کا

"ہمارا اور تمہارا نام ہی زیب نظر ہوگا"

جو گزر جائے وہ سہانا ہے

شادمانی کا جب شعور نہ تھا ہم نے جی بھر کے شادمانی کی

ہستی کی بھری بزم میں وہ لوگ ہیں خوش کام پی کر جو اُٹھے، چھوڑ گئے دُردِ تہہ جام

جس سمت سمندروں کی لہروں میں لہر مچلے اُس سمت ہم اُٹھلائیں اور بادِ سحر مچلے

اٹھا جام، پی ساتھ اے مہرباں اُدھی نوجوانی کی ساتھی ہے تُو اِسی جام میں گھول لیں تلخیاں کہ ٹھنڈا ہو دل، گرم ہو کچھ لہو

پوشکن کی طبیعت بے قرار تھی اور مزاج شرربار، کچھ خاندان کا اثر، کچھ بگڑے دل امیروں کا ماحول اور پھر منجمد، مقررہ اور ضابطے کی صورت حال سے شدید نفرت۔ طرح طرح کے شکنجوں میں رہ کر وہ جتنا کچھ ہاتھ پاؤں مار سکتا تھا اس سے باز نہ آیا، اور کمی پوری کی مردانہ سرفروش، باغی، کھُردرے، من موجی کردار ابھار کر، فیاض، ڈکیت، بے نیاز اور دُکھوں میں مسکرانے والے، لمحوں کی بے پناہ مسرت کو گلے لگانے والے سُورماؤں کی تصویریں کھینچ کر یا اُن سے اپنی عقیدت کا اظہار کر کے۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ اُووِد (OVID) بائرن اور آندرے شینئے، جیسے شعرا، نپولین، بورس گودونوف اور بیٹرا اعظم جیسے سپہ سالار، پگاچیوف، ایستیپان رازین، دبیروفسکی، کرجالی اور "ڈاکو بھائی" جیسے کفن بردوش کیرکٹروں میں کوئی قدر مشترک ضرور ہے۔ اُووِد اپنی بے باکی اور آزادی پسندی کے کارن روم سے جلاوطن کیا جاتا ہے اور بلقان کے خانہ بدوشوں میں پڑا

رسسکتا رہتا ہے، بائرن نے افسانوی شہرت کے ہالے میں رہ کر وطن سے دور ایک قوم کی آزادی کے لیے جان قربان کردی، "کرجالی" میدان کارزار میں موت کی ہر ایک صدا پر فوراً لبیک کہہ کر لپکتا ہے" ڈاکو بھائی" (جنوبی قفقاز کے سلسلے کی طویل نظم جسے پوشکن نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ کردار نگاری میں کسر رہ گئی) ہتھکڑی بیڑی سمیت دریا تیر جاتے ہیں اور اپنے محافظوں کو جان سے مار دیتے ہیں، پیٹر اعظم تو خیر، پوشکن کا اسی طرح مثالی ہیرو ہے جیسے امیر خسرو کا علاءالدین خلجی (جسے وہ سکندر ثانی کہتے ہیں)۔ اور پھر ان سب پر مستزاد ہے شاعر، جسے ناگہاں صدائے غیب آتی ہے اور حکم ہوتا ہے کہ خواب غفلت سے بیدار ہو

پھونک دے صور کہ سوتے ہوئے دل جاگ اٹھیں

شاعر کا یہ پیغمبرانہ فریضہ جرمن کلاسیکی فلسفے اور شدید جذباتی شاعری کی سازش سے طے پایا تھا اور پوشکن کو بھی اول اول وہیں کی چاٹ لگی۔ جب زبانوں پر تالے پڑے ہوں، گردنیں حضور عالی کی پیش گاہ میں خم ہوں، لوگ غلامی کو آزادی سے تعبیر کرنے پر ذہن اور زبان کا سارا زور لگا رہے ہوں، تب شاعر کو اپنا یہ فریضہ انجام دینے کے لیے میدان میں اترنا چاہیے۔

اس ایک تصور میں دو مزے ہیں! شاعر کو اپنی رنگ رلیوں اور غفلتوں سے نکلنے کا جواز ملتا ہے، اور پھر زخمی انا کی تسکین ہو جاتی ہے۔ ہم چشموں میں گردن اٹھا کر چلنے کا بہانہ ہاتھ آتا ہے: اچھا اگر شاعر نہیں ملتے، نہ مانو، میں امیر ابن امیر ہوں۔ دیکھو!

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اور اگر امیروں میں پایہ بلند نہیں، نہ سہی، مگر جب امارت، منصبداری نہ رہے گی تب بھی دنیا میرے نام سے گونجے گی کیوں کہ

میں نے اس کلجگ میں گائے کھل کے آزادی کے گن

یوں پوشکن نے قدم قدم پر اپنی داغدار سرکشی اور زخم خوردہ خم گردن پر مرہم کے پھائے رکھے ہیں۔ اور شاعرانہ وجود کو اداسی، پسپائی، شکست خوردگی کا شکار نہیں ہونے دیا، درد، وجود کے کنویں میں تارے کی طرح اترا ہوا ہے مگر بانکے کرداروں کی للکار موج در موج امنڈ رہی ہے، دسمبری سرفروشوں کی منتیں مرادیں مانگی جا رہی ہیں، خفیہ طور سے نظموں کی مراسلت چل رہی ہے" بغاوت کی تاریخ " ترتیب پا رہی ہے دہشت پسند سیاسی قاتلوں کی تصویر بغل میں دابے اور لوگوں کو دکھاتے ہیں "سمندر" سے خطاب، شکریے سے خطاب، دھوپ بھرے جنوبی دیسوں کی آزادی سے والہانہ پیار، اس کے گن گان، میرا مشرق، میرا افریقہ کہہ کر لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ، یہ سب وہی پوشکن ہے جسے آخری برسوں میں یہ طعنے نصیب ہوتے کہ چولا بدل لیا۔ بادشاہ کا شاعر ہو چکا

ہے، جسمانی آسائشوں کی طلب میں ہتھیار ڈال دیے۔ اُنہی دنوں (۱۸۲۸ء) میں اس کی ایک نظم کئی کئی ترمیموں سے گزر کر شائع ہوتی ہے "انچار"

۱۸ ویں صدی کے ایک ڈچ سیاح نے جاوا جزیرے میں کوئی زہریلا درخت دیکھا تھا جس کا بھیانک بیان روسی زبان میں بھی منتقل ہوا، اسی بس بھرے درخت کو ایک علامت "انچار" بنا کر پوشکن نے در پردہ یہ جتایا کہ بے زبان فرد کا حوصلہ مند بادشاہ سے، فوجی کا سپہ سالار سے، ملک کا سلطنت کی توسیع سے کیا تعلق ہے۔ کتنا بس بھرا رشتہ! یہ لافانی نظم صورت دمعنی میں شاعر پوشکن اور مورخ پوشکن سے ہمارا بھرپور تعارف کرا دیتی ہے۔

شاعر نے سامنے کے، کھُردرے، روکھے روکھے لفظ چنے۔ مصنف گویا دُور کا تماشائی ہے۔ بحر سادہ، اول تین بند صرف اس درخت کی زہرناکی کم سے کم لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ کہ "شیر لرزتے ہیں درندے پاس نہیں پھٹکتے، ہوا گزرے تو زہر آلود ہو جاتی ہے۔ جب پوشکن یہ بند لکھ چکا تو اس نے گویا اصل نکتے پر زور دینے کی تیاری کر لی — نکتہ یہ کہ حاکم وقت نے اپنی رعایا کو حکماً اس درخت کی ٹہنیاں کاٹ لانے کے لیے بھیجا تاکہ ہمسایہ حکومت یا ریاست کو نیچا دکھلانے کے لیے مہلک ہتھیار ڈھالے جائیں۔ مصرعہ یوں اُترا:

اور پھر کوئی انسان

اس زہر بھرے پیڑ کی چھاؤں میں در آیا

نہیں — پہلا مسودہ بتاتا ہے کہ شاعر نے یہ مصرعے لکھ کر رد کر دیے۔ کیوں؟ کیا وہ 'انسان' خود اپنی مرضی سے خوفناک درخت کے پاس گیا تھا؟ دُو مصرعوں نے ۳ مصرعوں کا قالب اختیار کیا۔

لیکن کسی اک شخص نے ایک شخص کو

فرمان دیا — جاؤ

نادان چلا راہ پہ " انچار کی جانب۔

یہ بھی نہیں۔ اوّل تو "اور پھر" کی ابتدا کمزور تھی، دوسرے یہ کہ "نادان" کہہ کر شاعر نے پہلے ہی آخر کی شدت کم کر لی۔ "فرمان دیا" پٹی ہوئی ترکیب ہے۔ کیا فرمان دینا لازم تھا؟ نہیں! ۲ مصرعوں میں الفاظ بھی بڑھ گئے۔ پھر ترمیم کی:

اس راہ پہ وہ شخص گیا زہر کی خاطر

تعمیل ہوئی حکم کی، بندہ ہوا حاضر

غالباً الفاظ کا حجم ذرا غیر شاعرانہ معلوم ہوا۔ پھر تعمیل کی کیفیت کو آخر سے اٹھا کر اول رکھا، ردو بدل کیا:

زہریلے درخت کی تمام تر ہولناکی جتانے کے بعد آخر کے بندیوں شروع ہو رہے تھے ،

آقا نے کہا جاؤ ، مجھے زہر ہے درکار

اور وہ جانباز ....

مگر شاعر اُس دوسرے کی " جانبازی " کو نہیں ، فرماں برداری کو ، بے زبان تعمیلِ حکم کو ابھارنا چاہتا تھا تو بار بار اُلٹ پلٹ کر یہ ۲ مصرعے قلمبند کیے :

بھیجا اسے " انچار " کو ، صادر کیے احکام

بھیجا اسے آقا نے کہ بس حکم بجا لاؤ

بے رَدّ و بدل حکم نے بھیجا سوئے انچار

اور ان کے بعد واپسی کے عمل کو شاعر نے یوں رکھا تھا کہ وہ جاں نثار بندہ (زہر بھری ٹہنیاں) لے آیا اور لاتے ہی مرگیا۔ یہاں " جاں نثار " یا " جانباز " کے لفظ میں طنز کا زہر بجھا ہوا سہی ۔۔ مگر ناکافی ہے ۔ شاعر نے سب کاٹ کر آخر میں مصرعوں کی بندش یوں کر دی ۔

لیکن کسی ایک شخص نے ایک شخص کو گھورا

نظروں کا تقاضا تھا کہ فرمان ہو پورا

وہ حکم کا بندہ گیا " انچار " کی جانب

اور زہر لیے ، صبح کو سرکار کی جانب

سرکار کے قدموں پر گرا ، چھوڑ دیے پران

اک تن سی گئی جان تو اک تن کا ڑھا مان

روسی زبان میں " دیری نی " (" جانباز " " معتبر ") اور " بیدنی " (بچارہ) برابر کے ہم وزن الفاظ ہیں لیکن موت کا انبار اپنے سر پر اٹھا کر لانے والے کا " جانباز " ہونا تو " سرکار کے قدموں پر گرا " سے ظاہر ہو گیا البتہ بے چارگی ، بے زبانی کے لیے لفظ درکار تھا ، شاعر نے وہی " بیدنی " چنا " اس شخص " کی بے چارگی جسے حاکمانہ نظر نے تعمیل پر مامور کیا ہے ، لکڑی کے تیر کی سی بے چارگی ہے ، دونوں ہی بے زبان ہتھیار ہیں ، دونوں کو مہلے کا زور توڑنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور یوں حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کے بل پر قوموں کی سورمائی اور شہنشاہوں کی دانائی کا سکہ چلتا ہے ، سلطنتیں بنائی اور پھیلائی جاتی ہیں ۔ نظم مکمل ہونے تک کم از کم سات بار بدلی گئی ۔ شاعر نے اپنی طرف سے ایک لفظ نہیں کہا ، واقعے کی جو مختصر سے مختصر تصویر اس کے تخیل میں بنی تھی ، وہی پڑھنے والے کے حوالے کر دی اور خود چپ سادھ لی ۔

سرحد کو چلے موت کے اڑتے ہوئے پیغام

ایک سوال کو جنم دیتا ہے۔ سوال یہ کہ پھر سرحدی ملکوں پر کیا گزری ؟ جواب ہم خود تلاش کر لیتے ہیں کہ "زہر بھرے جام" پی پی کر ہمسائے لیٹ گئے ــــ اور جام بھیجنے والے کی "قومی" سرحدیں اور آگے بڑھ گئیں۔ یہ ہے پوشکن کا فنیٔ عمل ــــ اور یہ کوئی نظم تک محدود نہیں، نثر میں بھی یہی حال ہے۔ وہ آرائش یا چٹخارے کی خاطر لفظ کا پیچھا نہیں کرتا۔ بے ضرورت ترکیبوں اور استعاروں پر جان نہیں چھڑکتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ "ایوگینی اے گن" منظوم ناول ۸ سال لکھا جاتا رہا اور ۲ سال تک اس پر نظرثانی اور ترمیم کا عمل چلتا رہا۔ نو، دس برس میں بعض بند ۲۷، ۲۸ بار کاٹے اور چھیلے گئے ہیں۔ یہ اس شخص کی حالت ہے جس پر نظم کی نظم نازل ہوا کرتی تھی، جو صبح سویرے دن نکلنے سے پہلے بستر میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور مسودوں کے ورق پر ورق سیاہ کرتا جاتا تھا۔ گویا ایک لاوا اُبل اُبل کر کاغذ کی سطح پر بہہ رہا ہے، جم رہا ہے، وہ اپنی لکھت سے خود کبھی مطمئن نہیں ہوا۔ مرتے دم تک مطمئن نہیں ہوا۔

"باغیچہ سرائے کا فوارہ" جب دوستوں کو بھیجی تو سوال ہوا کہ مقصد کیا ہے ؟ ــــ جواب دیا، مقصد ہے شاعرانہ تصویرکشی۔ اور آخر سوال جواب سے تنگ آکر لکھ دیا کہ

نظم تو میری یونہی سی ہے، البتہ ایپی گراف بہت خوب ہے !

ایپی گراف (ابتدائیہ)، یعنی شیخ سعدی کے دو شعر۔ جو نظم کے شروع میں وارد ہوئے ہیں اور جن کی گونج "...... اے گن" میں بھی سنائی دیتی ہے کہ سعدی نے کیا خوب کہا : ایسی زندگی میں کیا لطف کہ یار دوست آنکھوں کے آگے سے، پلکوں کی طرح جھپک کر اُٹھ گئے۔

"قفقاز کا قیدی"۔ جو روسی جوان ہے، چرکس قبیلے کی حسینہ کو (جو اُسے دل دے بیٹھتی ہے اور محبت کا جواب نہیں پاتی، آہنی زنجیریں کاٹ کر اُسے اپنے قبیلے کی قید سے اور خود کو زندگی کی قید سے نجات دے ڈالتی ہے) دغا دے کر نکل گیا۔ اس پر نکتہ چینی ہوئی کہ یہ کیا رومانوی ہیرو ہوا ؟ ــــ پوشکن نے جواب دیا : اس سے پتہ چلا کہ میں خود رومانوی ہیرو بننے قابل نہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے۔ رومانوی اثرات سے نکلنے میں اس کی حقیقت پسندانہ بصیرت بہت تیز رفتار ثابت ہوئی۔ مثنوی میں دو ہی کردار تھے۔ شہروں کی خود پسند، خود غرض زندگی سے اکتائے ہوئے، ہیرو کی پُشت پر سے جانے پہچانے روسی چہرے یوں جھانکے کہ احباب ایک دوسرے کو چھیڑنے لگے کہ یہ تو تم ہو !

سال بھر بعد "باغیچہ سرائے کا فوارہ" نظم لکھی گئی ــــ مقام فرضی نہیں اصلی، کردار واقفیت کا رنگ لیے ہوئے، تین کردار، تینوں کی ترتیب، اٹھان، تاثر، عمل ایک دوسرے سے مختلف۔ عمل تین، محبت، رقابت، قتل۔ لیکن ان کی پیٹھ میں، ہم کرامیا کے تاتاری خانوں سے، اُن کے خاندانوں سے ملتے ہیں، گلی کوچوں اور باغیچوں کی،

محلوں اور محلّوں کی سیر کر لیتے ہیں۔ شاعر یہاں راوی ہے، مگر ایسا راوی جو گائڈ نہیں، خود ہماری طرح ایک سیاح۔ ہمارے ساتھ وہ بھی حیران، اُداس، لطف اندوز اور جاں سوز نظر آتا ہے۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے نہیں، ساتھ ساتھ قدم اٹھا رہے ہیں۔ نظم ختم ہو چکنے پر، وہ اپنی سوانح کا ایک ورق سنانے کے لیے ہم سے گویا تخلیے میں ملتا ہے وہ بھی محبت کے ہاتھوں ستم زدہ ہے۔ یادگار فوارے بنوانا تو درکنار، وہ تو اپنی داستان غم جی کھول کر سنا بھی نہیں سکتے۔

۱۸۲۲ء کی تصنیف اس طویل نظم میں "ایکشن" سرے سے غائب ہے، لیکن محل کے اندر اور باہر کی رنگین، دلکش اور حقیقت پسندانہ تصویریں، غموں اور خوشیوں کا پیچ و تاب ڈرامائی "ایکشن" کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ طرز بیان کی خوبی و روانی میں ہم بہے چلے جاتے ہیں۔

شاعر نے اس کے لیے بحر بھی ایسی چنی ہے — رَواں دَواں، جو اسے دل سے پسند تھی۔

چار رکنی یامب (Четырехстопный ямб)

مختصر غنائی نظمیں۔ جو بیشتر "سہ رکنی یامب" میں لکھی گئیں، آوازوں میں کچھ اس طرح ترتیب پاتی ہیں:

تک تک تاک

تی تی تھا تھن

چک چک چاک

جی جی جھا نجھن

اس میں ایک رکن کا اضافہ کیا ہے۔ اول سے آخر تک بحر وہی ہے، البتہ قافیے کی اَدل بَدل میں مذکر و مونث کا فرق پڑتا ہے۔ بالکل مثنوی کا انداز ہے۔ شیخ سعدی کے "اپی گراف" والے وزن "فعولن، فعولن، فعولن، فعول" سے اسے قربت بھی ہے۔[1]

"بنجارے" نظم کی بحر بار بار بدل جاتی ہے، یامب (ямб) کی بحر "خرے ئی" (хорей) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کرداروں کی حرکات، سکنات کی قطار قاعدے سے چلتی ہے اور جہاں پوشکن اس قطار کو جھٹکا دینا چاہتا ہے، "بھریں توڑ کر کچھ سے کچھ کر لیتا ہے؛ پرندے کیسے آزاد پھرتے ہیں!" موسمی گانوں کے انداز پر ہے اور زمفیرا کے لبوں پر خانہ بدوش عورتوں کا برہنہ گیت قطعی خانہ بدوش گیتوں کی دُھن میں۔ بظاہر تو یہ ایک چلتی

---

[1] میں نے پوشکن اور سعدی کے درمیانی وزن سے کام لیا جو اردو کی بعض انتہائی جذباتی مثنویوں میں استعمال ہو چکا ہے، فاعلاتن مفاعلن فعلن

ہوئی ڈرامائی نظم ہے، جسے پوشکن کے رومانوی دور کی معراجِ کمال قرار دیا گیا ہے لیکن اس نظم نے کلاسکی شاعری کو کئی مرحلے پیچھے چھوڑ کر جدید یورپی شاعری کے شانہ بشانہ چلنے کی راہ دکھائی۔ محبت، رقابت اور قتل کے مثلث کو یوں شاعرانہ شدت اور بیان کی صداقت کے ساتھ پیش کیا کہ روس کو اپنا جانا پہچانا اوتھیلو (Othello) میسر آگیا اور بعد کے لکھنے والوں کو جیتا جاگتا نمونہ — یرمنتوف اور لیو تالستائی نے تو اپنی جنوبی کہانیوں کے لیے براہ راست، اسی نمونے سے رنگ و آہنگ لیا اور کرداروں کی روپ ریکھا بنائی۔ ڈنمارک کے شہزادے ہیملٹ کی طرح روسی امیرزادہ "الیکو" بھی اپنی روح کی بے تابی اور وسوسوں سے بے خبر، لیکن بھرپور ٹریجیڈی کا نشانہ بننے کو تیار ہے۔

پوشکن کے ہاں شاعری مقصود بالذات ہے،

مگر ساتھ ہی شاعری ایک ذریعہ ہے ذہنی بیداری، نشاط اور زندگی سے ہم آہنگ ہونے کا۔ اس کے ہاں جسمانی اور روحانی لذتوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں، وہ شاعری کو مصوری اور موسیقی سے جدا نہیں کرتا۔ حرفوں اور آوازوں کی ترتیب میں، ہر قدم پر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ لکھتے وقت اشیا اور افعال کو حرکت میں دیکھتا جاتا ہے؛ ایک ہی مقام پر کھڑے کھڑے پاؤں نہیں پٹکتا، بلکہ الفاظ و آواز کے ساتھ خود حرکت میں ہے۔ اس کی تائید دو سمتوں سے ہوتی ہے: (۱) عالمِ فطرت کا بیان اس کے ہاں مناظر یا اُن کے شاعرانہ تاثر یا کیفیت کا بیان نہیں، بلکہ انسانی وجود کے ساتھ، چلتے پھرتے انسانوں، کرداروں سے وابستہ متحرک اور جاندار فطرت کا بیان ہے[1]

وہ جاڑوں کی صبح ہو یا شام، قفقاز کی پہاڑیاں یا چشمے؛ گاؤں کے میلے ہوں یا مٹر مٹی کھیت، ہر مقام پر فطرت تب تک سرد مہر، بے جان اور بے معنی ہے جب تک کسی انسانی ہستی کا دل اس میں نہ دھڑک رہا ہو۔ (۲) جب کسی منظر کو بیان کرتے کرتے قلم یا ذہن اٹکتا ہے تو جا بجا اس کے مسودوں میں تصویریں بنی نظر آتی ہیں۔ گویا شاعر کا ذہن آنکھوں کی راہ سے باہر کے منظر کو جھانک رہا ہے۔ فکرِ سخن کرتے وقت وہ کاغذ کو، مصوّر کی طرح رنگتا، خاکے اُبھارتا، مٹاتا نظر آتا ہے۔ بنجاروں کے "ٹبّر"، خیمے، یا پڑاؤ کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے سے پہلے اس نے لائنوں اور چہروں کے جامے میں اُتارا اور پھر کلامِ موزوں کی صورت دی۔ یہ تصویریں آج تک اس کی مصوّرانہ صلاحیت پر گواہی دیتی ہیں اور فنّی (یا تخلیقی) اسرار ہم پر کھول دیتی ہیں۔ اسی سے ہم جانتے ہیں کہ پوشکن کے ہاں شاعرانہ عمل داخلی ہونے کے ساتھ لازمی طور پر خارجی بھی ہے جسے ہم بصری کہہ سکتے۔ یہاں اُڈ

---

[1] اس صفت یا خصوصیت میں میرانیس پوشکن کے شریک ہیں۔

جواس کے بعد کے روسی حقیقت پسند مکتب سخن کا وطیرہ ٹھیرا۔ مگر شاعرانہ حقیقت پسندی صرف مصوّرانہ صلاحیت سے سیراب نہیں ہوتی۔ اسے اور بہت کچھ چاہیے، بہت کچھ نہیں بلکہ سب کچھ۔ خیال لفظوں اور ترکیبوں کی قطار اندر قطار صفوں میں سے اُنہیں کو چھانٹنا چاہتا ہے جو آوازوں کی ہم آہنگی کے معیار پر پورے اُتریں۔ آواز حرف کی بھی ہوتی ہے، حرکت و سکون کی بھی — اور کئی کئی لفظوں کے جوڑ سے بھی کسی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ جو آوازیں مل کر ایک خاص طرح کا موڈ، ایک مخصوص کیفیت پیدا کریں، ایک تصویر ابھار دیں، ان آوازوں پر زبان لفظوں کا ذائقہ پاتی ہے — اور سارے حواس بیک وقت محظوظ ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر: Медныт всадник

لحیم شحیم بلند بالا، مردانہ جلال کا پیکر پیٹر اعظم ایک ساحلی مقام پر آکر ٹھیرتا ہے۔ قدم گاڑ کر دریائے نیوا کے دہانے پر کھڑا ہو جاتا ہے، سوچتا ہے کہ یہ ہے وہ کٹا پھٹا ساحل جہاں ہمارے ملک کا عظیم الشان بندرگاہ اور پائے تخت تعمیر ہونا چاہیے تاکہ یوروپ کی طرف کھڑکی چوپٹ کھلے اور ہمارے حریف ممالک آنکھوں کے سامنے رہیں۔

پوشکن اپنی معرکہ آرا نظم "تانبے کا سوار" اس منظر سے شروع کرتا ہے۔ آوازیں ایک پُرجلال موسیقی میں ڈھلتی ہیں:

نَ بِرِ یے گو، پُستینِن، یخ وولن
ستایال اُون
دُوم ولیکیخ پوئن

ای وِ دال گلیادیل

بحر کا انتخاب، آوازوں کی ترتیب، "وولن"، "اون" اور "پوئن" کے قافیے میں لہر کی کیفیت سب مل ملا کر ایک تاثیر رکھتی ہیں۔ طوفانی دریا، حوصلہ مند بادشاہ اور بنیاد رکھنے کا عزم ان آوازوں کی چلمن سے قندیل کی روشنی کی طرح جھلک رہا ہے۔

یا مثلاً سائبیریا میں جلاوطن، ستم زدہ انقلابی دوستوں کے نام پیغام بھیجا جا رہا ہے۔ اس کی شروع کی آوازوں کے جوڑ، بندشِ الفاظ اور حروف کی ترتیب ستم زدگی کا، فریاد کا لہجہ پیدا کر دیتے ہیں!

وُ گلوبے سیبر سکیخ رُوْد
خرانی تے گوردا ترپے نیے،

نی بَرائی دیوت داشس سکورب نی تروُد

ای وُدم دِسوکوئے اِسترم لے نیے

ہر ایک مصرعہ "د" کی آواز کو "اُو" اور "ای" سے بار بار جوڑتا ہے۔ بظاہر یہ معمولی سی اور محض اتفاقی بات ہے، درحقیقت اس مقام تک پہنچنے کے لئے موسیقی کا گہرا احساس درکار ہے۔

کوئی ناپ تول کر نہیں بتا سکتا کہ شاعر کو الگ سے سنگیت کا گیان درکار ہے، اور کتنا، مگر دنیا کی اعلیٰ درجے کی شاعری موسیقی کے شعور سے محروم کبھی نہیں رہی، مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ موسیقی کا گیان اُس کی گھٹی میں پڑا ہے۔ پوشکن کو بچپن سے یہ شعور میسّر آیا۔ جن محفلوں میں رہا، وہاں گِٹار سے لے کر رِیال (شاہی پیانو) کی درباری موسیقی تک روزمرہ کی بات تھی۔ پیانو پر اُنگلیاں پھیرنے کے علاوہ اچھے کلاسیکی سازندوں کو داد دینے کی تمیز بھی تھی۔ خود اس کے کلام سے ثبوت ملتے ہیں کہ وہ اپنے وقت میں موسیقی کا اہلِ ذوق شمار ہوتا ہوگا۔ اپنے مصرعوں اور جملوں کو بدلتے وقت بھی اس نے اُن کی آوازوں کو مدِّ نظر رکھا ہے۔ جہاں کیفیت کا پُرسکون بہاؤ دکھانا مقصود ہے وہاں حروف لگے لگے سرک رہے ہیں گویا ساحل سے کسی ندی کی لہریں اور جہاں جنگ کا شدید ٹکراؤ کا ماحول پیدا کرتا ہے، وہاں ثقیل آوازیں طبلِ جنگ کی طرح دھواں دھوں چلتی ہیں۔ بیلے جو سنگیت کی رُوح اور ڈرامائی کیفیت کو انسانی جسم کے سانچے میں ڈھالنے اور خم و چم، گردش و لرزش میں ادا کر دینے کا آرٹ ہے، پوشکن کو جی جان سے پسند تھا۔ تھیٹر میں اس کی کرسی مخصوص تھی اور اسٹیج کی فنکاری کے اہلِ نظر اس کی نظر دیکھا کرتے تھے۔ فرانس کے بعد اس نے جو انگلستان کی طرف توجہ موڑی تو اس میں انگریزی ڈرامے کا بڑا دخل تھا۔ اس نے انگریزی ادب جم کر پڑھا۔ اوروں کو پڑھنے کی ترغیب دی کہ کہیں نوجوان روسی دانشور اپنے حال میں مگن اور اپنی کھال میں مست نہ رہے۔ اسی پر بس نہیں کی۔ یوروپ کی موسیقی، بحروں اور آوازوں کے علاوہ ادائیگی اور اظہار کے سوا اس نے "جھالردار" مشرق، رنگین، سہانے "دانایانِ مشرق" کے ادب اور موسیقی کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھا۔ "قرآن" کے لہجے کا اثر لیا، حافظ شیرازی کے انداز میں ایک پوری نظم اور کئی مصرعے ڈھالے، سعدی اور خیام کا مطالعہ کیا اور سنسکرت ڈرامے سے آگاہی حاصل کر کے "شکنتلا" کے پلاٹ کو اپنایا آرٹ کے ہر ایک گوشے میں، پھولوں کے ایک ایک تختے میں ہاتھ ڈال کر اس نے ذہن و زبان کی آرائش کی۔ یہ سارے رنگ اس کے ہاں ایک خاص سلیقے سے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ یہی تاثرات ہیں جو پوشکن کی تحریروں میں تاثیر بڑھانے کا سبب بنے ہیں۔ تبھی تو بعد کے نغمہ نگاروں نے رِمسکی کرسکوف اور چائکوفسکی نے اس کے کلام کو نغماتی شاہکاروں میں ڈھالا اور کامیاب رہے۔

اگرچہ اس نے اپنے ہمعصر جرمن شعراء کی پیروی میں کوئی Oct—West Diwan [1] ترتیب نہیں دیا۔ تاہم اگر جا بجا سے ٹکڑے چن کر جمع کئے جائیں تو پوشکن کا "دیوانِ مشرق" ترتیب پا سکتا ہے اور یہ بھی روسی شعراء کے لئے ایک مثالی عمل ثابت ہوا کیونکہ لیئے نن جیسے غنائی شاعر اور گورکی جیسے منفرد افسانہ نگار نے اس کا اثر تسلیم کیا ہے۔

پوشکن کے دور تک نثر کا نوخیز پودا کلاسکی شاعری کے گھنے برگد کی چھتر چھایا میں دبا ہوا تھا۔ اس کے ورود سے ذرا پہلے نثر کے مستقبل پر اور اس کے روش پر بحث چھڑ چکی تھی، کرامزین مورخ نے نعرہ بلند کیا کہ "لکھو، جیسے بولتے ہو"۔۔۔ یعنی گفتگو اور بیان کی زندہ زبان کو ادب میں فروغ دیا جائے۔ بستوژوف نے لکھا کہ :۔ ایک بچہ بھی پہ کارکی طرف تو بعد میں کھنچتا ہے، پہلے اُسے جھنجھنا اچھا لگتا ہے۔ نثر کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی صرف زبان کے قواعد نہیں بلکہ دلیل و ہوشمندی کی قواعد کا علم بھی رکھتا ہو، آوازوں کی ہم آہنگی اور زیر و بم پر قابو ہو، افعال کو ربط دے سکے، نثر تکرار کو بالکل برداشت نہیں کرتی۔ تبھی تو ہمارے ہاں شاعر بہت ہیں نثر نگار ناپید ......" خود بستوژوف وہ نثر نہ دے سکا جو نظم کے ٹکڑوں سے آراستہ نہ ہو۔ وہ نثر پوشکن نے دی۔ اس نے تجربے اور بحث سے ایک اُصول اخذ کیا ...... کیسے لوگ ہیں! کہنا صرف اتنا ہے کہ "صبح تڑکے" اور لکھتے ہیں کہ :۔

> ابھی آفتابِ عالمتاب کی اوّلین شعاعوں نے نمودار ہو کر شفق آلود آسمان کے مشرقی کناروں کو اپنا نورانی جلوہ نہیں دکھایا تھا کہ ......

بھلا اس آرائش بے جا کی ضرورت؟ وہ عام آدمی جو غیر ملکی ادب سے بے خبر ہے، فرنچ میں اپنے خیال کا اظہار نہیں جانتا، اس کے پاس بھی تو کوئی زبان ہوگی! الفیری (۱۸ ویں صدی کے اطالوی ڈرامہ نگار) نے اطالوی زبان فلورنس کے بازاروں میں سیکھی، کیا حرج ہے جو ہم بھی ماسکو کی شاہراہوں پر عام گفتگو غور سے سن لیا کریں! یہ لوگ کتنی صاف، شستہ، ٹکسالی زبان بولتے ہیں، تعجب!" [2]

نظم سے نثر کی طرف کوچ کرنے میں اس نے پہلا پڑاؤ ڈالا نظم و نثر ملے ڈرامے بوریس گودونوف کی تصنیف پر، ڈرامہ ناکام رہا۔ اگرچہ پوشکن ڈرامے کے فن میں کامیاب نہیں ہو سکا، تاہم ڈرامہ اس کے

---

[1] گوئٹے کا مشہور دیوان مشرق و مغرب، جس کے جواب میں اقبال نے "پیامِ مشرق" ترتیب دی۔ اور جس میں فارسی کے کلاسکی غزل گو شعرا کا رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ (ظ ا)

[2] میر نے اپنے لسانی معترضوں کو اسی طرح کا جواب دیا تھا کہ ہم تو جامع مسجد (دہلی) (فٹ نوٹ جاری)

فن سے ضرور فیضیاب ہوا، آج تک ہوتا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اخباری مضامین، روزنامچہ، تفریحی نوٹ Table Talk لکھنے کے دوران ہی اس نے مختصر افسانے (نام بدل کر، فرضی تمہید گانٹھ کر) لکھ ڈالے اور ان کی عام پسندیدگی کے فوراً بعد عوامی قصوں، مغربی سلاف جن گیتوں پر قلم اُٹھایا ـــــ یہاں تک کہ ایک طرف کسان بغاوت کی تاریخ تیار ہوئی دوسری طرف اس پر مبنی تاریخی ناول "کپتان کی بیٹی" جسے روسی نثر میں وہی درجہ حاصل ہے جو منظوم ناول "...... اینے گن" کو روسی شاعری میں، پھر ناولٹ لکھ ڈالا "حکم کی بیگم" اور احباب کے نام بے تکلف ادبی غیر ادبی، سوانحی اور تفریحی خطوط لکھتے وقت نثر نگاری کو ہر ایک حلقۂ زنجیر سے، فاصلے کے احساس سے آزاد کر دیا ؟ گویا "مراسلے کو مکالمہ بنا دیا" لڑکپن سے جو آرزو تھی کہ شاعرانہ قوتِ تخلیق کو نثر کی ترقی میں ـــــ بلکہ نثر کو شعر کے دباؤ سے آزاد کرنے میں صرف کیا جائے وہ عمر کے آخری سات آٹھ برس میں پوری ہوئی ـــــ یہ زمانہ اس کی شاعری کے زوال کا نہیں، عروج کا زمانہ تھا۔ اور اس کی مختصر، سادہ، دو ٹوک، سلیس اور دلکش، شاعرانہ رچاؤ کے ساتھ منطقی یا علمی سبھاؤ والی نثر نے گویا ایک ساتھ اعلان کر دیا کہ روسی شاعری کا دورِ شباب ہو چکا، اب نثر کا وقت آتا ہے۔ یہ وقت ۱۸۳۴ء سے، گوگول اور تورگینف کے افسانوں اور مضامین سے شروع ہوا اور دستوئیفسکی، لیو تالستائی، چیخف، ایلیٹ پتروف، اور گورکی سے ہوتا ہوا پسترناک اور شولوخوف کے عالمی شاہکاروں تک لگاتار چلتا رہا۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا، اُس کی مختصر، بھرپور اور رنگارنگ زندگی نفی و اثبات کی شدید کشمکش میں گزری ـــــ "جو ہو تو کیوں کر ہو"؟ پوشکن کی زندگی اور فن دونوں میں ہر ایک مذاق، ہر ایک دعوے کا کچھ نہ کچھ ثبوت موجود ہے۔ جو چاہے، جیسے چاہے اور جیسا چاہے، ثابت کرے، ثبوت خود پوشکن مہیا کر دے گا۔ آنکھ بند ہونے سے دو سال پہلے اس پر یہ بپتا پڑی کہ نوجوان اہلِ قلم، سرکش دانشور اسے حیرت اور شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے، آنکھ بند ہونے کے بعد بھی کئی بار " Revaluation " (نئی تول) کے بہانے پوشکن کو ملامت کا نشانہ بنایا گیا۔

۱۸۹۹ء میں، جب پوشکن کی پہلی شتابدی (صد سالہ سالگرہ) منائی جا رہی تھی، کسی خفیہ جماعت نے اہلِ قلم کی طرف سے دستی اشتہار نکالا کہ "وہ عوام کا نہیں، بادشاہ کا حمایتی تھا، شرفا اور اُمرا کا طرفدار تھا"۔ لیکن اب اس جوانا مرگ جی نی یس کو گزرے اتنا زمانہ ہو چکا ہے کہ ہم انقلاب کے حامی، ورنہ، مخالف ہو کر بھی کسی ایک رائے

← کی سیڑھیوں پر زبان کی سند لیتے ہیں۔

پر ٹھہر سکتے ہیں، ایک ایسی رائے پر، جو وقتی مصلحت سے آزاد ہو۔

پوشکن کی تمام زندگی ——— اور ساتھ ہی اس کی نظم و نثر کی وہ دس جلدیں، جو اکاڈیمی آف سائنسز نے اہتمام اور احترام کے ساتھ شائع کر دی ہیں اور جو بمشکل ۲۵ برس کی ذہنی کاوش کا حاصل ہیں، دبی زبان سے میر کے اس رمز کا اعلان کرتی ہیں ؎

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر، میں ناکامیوں سے کام لیا

عمر کے جس مرحلے پر، ارمانوں کو جتنی شدید ناکامیوں سے سابقہ پڑا، عین انہی دنوں پوشکن نے اپنے فن میں اتنے ہی معرکے سر کئے ——— "ناکامیوں سے کام لیا"۔

میخائیلوفسکوئے گاؤں کی نظربندی سے لے کر بولدی نو گاؤں کی دوسری تنہائی تک دس برس کا زمانہ ہے۔ (۱۸۲۴-۳۴ء) ——— بس یہی اس کے کمالِ فن کا، نظم، نثر، فن، تنقید، خطوط نویسی، مطالعے اور غور و فکر کا بہترین بار آور زمانہ ہے ——— نہ اس سے پہلے کبھی اتنا لکھا، ایسے یادگار تجربے کئے، نہ اس کے بعد مسلسل اضطرابوں میں زندگی کرنے والا یہ فنکار سکون، خاموشی اور تنہائی کا تمنائی ہے، جب اسے خزاں کے موسم میں شہر کے جھمیلوں سے، دربار کے طمطراق سے دور یہ نعمت میسّر آجاتی ہے، وہ اس کا زیادہ سے زیادہ رس نچوڑ لیتا ہے اور کاغذ کے حوالے کر دیتا ہے۔

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

زندگی کی ہر ایک رنگینی، ہر ایک حُسن، ہر ایک زیرِ لب نغمے کو اپنی رگوں میں دوڑنے والے لہو کے ساتھ، اس کی گردش کے ساتھ ہم آہنگ پانے کے باوجود پوشکن پر خود زندگی نے ہی یہ راز فاش کر دیا ہوگا کہ لفظ، معنی، مضمون اور خیال غیبی امانت ہیں، فن میں ان کا اظہار کسی مقررہ اصول یا فارمولے سے ٹکراتا ہو تو بلا سے ٹکرائے، مگر اسے شرمانا نہیں چاہیے۔ کامیاب اظہار خود ایک بے پناہ لذت کا ضامن ہے:۔

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا

اس نے جان کھپا دی اُدب کی نازک سی پگڈنڈی کو عوامی لب و لہجہ کی شاہراہ سے ملانے میں، ندیوں کو دریاؤں سے جوڑنے میں، شاعری کے تمام ذخیرے اور تجربے کو نثر کا گھر بھرنے میں، صحافت (جرنلزم) کو ادبی وقار اور سماجی مرتبہ دلوانے میں اور فنِ تنقید کو سائنسی ناپ تول کے قریب پہنچانے میں، قدم قدم پر روسی مزاج کو طنز و مزاح کا نشانہ بنانے والا، ملک سے فرار کی کوشش کرنے والا یہ شاعر اپنی قوم کو،

تھوڑی سی عمر اور بہت سی بندشوں کے باوجود، وہ کچھ دے چکا تھا جو ورجل نے روم کو، فردوسی نے ایران کو شکسپیئر نے انگلستان کو اور تلسی داس نے ہندوستان کو عطا کیا۔ روسی زبان و ادب اپنی قومی سرحدوں کی دیواروں سے اُچک کر باہر دیکھنے اور سیکھنے یا نقالی کرنے سے آزاد ہو گئے۔ اور انہوں نے پوشکن کی انگلی تھام کر "قومی صداقت[1]" کی تلاش شروع کر دی۔

شاعر یر منتوف، براتنسکی اور کز یوف سے لے کر آج کے دن ایوتوشینکو اور وزنے سینکی تک جنہوں نے مغرب میں روسی شاعری کے جھنڈے گاڑ دیئے، کوئی نہیں جو یہ کہہ سکے کہ میں پوشکن کے اثرات سے بے نیاز ہوں؟ کوئی نہیں جس کے ہاں بحریں، بندشیں اور کیفیتیں پوشکن کی پرچھائیں سے بچ کر نکل گئی ہوں۔ یہ معاملہ کوئی شاعری تک محدود نہیں؟ شاعر چاہے علانیہ ہو، چاہے ڈھکا چھپا، وہی ایسی نثر لکھ سکتا ہے جو نثر کو شعر کی ترقی یافتہ شکل ثابت کرے، جو معاصر نثر کو مستقبل کی راہ دکھائے؟ پوشکن کی اخباری تحریروں، افسانوں اور بالآخر خطوط نویسی نے روسی انشا کو اس قابل بنایا کہ تورگنیف کو اپنے افسانوں کی دھوپ چھاؤں ملی۔ "پراشا" جیسا کردار اور اس کی زبان ملی، گوگول کو سنیٹ پیٹر سبورگ کی داستانیں نصیب ہوئیں، دستوئیفسکی کو اپنے وقت کے ایوگے نی اور تاتیانا، ہیرمن اور لیزا میسر آئے، نکراسوف داستانیں اور قصے نہ لکھ سکتا، اور لکھتا تو شاید کوئی انہیں پوچھتا بھی نہیں، ادب کے دربار میں داخلہ کبھی نہ ملتا، اگر اس رنگیلے، گہرے اور منہ زور شاعر نے اپنے فن کی پختگی کو عوامی داستانیں بیان کرنے، حقیقت اور افسانے کو، ادب اور بولی کو یکجان کرنے میں نہ کھپایا ہوتا۔ پسترناک اور مرشاک کو جرأت ہی نہ ہوتی کہ انگریزی ادب کے کلاسیکی شہپاروں کا منظوم ترجمہ کر کے شاعر کہلائیں اور ادب کی ٹکسال میں قدم رکھیں، اگر خود پوشکن نے دوسری زبانوں کے ادب کو بہترین روسی سانچوں میں نہ ڈھالا ہوتا، اگر اپنے ہمعصروں کو روسی ترجموں سے نہ نوازا ہوتا۔ اور آج تک یہ روایت چلی آتی ہے ____ یوتالستائی جیسے قدآور اور شہرۂ آفاق دانشور سے بڑھ کر اور کون چھاتی تان کر حامی بھرے گا کہ ہاں، ہم نے پوشکن سے بچوں کا ادب لکھنا سیکھا ہے۔ یوتالستائی نے نہ تو شاعری کی، نہ شاعری کا دعویٰ، لیکن اس کے ناولوں میں ہیرو اور ہیروئن کی جدائی کا، رخصت کا، خاموشی سے ہاتھ تھام کر درختوں کی آڑ میں گم ہو جانے کا منظر کوئی دیکھے ____ پتے یوں سرسراتے ہیں، لفظ اور استعارے یوں ہاتھ ملتے ہیں کہ پوشکن کے منظوم ناول "ایوگے نی ......" میں اُنے گن اور تاتیانا کی جدائی کا منظر یاد آ جاتا ہے۔ تورگینیف جیسا صاحبِ طرز اپنے شکارناموں میں پوشکن کے

---

[1] یہ اصطلاح پہلے پہل دستوئیفسکی نے زور شور کے ساتھ عمر کے آخری دور میں استعمال کی۔ انقلاب کے بعد والے روس نے دستوئیفسکی کو رد کرنے کے باوجود یہ اصطلاح اس کے دامن سے چن لی۔

"ڈ.بروفسکی" اور "گھوڑا چوکی کے منشی" جیسے کرداروں کی تصویر کشی کو گویا پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اور "دستوئیفسکی" جیسے عہد آفریں ناول نگار نے، کہ اپنے کردار کے سینے میں ضمیر کی طرح کھٹکتا ہے اور سر ٹپکتا ہے، کھلے لفظوں میں مان لیا کہ کردار کا نفسیاتی مطالعہ اس نے پوشکن کی بدولت جانا۔ ایک جانب فاتح اعظم پیٹر اوّل ہے، دوسری جانب ایک مفلس کلرک ایوگے نی ــــ مگر جب شاعر کی شاہکار نظم "تانبے کا سوار" (Медныт всадник) تمام ہوتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ پیٹر اعظم نہیں ــــ بدنصیب کلرک ہمارے خیالوں پر مسلّط اور ہماری زندگی میں شریک ہو گیا ہے۔ دُکھی آتماؤں کی گہرائی میں، خود بقول پوشکن "احساسات کے زینے" سے دبے پاؤں اُترنا دستوئیفسکی جیسے داستان گو نے پوشکن سے سیکھا اور پھر اس مقام کو پہنچا کہ علم نفسیات کے عالمی پیغمبر سگمنڈ فرائڈ نے دستوئیفسکی کے افسانوی بیان کو تعبیرِ خواب کے سائنسی نظریے میں نشاندہی اور نشانِ راہ کے طور پر استعمال کیا۔

پوشکن محض ایک بڑا شاعر نہیں ــــ بڑا اہلِ قلم، افسانہ نگار، مورّخ، تنقید نگار نہیں، ایک زندہ اور مہان آتما ہے جو روسی تہذیب اور اس کی معرفت عالمی تہذیب کے بدن میں دنیا کے چند بڑے فنکاروں کی طرح سما گئی ہے اور سمائی رہے گی :۔

چاندنی میں سانس لے جب تک کسی شاعر کا فن

طویل بیانیہ نظم
(مثنوی)

باغیچہ سرائے کا فوّارہ

ڈرامائی نظم

بنجارے

منظوم قصّہ

سونے کا مرغا

باغچہ سرائے کا فوّارہ

برین چشمہ چوں من بسے دم زدند
بَرَفتند و چوں چشم برہم زدند
چرا دل بریں کارواں گہ نہیم
کہ یاراں برفتند و مادر رہیم
(سعدی)

اپنی آنکھیں جھکائے گیری خاں
دمبدم چھوڑتا ہے منہ سے دھواں
ہاتھ باندھے کھڑے ہیں خدمتگار
ایک حلقے میں بے زباں، ناچار
ہر طرف اِک مُہیب سناّٹا
باادب ، با ملاحظہ ہے فضا
غم و غصہ دکھا رہا ہے اثر
خان کے اُدھ موئے سے چہرے پر
حاکمِ وقت نے اُٹھایا ہاتھ
اِک اشارہ کیا جلال کے ساتھ
بدحواسی میں فرش تکتے رہے
دے کے تعظیم سب سرکنے لگے

تھم کے دیوانِ خاص میں تنہا
بوجھ سینے کا کرلیا ہلکا
روح بے چین، دل میں تھی ہلچل
سخت ماتھے پہ، تیوری پر بل
جیسے لائیں گھٹائیں طوفانی
مَوج در مَوج اینڈتا پانی

روح کو اضطراب ہے کیسا؟
کن خیالوں میں گُم ہے، فکر ہے کیا؟
روس پرلے کے جائے گا لشکر
یا ہے پولینڈ اب کے پیشِ نظر؟
خوفناک انتقام کی شورش؟
یا کھُلی فوج میں کوئی سازش؟
سر اٹھایا پہاڑ والوں نے؟
یا "گینویا" کی تیز چالوں نے
اس کو یوں بدحواس کر ڈالا
کیسے عیاّر سے پڑا پالا!

اب ہیں بے لطف جنگ کی دھومیں
سر میں سودا نہ زور بازو میں
کیا خبر، ہو حرم کی بات کوئی
بے وفائی کی واردات کوئی
وہ جو اک نازنین کنیز ہے، کیا
کسی بے دین پر ہوئی ہے، فدا
نہیں، گیری کی عورتوں میں کہاں
یہ مجال، ایسے شوق، یہ ارماں!
من کے من میں دبا کے ملتی ہیں
غم کی باسی ہوائیں کھلتی ہیں
تن پہ پہرہ، خیال پر پہرہ
زندگی بھر خوشی سے بے بہرہ
قید خانہ ہے محل سرا ہے تمام
حُسن کی صبح اور قید کی شام
جیسے شیشے کے گھر میں درپردہ
پھول مہکے ہوں سایہ پروردہ
روز و شب، ماہ و سال جاتے ہیں
دے کے ان کو ملال جاتے ہیں
اور اُڑی جا رہی ہے ان کے سنگ
نوجوانی کی، عاشقی کی اُمنگ
ایک ڈھرّے پہ ہے جو روز کا حال
وقت چلتا ہے چیونٹی کی چال
کاہلی پر مدار کاموں کا
بھولے بھٹکے بہار کا جھونکا

ہیں جواں عورتیں، مچلتی ہیں؛
دل کے بہلانے کو بدلتی ہیں
ایک سے ایک شاندار لباس
چہلیں، آپس کی بات چیت، اُولاس
یا کہیں چہلچہلاتے دھاروں پر
صاف شفاف آبشاروں پر
گھومتی ہیں گھنے چنار تلے
جس طرح ہرنیوں کی ڈار چلے
بیچ میں اک خبیث خواجہ سرا
جس پہ چلتا نہیں کوئی حربہ؟
ان سبھوں پر لگے ہوئے دن رات
بدگماں کان اور نظر بد ذات؛
ہوشیاری کا، دَوڑ دھوپ کا پھل
قاعدے سخت اور اُن پہ عمل
ہے وہ قانون خان کا منشا
جس میں ممکن نہیں ہے چون وچرا
بلکہ قرآن پاک کا احکام
خان کے بعد واجب الاکرام
نہ محبت کی اُس کے دل کو پیاس
مورتی کی طرح نہ کچھ احساس
پھبتیاں، چھیڑ چھاڑ، صلواتیں
پھبتے فقرے، جلی کٹی باتیں
روٹھنا، منانا، التجا کرنا
آہ بھرنا ہو یا گلا کرنا

اس پہ کرتے نہیں ذرا بھی اثر
سارے تریا چرتر کی ہے خبر
کبھی بندہ رہا کبھی آزاد
گر بہت ہو گئے ہیں اس کو یاد
ہے لگاوٹ کی آنچ نرم نگاہ
آنسوؤں کی کٹیلی کڑوی ڈاہ
کوئی بھی ان میں سازگار نہیں
اس کو عورت کا اعتبار نہیں

عورتیں خواب ناز میں ہیں مگن
اور اسے مستقل یہی اُلجھن
کہ کوئی آہ سرد ، گہرا سانس
ہاتھ آئے کسی کے دل کی پھانس
نیند میں لے دیا جو غیر کا نام
ایسی غفلت کا ہے بُرا انجام
یا سہیلی کو پا کے نیک صفات
راز میں کہہ دی ایسی ویسی بات

جب ہو گرمی سے بے قرار بدن
یہ مقید جوانیاں فوراً
بال بکھرائے اپنے شانوں پر
تیرنے آ پہنچتی ہیں اکثر
جلتی چھاتی پہ لہر چھپک چھو ،
چلتے پانی میں حُسن کا جادو
ان کی اٹکھیلیوں میں بھی ہر بار
ہے اٹل پہرہ دار سر پہ سوار
دیکھے جاتا ہے بے جھجک ، بے ننگ
نازنینوں کے جسم ، ننگ دھڑنگ
چھائی ہو جب حرم پہ کالی رات
گشت کرتا ہے اس قدر محتاط
نرم قالین اور غالیچے
دم بخود اس کے پاؤں کے نیچے
کان چوروں کی طرح آہٹ پر
ایک سے دوسرے چھپر کھٹ پر

کیا ہوا ؟ کیوں اُداس ہے گیری ؟
جان سوکھی ہوئی ہے حقّے کی
سانس روکے کھڑا ہے خواجہ سرا
در پہ ہے منتظِر اشارے کا
حاکمِ وقت چل دیا اُٹھ کر
گُم سم اتنا کہ کچھ نہیں ہے خبر
باب کھلتے گئے جو پہنچا پاس
کل کے پیاروں کا ہے یہاں رنواس
بیچ میں ایک شوخ فوّارہ
چو طرف منتظر ہیں دل آرا
فرش پر نرم ریشمی قالین
ان پہ محفل جمی ہوئی رنگین
شوخیاں کھیلتی ہیں مکھڑوں پر
دیکھتی ہیں وہ حوض کا منظر
سنگِ مرمر کے صاف پانی میں
مچھلیاں ہیں بڑی روانی میں

پھینکے دیتی ہے کوئی متوالی
کان سے اپنے سونے کی بالی
گھومتی ہیں خواصیں لے کر جام
جن میں شربت مہک رہا ہے تمام
ناگہاں گونجنے لگا اک گیت
عورتوں نے نبھائی اپنی ریت

تاتاری گیت

۱

دنیا ہے دکھ درد کا ترکش، ہر ترکش میں تیر
رنج کے بدلے راحت دے ہے اک دن چرخِ پیر
زخموں کو مرہم بخشے ہے، اشکوں کو تاثیر
حج کرنے جاتے ہیں نصیبے والے پیر فقیر

۲

ہے وہ شہید نصیبے والا جس نے دے دی جان
جس کو تھے ڈینوب کنارے مرنے کے ارمان
خون بھرے چولے میں دولھا، واہ رے اس کی شان
جنّت جس کی راہ تکے ہے، حوریں ہیں قربان

۳

اس کے نصیبوں کا کیا کہنا، جس کو ملی سوغات
پیاری زریمہ نازوں پالی، چکنے چکنے پات
تجھ کو حرم میں چین دیا، پھولوں میں بسائی رات
جس نے تیرے ناز اٹھائے، پیار سے تھاما ہات

خود زریمہ کہاں ہے مہ پارہ؟
بزم کا حسن عشق کا تارہ
غم کے ہاتھوں نڈھال چہرہ زرد
اپنے گن گان سے بھی ہے دل سرد
جیسے آندھی میں جھول جائے درخت
سرنگوں وہ بھی ہو گئی ناوقت
زندگی نے تمام سکھ چھینے
جب سے بدلی ہے آنکھ گیری نے
بے وفائی کی بات اور ہے پر
حسن میں کون ہے تیرا ہمسر؟
اے گرُوزینہ، ہے تری شوبھا
دوہری چوٹی میں، چھپی ماتھا
تیری آنکھیں حسین متوالی
دن سے اُجلی ہیں، رات سے کالی
تیری آواز میں وہ دیپک راگ
شعلہ دیتی ہے جس سے تن کی آگ
کس کے بوسوں میں ہے یہ کاٹ یہ جوش
جو اُڑا دے بڑوں بڑوں کے ہوش؟
دل کی نگری جو تجھ سے ہو آباد
پھر کسی حُسن کو کرے کیوں یاد!
پر یہ بے درد بے رخا گیری!
کس طرح تجھ سے یوں نظر پھیری!

زریمہ: گرجستانی لڑکی کا نام۔ یہ علاقہ کرائمیا کے تاتاری خانوں کے زیرِ نگیں تھا۔ روسی میں گرجستان (جارجیا) کو گروزیہ اور وہاں والی کو "گروزیہ" کہتے ہیں (ظ۔ا)

سرد راتیں گزار دیتا ہے
پیار لیتا، نہ پیار دیتا ہے
جب سے پولینڈ کے بڑے گھر کی
اک حسینہ حرم میں لائی گئی

کچھ دنوں پہلے "ماریا" نوخیز
دُور کی کیاریوں میں تھی گُل ریز
کچھ دنوں پہلے اپنے مائکے میں
یوں مہکتی تھی جیسے پھول کھلیں
ناز کرتا تھا اس پہ بوڑھا باپ
اس کے جیون کا تھا یہی پرتاپ
بال ہٹ میں جو وہ مچل جائے
کیا مجال اس کا حکم ٹل جائے
باپ کو رات دن تھی فکر لگی
یہ چہیتی، یہ نور چشم مری
سُکھ اٹھائے، سدا ہو باغ و بہار
روح میں ہو کھٹک، نہ پاؤں میں خار
اور چلی جائے جب دلھن بن کر
شاد آباد ہو پیا کے گھر
چٹکیاں دل میں لیں گھنے سائے
اس کو بابل کا دیس یاد آئے
بن بیاہے دنوں کی بے فکری
خواب کی سی جھلک دکھائے کبھی
سارے گُن مَن پسند، سب میں رچاؤ
چال میں رکھ رکھاؤ، نرم سبھاؤ
گہرے نیلے نین، بدن چوکس
قدرتی حسن، حسن پر سب رس
گھر میں ہوتے تھے لوگ جب مدعو
وہ جگاتی رباب کا جادو؛
اہلِ دولت، امیر، منصب دار
ماریا "یک انار و صد بیمار"
نوجوانوں میں اس کے آرزومند
تھے بہت، پر ستم زدہ، لب بند
وہ تو الھڑ تھی، اس کو کیا معلوم
عشق ہوتا ہے کیا، خدا معلوم!
دل نہ تھا پریم کی پہیلی میں
دن بہلتے سکھی سہیلی میں
باپ کا قلعہ تھا خوشی کا گھر
عیش کی بجتی نوبت آٹھ پہر

کیا بہت مدتوں کی بات ہے یہ؟
نہیں، کچھ دن کی واردات ہے یہ
بڑھ کے طوفان کی طرح تاتار
آئے پولینڈ پر، کیا یلغار
آگ بھی بھس کو یوں کرے نہ بھسم
جیسے پھونکا انھوں نے سب اکدم
ملک آباد برکتوں والا
جنگ نے خاک میں رلا ڈالا
عیش غارت ہوا، نگر ویران
لُٹ گیا قلعہ، خشک و تر ویران

ماریا کی محل سرا تھی اجاڑ
پھر کھلی خاندان کی ہڑ واڑ
ہر طرف سوئے تھے بزرگ کئی
کھودی پہلو میں ایک قبر نئی
لاش تاج و علم لیے لیٹی
قبر میں باپ، قید میں بیٹی
اب ہے اندھیر نگری چوپٹ راج
ملک بدنام، مرد و زن محتاج

آہ، بغچہ سرا کے شاہ نشیں
ان میں وہ نازنین با تمکیں
سر چھپائے نڈھال روتی ہے
قید میں اپنی جان کھوتی ہے
اس مصیبت زدہ پہ کھا کے ترس
گیری اب ہو چکا ہے خود بے بس
وہ تو بھرتی ہے آہ رو رو کر
خان کی نیند ہو گئی دو بھر
یوں تو ہیں قاعدے حرم کے اٹوٹ
اس کو دے دی ہے ہر طرح کی چھوٹ
وہ جو ہے بد مزاج خواجہ سرا
گشت میں اس طرف نہیں آتا
سیج پر اس کی دیکھ بھال نہیں
گھور کر دیکھ لے مجال نہیں
غسل کو جب اتارتی ہے لباس
ساتھ ہے بس وہی کنیز خواص

خان ڈرتا ہے خود کہ یہ گلفام
قید میں ہو نہ اور بے آرام
تھا حرم سے الگ جو ایک وِلا
اس کو رہنے کے واسطے وہ مِلا
اس قدر پُر سکون تنہائی
روح گویا یہاں اتر آئی
اک طرف ہے شبیہہ پاک صفات
شمع جلتی ہے سامنے دن رات
دُکھ بھری آتما کو ہے دِلاسا
سونی دنیا میں اک امید ہے پاس
بس یہی روشنی عقیدے کی
بخشتی ہے سکون اور نیکی
یاد آتے ہیں راحتوں کے دن
خوشدلی کے زمانے اچھے دن
فاصلے پر ہیں دل جلی سکھیاں
اور یہاں رو رہی ہیں دو انکھیاں
ہر طرف راگ، رنگ، عیش، نشاط
اس میں تنہا وہ ایک عورت ذات
پاک دامن بچی ہوئی ہے ہنوز
معجزے کے حصار میں محفوظ
دل جو ہوتا ہے خود بڑا پاپی
اتنی بدمستیوں میں رہ کر بھی
شمعِ ایمان ہے جلائے ہوئے
اپنے خالق سے لو لگائے ہوئے

چھا گئی رات، چھپ گیا منظر
سبز کھیتوں پہ سُرمئی چادر؛
اب ہے چپ چاپ دیس "توریدا"
دور گونجا ترانہ بلبل کا
تھی ستاروں کی بزم موسیقی
چاند ابھرا ہے اوٹ سے ان کی
دشت و صحرا کہ گھاٹیاں ٹیلے
جس کو پینا ہو چاندنی پی لے
ہیں جو بغچہ سرائے کی گلیاں
اُن میں پرَ چھائیاں ہیں تیز رواں
تن چھپائے سفید چادر میں
چل کے اک گھر سے دوسرے گھر میں
سوفتے ہیں زنانِ تاتاری
گپ لگانے چلی ہیں بے چاری
سو چکا ہے حرم، محل چپ ہے
راحتوں میں نہیں مخل کوئی شے
رات کا یہ سکون، یہ آرام
بے خلل ہے، بنا ہوا ہے نظام
ہے نگہبان اعتبار کی چیز
جھانک لی اُس نے ایک اک دہلیز
یوں تو اب وہ بھی سو رہا ہے مگر
دل میں خدشے ہیں، جان کانٹوں پر
ہو نہ کوئی دغا فریب کہیں
آنکھ لگتی ہے پر قرار نہیں

شک گزرتا ہے اس کو خواہ مخواہ
یہ تھی آہٹ، کھُسر پھُسر یا آہ؟
جھوٹ افواہ نے بھرے ہیں کان
چونکتا ہے، خطا ہیں سب اوسان
وہ کنوتی بدل کے ہے تیار
اور یہاں سو رہا ہے سب سنسار
تلملاتے ہیں صرف فوّارے
سنگ مرمر کی قید کے مارے
بلبلیں جن کی جانِ جاں ہیں گلاب
چہچہاتی ہیں رات کو بے تاب
سنتے سنتے یہ راگ خواجہ سرا
کھا ہی جاتا ہے نیند کا جھونکا

کتنی پیاری ہیں سانولی راتیں
مشرقی حسن کی یہ سوغاتیں!
یہ شرف امتِ رسول کو ہے
رات کرتی ہے کس مزے میں طے!
کتنی آسائش ان کے گھر آنگن
دل رُبا باغ دل نواز چمن
ہیں حرم ان کے گلشنِ بے خار؛
جب نکھرتی ہے چاندنی پہ بہار
کُل فضا پُر سکون راز بھری
جھوم جاتی ہے دل کی شاخ ہری

بیبیاں سو چکی ہیں، ایک مگر
سانس روکے ہوئے اٹھی ہے اِدھر
دھیرے دھیرے چلی دبے قدموں
کھولا دروازہ کانپتے ہاتھوں
رات بھیگی، حرم کا پہریدار
کچھ تو غافل پڑا ہے، کچھ بیدار
بال پکّے ہیں، نیند ہے کچّی
سونا جھوٹا ہے، آلکس سچّی
بے مروّت ہے اس کا پتھر دل
سَن سے وہ پار کر گئی یہ سِل

در پہ باہر پڑا ہوا تالا
تھرتھری چھوٹی ہاتھ جب ڈالا
اس نے رکھّا ہی تھا قدم اندر
اُڑ گئے ہوش دیکھ کر منظر:
ایک جانب ہے گوشۂ انجیل
ٹمٹماتی ہے سامنے قندیل،
بی بی مریم کی پاک پیشانی
کچھ اُداسی کے ساتھ نورانی
اسی گوشے میں روشنی کے قریب
الفت پاک کا نشان صلیب
اک نظر میں بدل گیا تَن مَن
کیوں گروزینہ، ہے نا اپنا پَن
بھولے بسرے دنوں کی آوازیں
جاگ اٹھیں، گونجنے لگیں دل میں

سوئی ہے روتے روتے شہزادی
نیند کی ماتی، خواب کی عادی
نوجوانی کے خواب میٹھے سال
تمتماتے ہیں ان کی آنچ سے گال
کچھ تبسم، کچھ آنسوؤں کے نشان
بھیگے پھولوں کی چاندنی میں اٹھان
گویا نازل ہوا فلک سے ملک
لیٹتے ہی جھپک گئی ہے پلک
خستہ حالت حرم کے قیدی کی
دیکھ کر رو دیا فرشتہ بھی
اے زریمہ، یہ کیا ہوا تجھ کو؟
غم نے بے حال کر دیا تجھ کو
بے خودی میں جھکا رہی ہے سر
دوہری ہو کر کھڑی ہے گھٹنوں پر:
"عرض سن لو مری، نہ ٹھکراؤ
حال پر میرے کچھ ترس کھاؤ"
آہٹ اور اس پہ التجا کی صدا
نیند کا نرم تار ٹوٹ گیا
آنکھ کھولی تو ڈر گئی لڑکی
اجنبی صورت ایک سامنے تھی
اس کو اوپر اٹھاتے لرزے ہاتھ
پوچھی گھبرا کے صرف اتنی بات
"کون ہو تم؟ اکیلی رات گئے
کس لیے آئی ہو یہاں؟ کیسے؟"

"میں مدد مانگنے تمھارے پاس
آئی ہوں بس بچی ہے ایک ہی آس
مدّتوں سے کھلے تھے میرے بھاگ
چین ہر دن، ہر ایک رات سہاگ
عیش کا کیا ہے، ڈھلتی پھرتی چھاؤں
بھاگ پھوٹے، پلٹ گیا ہر داؤں

سُن یہ بپتا کہ میں یہاں کی نہیں
آنکھ کھولی تھی دور دیس کہیں
ہائے وہ دن، وہ ان کی اک اک چیز
اب بھی یادوں میں نقش ہے تعویذ
اونچے پربت تھے آسمانوں تک
گرم دھاروں کی تھروں میں بھبک
جنگل ایسے گھنے کہ ہو نہ گزار،
دوسرے قاعدے الگ اطوار
جانے قسمت میں کیا لکھا تھا کیوں
گھر سے نکلی تو دور اب تک ہوں
یاد ہے بس کہ تھا کہیں ساگر
آدمی بادبان کے اوپر
ایک وہ دن — پھر اس کے بعد مجھے
غم سے پالا پڑا نہ دہشت سے
یہ حرم پُر سکون رنگ محل
اس میں پھوٹی — کھلی مری کونپل
تھی محبت کی پہلی تجربہ گاہ
دل کو سمجھا کے دیکھتی تھی راہ
زندگی نے جو لی اک انگڑائی
میرے دل کی مراد بر آئی؛
خان جب کر چکا بہت یلغار
اور لہو پی کے چھک گئی تلوار
قتل و غارت گری سے اُکتایا
اُس کو گھر کا سُکون یاد آیا
ہم ہوئے پیش، ہم سے چار کی آنکھ
کھُل گئی شوق و انتظار کی آنکھ
اُس نے خاموش ایک خاص نظر
مجھ پہ ڈالی بدل گئے تیور
چُن لیا مجھ کو — اور اس دن سے
عیش میں ہم نے دن گذار دیے
بدگمانی، رذالتیں، بہتان
دکھ رقابت کا، مفت کے خلجان
ہم میں حائل ہوئے نہ ایک دفعہ
میں نے اب تک نہیں سہی ہے جفا
ماریا، جب تمھارے سبز قدم
آئے، تم پر ہوئی نگاہِ کرم
اب وہ لیتا ہے بے وفائی کے سانس
ہے نیت میں فتور، جُرم کی پھانس
طعنے تشنے ہیں میرے سب بیکار
رونا دھونا بھی اس کے دل پر بار
نہ وہ اگلے سے شوق کے جذبات
نہ وہ پہلی سی بات میرے ساتھ

جانتی ہوں کہ بے خطا ہو تم
جُرم سے پاک پارسا ہو تم
پھر بھی سن لو، تمھیں سنا ڈالوں
خوبصورت تھی میں اور اب بھی ہوں
اِس حرم میں کوئی تمھارے سوا
بن نہیں سکتا راہ کا کانٹا
آگ تن من کی ہے مری ہستی
تم کہاں جانو پیار کی مستی
تم ہو اک سرد حسن، لاحاصل
کیوں کھُرچتی ہو اس کا نازک دل
چھوڑ دو اس کو، ہے مرا گیری
اس کے بوسوں کی آنچ ہے میری
مجھ سے کھائی تو تھیں بڑی قسمیں
لیکن اب دل نہیں رہا بس میں
آرزو ہو کوئی اسے کہ ملال
مدتوں میں رہی ہوں شاملِ حال
اب نہ گیری ہے وہ، نہ میں ہمراز
مار ڈالیں گے مجھ کو یہ انداز
دیکھتی ہو، ٹپک پڑے آنسو
ہوں تمھارے حضور دو زانو
تم کو الزام دوں مجال نہیں
ہاں یہ ہے التجا سوال نہیں
بخش دو وہ خوشی، وہ دل کا قرار
پھیر دو گیری، اس کا پچھلا پیار
ہے وہ میرا ہی مان لو۔ لیکن
اس کو کچھ سوجھتا نہیں تم بن
دل دکھا کر، جھڑک کے کہہ سن کے
پھیر دو جیسے چاہو اپنے سے
اب قسم کھاؤ (اگرچہ القرآن
دیکھا دیکھی بنا مرا ایمان
ماں تھیں لیکن تمھاری ہم مذہب
میں تو بھولی، تمھیں وہ یاد ہے سب)
اسی مذہب کی تم قسم کھانا
گیری میرا ہے، مجھ کو لوٹانا
ورنہ سُن رکھو، ہے زریمہ نام
مجھ سے اب تک پڑا نہ ہو گا کام
ایک خنجر بھی رکھتی ہوں بس میں
خون قفقاز کا ہے نَس نَس میں"

یہ کہا اور ہوئی نگاہ سے دور
دیکھتی رہ گئی وہیں مجبور
ناز پروردہ بے گنہ لڑکی
یہ کٹیلی زباں نہیں سمجھی
پر وہ گولی سی مشتعل آواز
بن گئی اک عجب بھیانک راز
آنسوؤں میں ہے یا دعا میں نجات؟
کیا کرے، شرمناک ہے اوقات
آگے ہوتا ہے، دیکھیے، کیا کیا
نوجوانی میں ہے بھگتنا کیا؟

داشتہ بن کے کاٹتے ہیں دن ؟
کیسی آتی ہے اس خیال سے گھن !
یا الٰہی ، یہ ہو کہ اب گیری
قیدِ تنہائی میں نہ آئے کبھی
بھول جائے کہ تھی کوئی کم بخت
یا یہ قیدِ حیات ہی یک لخت
ٹوٹ جائے کہ ہو یہ قصّہ پاک
ماریا چوم لے خوشی سے خاک
زندگی کے وہ قیمتی لمحے
وقت کے ساتھ اڑ گئے ، نہ رہے
کس کرم کا ہے اب یہ ویرانہ !
وقت رخصت ہے ماریا ۔ جانا
منتظر ہے سکون کی آغوش
مُسکرا کر پکارتے ہیں سروش

اب نہیں ماریا ، سدھار گئی
وہ یتیمی کے دن گزار گئی
اتنی مدّت سے تھی جہاں کی لگن
اپسرا نے وہیں دیے درشن
کیا خبر کس سے پائی قبر کی راہ
روگ یا بے بسی کہ سوتیا ڈاہ ؟
ماریا تھی تو یہ بھی تھا کومل
موت کا گھر بنا ہے رنگ محل
گیری نکلا ، محل ہوا سنسان
پھر ہیں تاتار اور وہی طوفان

غیر ملکوں پہ یورشیں یلغار
خون کی پیاس ، جنگ ، ہاہاکار
لیکن اب وہ نہیں ہیں خان کے طور
داغ ہے دل میں غم کا یا کچھ اور ؟
عین گھمسان کی لڑائی میں
تول کر تیغ جب کلائی میں
وہ جھپٹتا ہے اپنے دشمن پر
ساتھ دیتا نہیں بدن اکثر
ہاتھ اٹھاتے ہوئے جھجکتا ہے
ہر طرف بے دلی سے تکتا ہے
رنگ فق ، لب پہ آہ ، دل میں گھٹن
گرم اشکوں سے تر بتر دامن

رہ گیا ہو کے بے وقار حرم
خان کرتا نہیں نگاہِ کرم
اک مخنّث کی پاسبانی میں
عورتیں گل گئیں جوانی میں
ہاتھ پتھر تلے ہے ، مَن مجبور
تھی زریمہ ، سو وہ بھی پہنچی دور
اس کو پانی میں پھینکنے والے
پاسبانوں کے منہ پہ ہیں تالے
شاہزادی کی تھی جو آخری رات
اس کو بھی غم سے دے گئی ہے نجات
یوں خطا کچھ بھی ہو زریمہ کی
تھی سزا میں بڑی غضبنا کی

جنگِ قفقاز کے اُٹھے شعلے
سرحدی ملک کر دیے ہولے
روسی دیہات میں تھی امن کی چھاؤں
خان نے پھونک ڈالے گاؤں کے گاؤں
گھوم پھر کر جو آیا "توریدا"
یاد تھی ماریا ستم دیدہ
اس نے بنوایا سنگِ مرمر سے
ایک فوّارہ جو سدا برسے
اوپر اسلام کا نشان ہلال
اور صلیب اس کے ساتھ بااقبال
(ویسے حرکت یہ بے تکی ہے ضرور
عقل کا پھیر ہے، سمجھ کا قصور)
نقش ہیں یادگار تختی پر
گردشِ روزگار سے بچ کر
کُنج میں ہے محل کے فوّارہ
چلتا رہتا ہے رات دن دھارا
سرد آنسو ٹپکتے پانی میں
ہجر کا شور ہے روانی میں
جیسے روتی ہے مادرِ بے حال
رن میں مارا گیا ہو جس کا لال
سُن کے یہ داستانِ غم انجام
لڑکیوں نے دیا مناسب نام
مختصر لفظ، ماجرا سارا:
نام ہے "آنسوؤں کا فوارہ"

چھوڑ کر میں شمال کی محفل
روز کی رونقوں سے اکتا کر
چل دیا باغچہ سرا کی طرف
اس محل میں ہوا مرا بھی گزر
اونگھتے تھے پڑے ہوئے یہ مکاں
صف بصف سب برآمدے سُنسان
یہ جگہ ہے جہاں کبھی تاتار
جن کی دہشت سے کانپتے تھے دیار
قتل و غارت سے تھک کے آتے تھے
دھوم کی محفلیں جماتے تھے
باغباں اب نہیں ہیں، لیکن باغ
آج بھی دے رہے ہیں ان کا سراغ
چشمے شاداب، لال لال گلاب،
بیلیں انگور کی ہیں پیچیدہ،
اور دیواریں آج تک زرتاب
میں نے دیکھے ہیں کہنہ حجرے بھی
جب برستی تھی فارغ البالی
دلِ بتاں تھیں بی بیاں ان میں
پھیرتیں گھر باکی تسبیحیں
میں نے دیکھا ہے ان کا قبرستان
جن میں سوتے ہیں اگلے پچھلے خان
جا بجا ہیں بلند لوحِ مزار
سنگِ مرمر کی جن پہ ہے دستار
کس کی آواز یہ سنائی دی؟
کیا یہ تقدیر کی صدا گونجی؟

"کیا ہوئے خان؟ اب کہاں ہے حرم؟"
ہے اُداسی سے اور کچھ عالم
کوئی آواز تک نہیں آتی
میں یہاں ہوں، خیال اور کہیں
شور فواروں کا، گلوں کی مہک
بیخودی چھارہی ہے، ہوش نہیں
ذہن بے اختیار، دل دھک دھک
اُڑتی پرچھائیں سی نظر آئی
کوئی لڑکی محل میں در آئی

کس کا سایہ تھا، میں نے کیا دیکھا؟
دوستو تھا یہ کون جلوہ نما؟
اتنا نازک کہ بس، بیان نہ ہو
ساتھ ہر دم رہے، نشان نہ ہو
میری آنکھوں پہ چھا گیا یہ کون؟
کیا یہ ہے ماریا کی روحِ پاک
یا زریمہ رقابتوں کی ہلاک؟
سونی بستی میں آگیا یہ کون؟

یاد پھر آئی وہ نظر چت چور
حسن مٹی کی مورتی کا جمال
پھر چلا ہے اُسی کی سمت خیال
دل ملا مجھ جلا وطن کو کٹھور
بس بہت ہو چکا یہ دیوانے
کیوں کھرچتا ہے زخم، ہوش میں آ

خواب تیرے بلائے جاں نکلے
حق ادا کر چکا محبت کا؛
سوچ کب تک یہ پاؤں میں زنجیر؟
تیرے پر شور ساز کی جھنکار
ہوگی رسوا یونہی سرِ بازار؟
میں سکون و سخن کا شیدائی
شہر تیں اور چاہتیں تج کر
پھر ہوں دیدار کا تمنائی
ساحلِ "سالگیر" خوش منظر!
دل میں بھر کر ڈھکی چھپی یادیں
آرہا ہوں تری چٹانوں پر
"تاوری" کو ترس گئیں آنکھیں
اے سمندر کے ہم نشیں پتھر
وہ طلسمی فضا، نظر کا سرور
جھنڈ پیڑوں کے، گھاٹیاں، ٹیلے
کہربا اور عقیق سے انگور
وہ صنوبر کی چھاؤں، آبِ رواں
مرکزِ حسن، زندگی کا وفور
کیا مقامات ہیں خدا کی پناہ!
ان کا ہاتھ اور دامنِ سیاح
صبح جب ڈالتی ہے نرم نگاہ
ان پہاڑوں میں آڑی ترچھی راہ
ڈور لیتا ہے اسپ خود آگاہ
جا بجا چشمے، سبز پوش ہیں باغ
چار جانب چٹان "آیوداغ"

بنجارے

بنجارے بھیڑ بھاڑ میں کرتے چہل پہل
بسرا بیہ ہیں گھومتے پھرتے ہیں دَل کے دَل
دریا کے آس پاس ہیں ڈیرے تنے ہوئے
کچھ خستہ حال رَین بسیرے بنے ہوئے
آزاد ہو کے عیش مناتے ہیں مَن چلے
کیسے مزے کی نیند ہے آکاش کے تلے
جلتی ہے آگ چھکڑوں کے پہیوں کے درمیاں
قالین بھی ہیں لٹکے ہوئے کچھ یہاں وہاں
گھر والے سارے سمٹے ہوئے ہیں الاؤ پر
ہو جائے دال دلیہ، تو مِل جائے پیٹ بھر
گھوڑے چھُٹے ہیں، پاس کے کھیتوں کی لوٹ ہے
بچھواڑے اینڈتا ہے کہ بھالو کو چھوٹ ہے
اِسٹیپی میں یہ آئے تو اک جان پڑ گئی
اور چل دیے جو لاد کے، بستی اجڑ گئی
کنبے کا ہے خیال سبھی کو بُرا بھلا
ہے صبح چل چلاؤ کو تیار قافلہ
کِلکاریاں ہیں بچوں کی، گانے ہیں ماؤں کے
گھن بج رہا ہے، کٹتے ہیں اوزار گاؤں کے

لو۔ وہ صدائیں تھم گئیں! سنّاٹا ہو گیا
سارا قبیلہ رات گئے، تھک کے سو گیا
کُتّے جو بھونکتے ہیں، لرزتی ہے خامشی

صحرا میں ہنہناتے ہیں گھوڑے کبھی کبھی
انگارے راکھ ہو گئے اِک اِک الاؤ پر
آکاش میں ہے چاند، اجالا پڑاؤ پر
اس ٹھنڈی چاندنی میں ہے بوڑھا کوئی اُداس
ڈیرے میں اپنے بجھتے ہوئے کوئلوں کے پاس
میدان پر ہیں بوڑھے کی آنکھیں ٹنگی ہوئی
اور رات کی دھنک میں فضا ہے رنگی ہوئی
بیٹی کا انتظار ہے، کیا جانے، کب پھرے،
گھر سے گئی تھی گھومنے پھرنے کے واسطے،
رنچلا نہ بیٹھا جائے کہ ہے چُلبُلا مزاج
پچھلا پہر ہے رات کا، ڈھلتی ہے چاندنی
وہ دُور بادلوں سے پھسلتی ہے چاندنی
"زِمفیرا" کا پتہ نہیں اب تک، گئی کہاں!
ٹھنڈی پڑی ہیں باپ بچارے کی روٹیاں

وہ دیکھو آ رہی ہے، وہی ہے مگر کوئی
سائے سمان ساتھ میں ہے اور اجنبی
یہ کون نوجوان ہے، آتا نہیں نظر
دونوں لپک کے چلتے ہیں، دونوں کا رُخ اِدھر
آتے ہی بولی: "بابا یہ مہمان ہے، مجھے
ٹیلے کے پیچھے مل گیا بس اتفاق سے؛
میں نے کہا کہ رات یہ ہو جائے گی بسر
خیمے میں چل کے ٹھہر ہمارے پڑاؤ پر
بنجارہ بن کے رہنے کو کہتا ہے، جیسے ہم
اس کی تلاش میں ہے پولیس، ناک میں ہے دم

پر میں نے اس کی حامی بھری ہے نبھاؤں گی
یہ ہے الیکو، اس کو میں اپنا بناؤں گی
ہے دم کے ساتھ ساتھ، جہاں بھی میں جاؤں گی"

بوڑھا

مجھ کو خوشی ہے، آؤ میاں، ہے تمہارا گھر
ٹھہرو یہیں فقیر کے ڈیرے پہ رات بھر
اور من کرے تو شوق سے رہنا ہمارے سنگ
عادت پڑے گی دیکھ کے اوروں کے رنگ ڈھنگ
تیار ہوں، یہ بوریا بستر ہے بانٹ لو
جو مجھ کو روکھی سوکھی میسر ہے، بانٹ لو
خانہ بدوش لوگ ہیں پھرتے ہیں بے لگام
ہم مفلسوں کا دن کو سفر، رات کو قیام
کل صبح تڑکے باجے گا نقارہ کوچ کا
تم بھی ہمارے ساتھ ہی چھکڑے میں بیٹھنا
دھندے بھی ہیں، پسند کرو، سیکھ جاؤ گے:
لوہے پہ گھن بجاؤ گے یا گیت گاؤ گے
یا گاؤں گاؤں گھوم کے بھالو نچاؤ گے

الیکو

میں رہوں گا یہاں۔

زمفیرا

یہ ہے میرا جواں
کس کی ہمت، چھڑائے بھلا مجھ سے، ہاں!
خیر، اب رات کافی ہوئی،
ڈھل گیا چاند بھی،
کھیت، میدان، اندھیرے میں گم ہو گئے

میرے نینوں میں نندیا گھلی جائے رے...

کٹ گئی رات اجالا ہوا
اور بوڑھا دبے پاؤں پھرنے لگا
اپنے خاموش خیمے کے چاروں طرف۔
"جاگ "زمفیرا"، اٹھ، دیکھ دن چڑھ گیا
ہو گیا وقت، مہمان، آنکھیں ملو!
نرم بستر سے رخصت ہو، بچو، چلو"
لوگ اٹھے نیند سے غل مچاتے ہوئے
کپڑے لتے ٹھکانے لگاتے ہوئے
ڈیرے تہہ کر لیے
اور چھکڑے بھی اوپر تلے بھر لیے۔
وہ چلی بھیڑ سونے بیابان میں
ایک دو دم کی رونق ہے سنسان میں۔
آگے آگے چلے جا رہے ہیں گدھے
ان پہ جھولیں کسی اور دونوں طرف
بچے ہنستے، ہمکتے، مزے میں سدھے
پیچھے بڈھے، جواں، سب کے سب مرد و زن
باپ بیٹے، میاں بیوی، بھائی بہن
خوب ہو حق مچاتا ہوا قافلہ
اونچی تانیں اڑاتا ہوا قافلہ
چیخ بھالو کی، جھنکار زنجیر کی
جھانجھ بجتی ہے ہر بار زنجیر کی
دھاریاں شوخ، چیتھڑے لگے پیرہن
بچوں بوڑھوں کے ننگے دھڑنگے بدن

ساتھ کتے بھی ہیں،
بھونکتے ہوکتے، دُم ہلاتے ہوئے
اور چھکڑے چلیں چرچراتے ہوئے
منچلے بھی نفیری بجاتے ہوئے۔
کیسا افلاس ہے، کس قدر ابتری!
اِن کی اک اک ادا میں ہے وحشت بھری
پر مچلتا ہے یوں زندگی کا لہو
ہم جو شہروں کے باسی ہیں،
مُردار عیشوں پہ قربان ہیں،
اِس اُبلتی ہوئی، تمتماتی ہوئی زندگی سے سدا
ایسے انجان ہیں
جیسے گانے غلاموں کے بے رنگ و بو

الیکو ہے چُپ دیکھتا جا رہا ہے
کہ میدان پیچھے چھٹتا جا رہا ہے
کہیں دھول میں گم ہوا جا رہا ہے
کوئی جیسے چٹکی سی لیتا دل میں
نجانے یہ کیا درد ہے، کیا ہے دل میں!
یہ زمفیرا، میری سیہ چشم آہو،
مرے پاس بیٹھی ہے، بازو میں بازو
مجھے کونسا غم ہے، دُکھڑا کہاں کا
میں آزاد شہری ہوں سارے جہاں کا
مرے سر کے اوپر چمکتا ہے سورج
بھری دوپہر میں دمکتا ہے سورج
ہے آزاد دنیا، مگر میرے جی کو
ہوا کیا؟ ترستا ہوں اب بھی خوشی کو!

پنچھی ہے آزاد چمن میں؟
کیسی فکر، کہاں کا دھندا
اُڑنا پھرنا ہر آنگن میں
رس لس کر کیا کرنا ہے، جو
تنکے چُن چُن چھپر چھائے
ہے وہ رَین بسیرا اُس کا
جس ٹہنی پر آنکھیں میچے
جس ٹہنی پر نیند آجائے۔
جب سورج کی لال کٹوری
نکلے اور اُجالا چھلکے
پنچھی اپنے رب کا کلمہ
سن کر جھومے ہلکے ہلکے
چہکے اور بھجن خود گائے۔
جب رُت بدلے، آئے گرمی
رخصت ہو موسم کی نرمی
پیاس ستائے، دھوپ جلائے،
اور پھر جب دن ہوں پت جھڑ کے
بادل گرجیں، بجلی کڑکے
آدمی کتنے دُکھ بھرتا ہے!
سردی، گرمی، آندھی، پانی
سب کے ساتھ گزر کرتا ہے
بے گھر پنچھی کیوں غم کھائے؟

پھر سے اچھی رُت آنے تک
دور سمندر پار اُڑ جائے
کون اسے رکھے بندھن میں
پنچھی ہے آزاد چمن میں

چلا وہ بھی فکروں سے آزاد ہو کر
زمانے کی کھائے ہوئے سخت ٹھوکر
نہ وہ آشیانے کی راحت کو جانے
نہ دنیا کی اچھی بُری لت کو جانے
جو جانے تو آزاد فطرت کو جانے۔
الیکو پہ ہر سمت راہیں کھُلی تھیں
گھنی چھاؤں تھی نرم باہیں کھُلی تھیں
سحر آنکھ کھُلتی تو بے فکر ہو کر
یونہی اپنا دن چھوڑ دیتا خدا پر
تن آسانیوں کی میسر تھی راحت
جو ہوتا ہے ہوتا رہے، اس کو کیا ڈر۔
کبھی بیٹھے بیٹھے خیال ایسے آتے:
وہ گزرا ہوا ناز و نعمت کا ساماں
وہ عشرت کے دن، جھوٹی شہرت کا ساماں
ستارے وہی دُور سے ٹمٹماتے۔
سفر میں کبھی یوں بھی ہوتا کہ سر پر
کڑکتی تھی بجلی، گرجتے تھے بادل
مگر نیند بے فکر تھی ہر بلا سے
نہ راحت کی پروا، نہ خطرے سے بیکل

ہے تقدیر اندھے کی لاٹھی ــ مگر اس
پہ تقدیر کا زور چلتا نہیں تھا،
نجانے کہاں کی بھری تھیں اُمنگیں!
دل آزاریوں میں بہلتا نہیں تھا
کہ سینے میں رہ رہ کے اٹھتی تھیں لہریں
سمے کٹ رہا تھا اسی کش مکش میں
کہ گر چین پایا تو کیا چین پایا
کہیں حسرتوں نے جو پھر سر اُٹھایا!

زمفیرا
سچ کہیو، میری جان، تجھے غم نہیں ہے کیا؟
اُس کا جو عمر بھر کے لیے تو نے تج دیا؟

الیکو
کیا تج دیا ہے میں نے، سنوں تو سہی بھلا؟

زمفیرا
اپنے وطن کے، شہر کے سب لوگ اور کیا؟

کاہے کا رنج؟
تو نے تو سوچا نہیں کبھی
میری طرح جو کاش کہیں تو بھی جانتی!
کیا چیز ہے گھٹے ہوئے شہروں کی زندگی!
ہر سمت ریل پیل ہے، لاچار ہیں وہ لوگ
جنگلے کھڑے ہوئے ہیں گرفتار ہیں وہ لوگ
سانس ان کے آشنائے نسیمِ سحر نہیں
پھولے اگر بسنت تو ان کو خبر نہیں
آتی ہے عاشقی کے چلن سے حیا انہیں

خود غور و فکر کا بھی نہیں حوصلہ انھیں
آزادیوں کا مول ہے زنجیر اور زر
ہر بُت کے آگے ٹیکتے پھرتے ہیں اپنا سر
کیا تج دیا ہے ؟ ان کی یہی بے وفائیاں
وہ جوڑ توڑ اور دلوں کی بُرائیاں
دیوانے پن سے ان کی دھکا پیل اور ہجوم!
بے غیرتی کی شان ہے ! بدنامیوں کی دھوم!

زمفیرا
پر کیسے شاندار محل ہیں کھڑے ہوئے!
قالین بھی ہیں رنگ برنگے پڑے ہوئے
ہیں دعوتیں بھی زور کی، تفریح بھی گھنی
اور لڑکیاں بھی پھرتی ہیں کیسی بنی ٹھنی

الیکو
کس کام کے یہ جشن، یہ شہروں کی دل لگی
جب پریم ہی نہ ہو تو کہاں کی ہنسی خوشی!
اُن لڑکیوں کی بات نہ کر ... اُن کا کیا شمار
تو ان سے لاکھ اچھی ہے، بے ہار، بے سنگار
آرائشِ جمال کی حاجت نہیں تجھے
موتی ہے، موتیوں کی ضرورت نہیں تجھے
ہاں، شرط یہ ہے، دیکھ بدل جائیو نہ تو
بس، میری جان، ایک یہی دل میں آرزو!
چاہت میں تو شریک ہو، راحت میں پاس ہو
یوں ہو تو بے وطن کو بھٹکنا بھی راس ہو

بوڑھا
یوں تو پیدا ہوئے تھے امیروں میں تم
ہم سے الفت ہوئی،
ہم غریبوں میں آئے، لگایا گلے
پر نہیں راس آتی ہیں آزادیاں
اس کو جو عیش میں، راحتوں میں پلے
ایک قصہ سناؤں،
جو ہم نے بڑوں کی زبانی سنا
رہنے والا کوئی دھوپ کے دیس کا
شاہ کے حکم سے جب نکالا گیا
تو اسے بھی ٹھکانہ ملا تھا یہیں
(نام تھا کچھ بھلا سا
مگر اب مجھے یاد آتا نہیں)
تھی بہت عمر لیکن جوان آتما
مَیل سے پاک، زندہ، مہان آتما
اپنے گیتوں سے جادو جگاتا تھا وہ
اور گلے میں کچھ ایسی کرامات تھی
جیسے چشمے ابلتے ہوں
جھرنے اُچھلتے ہوں
جس وقت گانے پہ آتا تھا وہ۔
تھا بھلا آدمی، چاہتے تھے سبھی
ٹھیس پہنچی نہ اس سے کسی کو کبھی
وہ بھی ڈینوب کے ساحلوں پر یہاں
خوب قصے کہانی سناتا رہا،
گیت گاتا رہا، مَن لبھاتا رہا
اس کو آتا نہ تھا کام دھندا کوئی
بالکوں کا سا کمزور، نازک بدن

اور شر میلا پن
اپنے بیگانے کرتے تھے سارے جتن :
اُس کی خاطر کبھی جانور مار لاتے ،
کبھی مچھلیاں تازہ تل کر کھلاتے ،
جو پڑتی تھی سردی تو تھمتا تھا دریا
بگولے اٹھاتی تھی برفیلی آندھی
ٹھٹھرتے تھے سب لوگ ، جمتا تھا دریا
تو اُس دھان پان اور دھرماتما کو
روئیں دار کھالیں اُڑھاتے تھے لاکر
نکلنے نہ دیتے تھے سردی میں باہر۔
مگر ان غریبوں کی اوقات کیا تھی !
جو کرتے تھے خاطر مدارات کیا تھی !
کبھی اس کو نکروں کا جیون نہ بھایا
خوشی سے کبھی ان میں رہنے نہ پایا
وہ کانٹا ہوا اور بھی سوکھ کر
یہ کہتا پھرے جا بجا در بدر :
گناہوں کی یہ مل رہی ہے سزا
کہ قہرِ خدا مجھ پہ نازل ہوا .
اسی آس میں وہ رہا رات دن
کہ شاید نظر ہو مرے حال پر
کہ شاید نکل آئے کوئی مفر
بڑے دکھ سہے اس نے ڈینوب کے
ساحلوں پر ہمیشہ بھٹکتا رہا
اس کو یادِ وطن نے رلایا بہت
زندگی بھر یہ کانٹا کھٹکتا رہا

آخری وقت یہ کی وصیت کہ تم
بعد مرنے کے میری دکھی ہڈیاں
بھیج دینا دکن کی زمیں کو ، جہاں
جیتے جی لوٹ جانے کی حسرت رہی
روح بے چین تھی ، اس کو پردیس میں
زندگی کیا ، گوارا نہ تھی موت بھی ۔

الیکو

ہاں تو اے روم ، اے نامور سلطنت !
تیرے بیٹوں کی تقدیر تھی کیا یہی ؟
تیرے بیٹوں نے صدمے اٹھائے بہت !
اے محبت کے نغمہ سرا
دیوتاؤں کے گن گانے والے بتا
شان کیا چیز ہے ، نیکنامی ہے کیا ؟
کیا وہ شہرت کہ دنیا قصیدے کہے ؛
تذکرہ نسل در نسل چلتا رہے ؛
یا یہ حالت کہ بے ساختہ داستاں
کوئی بنجارہ کرتا ہے خود سے بیاں
چھولداری کے اندر گھُٹتا ہے دھواں

چکر لگاتے ، گھومتے دو سال ہو گئے
خانہ بدوش اپنا وہی قافلہ لیے
پھرتے ہیں جا بجا ،
اب بھی وہ چلتے چلتے کہیں ٹھہر جاتے ہیں
مہمان بن کے رہتے ہیں ، آرام پاتے ہیں
گھل مل گیا ہے ان میں الیکو بھی ، اب اُسے

تہذیب ناگوار، تمدن ہے ناپسند،
وہ بیڑیاں بھی کٹ گئیں، آزاد ہو گیا
افسوس ہے کسی کا، نہ ہوتا ہے فکر مند۔
اب بھی وہی الیکو ہے، کنبہ بھی ہے وہی
بیتے دِنوں کی یاد بھی آتی نہیں کبھی
بنجارہ بن کے رہنے کی عادت سی ہو گئی۔
اس کو وہ اُن کے رَین بسیرے پسند ہیں
کیا لطف ہے جو کام سدا چین سے چلیں
سنگیت میں رچی ہوئی بھاشا غریب ہے
وہ بھی اسے پسند ہے، دل سے قریب ہے۔
بھالو ہے یوں تو غار کا، جنگل کا جانور،
لیکن اب اس کے ڈیرے میں سوتا ہے پھیل کر
میدان میں سڑک کے کنارے جو گاؤں تھے
ملداویہ کے لوگ بسے تھے یہاں وہاں
اُن کے گھروں کے پاس جہاں ڈگڈگی بجی
وہ دوڑے اور چار طرف بھیڑ لگ گئی
بھالو انھیں دکھلائے تماشے جہاں تہاں،
غرّائے اور پنجوں پہ ناچے بھدر بھدر
زنجیر کو چبائے، بھنبھوڑے کسی قدر،
بوڑھا بھی ڈھیلے ہاتھ سے ڈفلی بجا بجا
لاٹھی کی ٹیک لے کے بڑھے کانپتا ہوا۔
گاتا الیکو ریچھ کی رسی سنبھال کے،
زمفیرا گاؤں گھومتی اور گھر کو لوٹتی
جو کچھ کسی نے دے دیا جھولی میں ڈال کے۔
جب رات ہونے آئے تو وہ تینوں بیٹھ کر
دَلیہ کوئی اُبالتے موٹے اناج کا
بوڑھے کی آنکھ لگتے ہی، بتی بجھا کے سب
سو جاتے تھے کہ اَنت ہوا کام کاج کا۔

آئی بہار، دھوپ میں بیٹھے ہوئے اُدھر
ٹھنڈے لہو کو سینک رہے ہیں بڑے میاں،
اور جھولنے کے پاس ہے بیٹی مگن یہاں۔
گاتی ہے ایک گیت جسے سوچ سوچ کر
اُڑنے لگیں الیکو کے منھ پر ہوائیاں

زمفیرا

میرے بُڈھے خصم،
میرے ظالم خصم،
چاہے خنجر چلا
چاہے زندہ جلا
میں ہوں پکّی بڑی،
تجھ سے ڈرتی نہیں
چاہے ٹکڑے اُڑا، چاہے کر دے بھسم
میرے بُڈھے خصم!
اب تو بھاتی نہیں،
تیری صورت مجھے
کیا کروں ہو گئی
تجھ سے نفرت مجھے
اب کسی اَور سے
ہے محبت مجھے
جان واروں گی، کیا جان کا مجھ کو غم!

میرے بڈھے خصم!

الیکو

خاموش، تیرے گیت سے میں تنگ آگیا
مجھ کو نہیں پسند یہ گانے الا بلا

زمفیرا

تجھ کو نہیں پسند، نہ ہو، مجھ کو اس سے کیا
میں گا رہی ہوں اپنے لیے، واہ واجی وا!

.....چاہے خنجر چلا، چاہے زندہ جلا
میرے بڈھے خصم، میرے ظالم خصم
کچھ بتاؤں نہیں

دوں نہ اس کا پتہ

میرے بڈھے خصم!

الیکو

زمفیرا، بس خموش، مرا ناک میں ہے دم

زمفیرا

کیوں، کیا ہوا، سمجھ گئے تم، کیوں برا لگا؟

الیکو

زمفیرا!

زمفیرا

مرضی تمھاری، روٹھنا چاہو تو روٹھ لو
میں گاؤں گی، یہ گیت ہے تم پر، جو ہو، سو ہو
(اٹھی وہاں سے، گیت وہ گاتی ہوئی چلی)

بوڑھا

ہاں، یاد آگیا، مجھے اب یاد آگیا
گانا ہمارے وقت میں تھا یہ گڑھا گیا

"کاگول" کے کنارے پہ ہوتا تھا جب گزر
"مریولا" میری بیٹھ کے جاڑوں کی رات میں
بچی کو بازوؤں میں جھلاتی الاؤ پر
اور تھا یہی وہ گیت جو گاتی تھی ساتھ میں
بوڑھا ہوا ہوں، عقل پہ پردے سے پڑ گئے
لیکن یہ بول یاد رہے، دل میں گڑ گئے

رات خاموش ہے، رات کی چاندنی
اس جنوبی افق پر ہے یہ جھکی ہوئی
اور زمفیرا نے باپ کو نیند سے
ہڑبڑا کر اٹھایا کہ "ابا مرے،
دیکھنا تو، الیکو کو کیا ہو گیا!
آہ بھر آہ بھرتا ہے، روتا ہے یہ
سانس مشکل سے لیتا ہے، سوتا ہے یہ۔"

بوڑھا

دیکھو، بس چپ رہو،
اس کو مت چھوئیو
میں نے یہ روسیوں سے سنا تھا کبھی
روح سینہ دباتی ہے جب رات کو
تلملاتا ہے سوتا ہوا آدمی،
بیٹھ جا تو مرے پاس،
یہ صبح ہوتے چلی جائے گی۔

زمفیرا

پر یہ ہولے سے زمفیرا کہتا ہے کیوں؟

بوڑھا

خواب میں بھی ہے اِس کو تری جستجو

اب اِسے ساری دُنیا سے پیاری ہے تو

زمفیرا

مجھ کو اس کی محبت بلا ہو گئی

ہائے ، میں کیا کروں ؟

دل یہ کہتا ہے اب اس سے آزاد ہوں

اب تو مجھ کو..... مگر ہائیں، یہ کیا سنا ؟

نام اب کے لیا ہے کسی اور کا ۔

بوڑھا

نام کس کا لیا ؟

زمفیرا

نام کیا، تم کراہیں سنو تو سہی

دانت بھی کٹکٹاتا ہے ، توبہ مری !

جاؤں ، اِس کو جگا دوں ابھی ؟

بوڑھا

مت جگا تو اسے ،

رات والی کو مت چھیڑ ، جانے بھی دے

ایک آسیب ہے ، خود چلی جائے گی

زمفیرا

اس نے کروٹ بدل لی ہے ، وہ اُٹھ گیا

اور مجھ کو بُلاتا ہے ، جاؤں میں کیا ؟

تم بھی سو جاؤ ابا ، لو اب میں چلی ۔

الیکو

تو کہاں تھی بتا ؟

زمفیرا

باپ کے پاس تھی میں تو بیٹھی ہوئی ،

تجھ پہ آسیب تھا ، یا کوئی روح تھی

کس قدر نیند میں تھی تجھے بیکلی ،

دانت بھی پیستا ، کٹکٹاتا رہا

نام لے لے کے میرا بُلاتا رہا

الیکو

میں نے دیکھا تجھے خواب میں

میں نے دیکھا کہ میرے ترے درمیاں...

کیا کہوں ، خواب میں تھا بھیانک سماں

زمفیرا

ان کو مت مان ،

وشواس مت کر ، بُرے خواب ہیں

الیکو

میں تو اب کچھ نہیں مانتا

میرا وشواس ہی اُٹھ گیا

خواب کیا ، اور باتیں بھی کیا دل نشیں

حد تو یہ ہے ، یقیں تیرے دل کا نہیں !

بوڑھا

کس بات پر خفا ہے ، دِوانہ ہوا ہے کیا ؟

اے نوجوان ، آہ تو بھرتا ہے کیوں سدا ؟

ہیں منچلے یہ لوگ ، یہ سُندر ہیں ناریاں

ہے آسمان صاف یہاں ، صاف دل یہاں

مت رنج کر ، کہ رنج میں ہے جان کا زیاں

الیکو

بابا، وہ اب تو پیار ہی کرتی نہیں مجھے

بوڑھا

زمفیرا ایک بچی ہے، لے کام صبر سے!
بیکار کے یہ وہم ہیں، دل سے نکال دے۔
تو عشق میں دکھی ہے، جلاتا ہے اپنا جی
عادت ہے عورتوں کو مگر تاک جھانک کی۔
وہ دیکھ آسمان کی محراب کے تلے
آزاد چاند گھوم رہا ہے مزے مزے
قدرت میں جو بھی چیز ہے، نزدیک ہو کہ دور
چھلکا کے اپنا جام لٹاتا ہے سب کو نور،
جن بدلیوں میں جھانک لیا نور بھر دیا
جس کو دکھائی چھب، اسے دیوانہ کر دیا
لو اب کے ایک اور ہی بادل سے میل ہے
اور یہ بھی تھوڑی دیر کا دل چسپ کھیل ہے
کس کی مجال ہے جو کہے ٹھہر جا یہیں
یہ چاند روک ٹوک کوئی مانتا نہیں
ان لڑکیوں کا دل بھی کہاں حکم سہ سکے
تم ایک ہی سے پیار کرو، کون کہہ سکے
لے کام صبر سے!

الیکو

کتنا وہ چاہتی تھی مجھے
کیا ہوا وہ دل؟
جو سونی وادیوں میں دھڑکتا تھا مستقل
کتنی ہی بار شوق سے سینے کے متصل
باہیں گلے میں ڈال کے راتیں گزار دیں
کتنی ہی بار، جب اسے سوجھا ہے بچپنا
تتلا کے اور پیار کی باتیں بنا بنا،
بوسوں سے مست کر کے کیا سوچنا منع،
الجھے ہوئے خیال کی زلفیں سنوار دیں۔
زمفیرا میری اب وہ نہیں ہے، بدل گئی
وہ آنچ سرد ہو گئی، مستی نکل گئی

بوڑھا

سن تجھے آپ بیتی سناتا ہوں میں:
ہے پرانی بہت، ایک عرصہ ہوا
یوں سمجھ لو کہ ڈینوب پر ان دنوں
ماسکو وال کا کوئی خطرہ نہ تھا
(دیکھتے ہو، مجھے یاد آنے لگی
وہ پرانی کہانی، بڑی دکھ بھری)
ہم لرزتے تھے ترکی کے سلطان سے
بادشا کی حکومت تھی "بوجاک" پر
حکم چلتا تھا اونچے "اکرمان" سے
وہ مری نوجوانی کے دن تھے؛ ابھی
گھنگھریالا کوئی بال پکا نہ تھا
روح تھی شاد، آباد، مستانہ تھا۔
تھیں حسینائیں بھی ایک سے ایک در
ان میں بس ایک پر جا کے ٹھہری نظر
اس کو تکتا تھا، بھرتا تھا اس کا ہی دم
جیسے سردی میں سورج کو تکتے ہیں ہم
رات دن التجا سے منایا اسے

آخر اک روز اپنا بنایا اسے
ہائے میری جوانی کے پر لگ گئے
کوئی تارا تھا، گم ہوگیا دن بجھے
اور محبت کی رُت بھی بدا ہو گئی
وہ جوانی سے پہلے ہوا ہو گئی
سال بھر کی محبت میں جی بھر گیا
میری "مرلولا" تو کیا اسے کیا ہو گئی
اب سنو، کیا ہوا:
ہم تھے "کاگول" کے پاس ٹھہرے ہوئے
تھے پہاڑوں کے دامن میں ڈیرے لگے
اس طرف سامنے سے کوئی قافلہ
آن پہنچا تو وہ بھی وہیں ٹک گیا
وہ بھی اپنے ہی بنجارے تھے ذات کے
بن گئے وہ بھی ہمسائے دو رات کے
تیسری رات کو وہ سدھارے سبھی
اور مرلولا بھی ان کے پیچھے گئی
اپنی ننھی سی بچی کو گھر چھوڑ کر
مجھ کو سوتا ہوا بے خبر چھوڑ کر؛
جب سویرا ہوا، آنکھ میری کھلی
دیکھتا ہوں کہ سب کچھ ہے، پر وہ نہ تھی
اس کو آواز دی۔ پوچھتا بھی پھرا
پر نہ پایا کہیں کوئی اس کا پتا
روئی زمفیرا میری بلک کر تو میں
خود بھی رویا۔ کہ آخر ہم انسان ہیں
دیکھ لو وہ دن اور آج کا ہے یہ دن
ہو گئی ساری دنیا کی عورت سے گھن؛
پھر کسی سے کبھی دل لگایا نہیں
اپنی بیٹی کو پالا، اکیلا رہا
اور سے میں نے دکھ سکھ بٹایا نہیں
اپنے جیون کا ساتھی بنایا نہیں

الیکو

پر تم نے اس رذیل کا پیچھا کیا نہ کیوں؛
اس بے وفا کا اور درندے کا ایک ساتھ
خنجر سے پاش پاش کلیجہ کیا نہ کیوں؛

بوڑھا

مگر کاہے؛
جوانی پنچھیوں سے بھی زیادہ شاد ہوتی ہے
بہت آزاد ہوتی ہے
محبت پر، میرے پیارے، کسی کا بس نہیں چلتا
خوشی ملتی ہے سب کو باری باری
آج میری، کل تمھاری
یہ دیا ایسا ہے جو بجھ جائے تو پھر سے نہیں جلتا

الیکو

مجھ میں نہیں یہ تاب کہ تکرار چھوڑ دوں
خاموش بیٹھ جاؤں، ادھیکار چھوڑ دوں
یا خود نہ جوڑ توڑ کروں اپنے کام کا
یا بس چلے تو لطف نہ لوں انتقام کا
دشمن جو سو رہا ہو سمندر پہ بے خبر
اور اتفاق سے ہو مرا اُس طرف گزر
ماتھے پہ بل نہ آئے، نہ دل میں دیا کرم

ٹھوکر لگاؤں اس کو وہیں پر خدا قسم
پانی پہ جا کے دُور گرے اور اُچھل پڑے
اک دم جو اس کی چیخ نکل جائے خوف سے
بس زہر میں بجھا کے لگاؤں وہ قہقہے
جو اس کے ڈیرے کو تماشا بنا بھی دیں
اور زندگی میں خوب ہنسائیں، مزا بھی دیں

نوجوان بنجارہ
بس ایک پیار اور
سنو، ایک بار اور
زِمفیرا
اب ہو گیا ہے
میرا میاں، بڑا ہی جلاتن ہے، بس کرو
نوجوان بنجارہ
اچھا تو رخصتی کا وہ لمبا سا پیار اور
زِمفیرا
لو، اب تو چھوڑ دو
وہ آ نہیں گیا، یہ غنیمت ہے، بس کرو
نوجوان بنجارہ
یہ تو بتاؤ، کب کو کروں انتظار اور؟
زِمفیرا
جب چاند چڑھ چکا ہو تو ٹیلے کی آڑ میں
اس قبر پر میں آؤں گی، تم آج ہی ملو!
نوجوان بنجارہ
(رات گئے انتظار میں)

بس جی، وہ اب نہ آئے گی، باتیں بنا گئی
زِمفیرا
اے، میری جان دوڑ کے آ، لے میں آ گئی

سو رہا تھا الیکو، پر اُلجھے ہوئے
خواب نے اس کو چونکا دیا نیند سے
چیخ ماری، اندھیرے میں گھبرا گیا
سہج سے ہاتھ پھیلا کے بڑھتا گیا
بدگمانی میں اس نے ٹٹولا کہیں
سرد بستر تھا، بستر کی رونق نہیں . . .
وہ تڑپ کر اٹھا اور سننے لگا
ہر طرف ہو کا عالم تھا، سنسان تھا
مارے دہشت کے لرزہ ہوا، تپ چڑھی
اس کو چھوٹے پسینے، بڑھی کپکپی
اٹھ کے ڈیرے سے باہر گیا اور وہاں
اس نے چھکڑوں کے چکر لگائے کئی
گھُپ اندھیرا تھا، وحشت تھی، سونا سماں،
کھیت چپ چاپ لیٹے ہوئے بے زباں،
چاند ہالے میں تھا، کہریں چاندنی،
ملگجا نور تاروں کا چھٹکا ہوا،
سرد شبنم پہ ابھرے ہوئے نقش پا؛
وہ نشاں اس کو رستہ دکھاتے چلے
بیقراری سے اس سمت بڑھتا گیا
دور ٹیلے کے پیچھے جہاں لے چلے

دُور سے کچھ سفیدی سی آئی نظر
راہ کی تان ٹوٹی کسی قبر پر
پاؤں بے جان تھے، دل پریشان تھا
ہَول آتا تھا ماتھا ٹھنکنے سے بھی
اس کے ہونٹوں پہ، گھٹنوں میں تھی تھر تھری
جا کے دیکھا تو ۔ یہ کیا؟ یہ کیا ہے؟ یہ کیا؟
کوئی سچ مچ کی ہے بات یا خواب سا؟
قبر کی ہو رہی ہے یہ بے حرمتی!
اس پہ بالکل ہی نزدیک ہیں سائے دو
اور چپکے سے جیسے کوئی بات ہو۔

پہلی آواز

اب وقت ہو گیا . . .

دوسری آواز

تو ذرا اور ٹھہر جا!

پہلی آواز

اب وقت ہو گیا مرے پیارے

دوسری آواز

نہیں نہیں
کچھ اور ٹھہر جا کہ نکل آئے دن یہیں

پہلی آواز

اب دیر ہو چکی ہے، پَرے ہٹ

دوسری آواز

کچی ہے تیری چاہ، ذرا ٹھہر ایک منٹ!

پہلی آواز

میرے میاں کی آنکھ اگر کھل گئی تو پھر!

الیکو

لو، آنکھ کھل گئی،
دیکھوں تو مجھ سے بچ کے نکلتے ہو اب کہاں؟
اچھے رہے کہ قبر بھی تیار ہے یہاں۔

زمفیرا

تو میری جان بھاگ لے جلدی سے، بھاگ بھاگ

الیکو

او نوجوان، ٹھہر، بجھاتا ہوں تیری آگ!
(چاقو اٹھا کے سینے میں پیوست کر دیا)

زمفیرا

یہ کیا الیکو

نوجوان بنجارہ

ہائے رے میں مَرا

زمفیرا

یہ کیا ستم ہے، تو نے الیکو، یہ کیا کیا؟
چھینٹے اُڑے ہیں، خون میں ڈوبا ہوا ہے تو
مارا ہے اس کو جان سے ظالم، برا کیا!

الیکو

تو بھر لو دم اب اس کی محبت کا، لے اٹھا

زمفیرا

بس، ہوش میں ہو، رعب نہیں مانتی ترا
ڈرتی نہیں ہوں تجھ سے، خبردار، دُور ہو!
ان دھمکیوں پہ، قتل پہ پھٹکار، دُور ہو!

الیکو

مرنا ہے تجھ کو بھی!

(اس پر بھی ایک وار کیا)

زعفیرا

ہائے ۔ محبت میں جان دی ۔!

مشرق کی صبح ہوتی ہے تاروں کی چھاؤں میں
قاتل نے رات کاٹ دی سنگِ مزار پر
ٹیلے کے پار، ہاتھ میں خنجر لیے ہوئے
چہرے کا رنگ زرد ہے، کپڑے لہو میں تر،
لاشیں نظر کے سامنے دونوں دھری ہوئی
چاروں طرف سے بھیڑ ہے دہشت بھری ہوئی
بنجارے بدحواس ہیں، چہرے اُداس ہیں
روتی ہوئی قطار میں آتی ہیں عورتیں
لاشوں کی آنکھیں چومتی جاتی ہیں عورتیں
بیٹھا ہے اک طرف کو اکیلا ضعیف باپ
کڑیل جواں کی لاش کو تکتا ہے درد سے
چپ چپ ہے، ہاتھ پاؤں ہیں بے جان، سرد سے
دونوں جنازے ساتھ اٹھے، موت نے انھیں
ٹھنڈی زمیں کی گود میں لا کر لٹا دیا
دونوں جوانیوں کو برابر لٹا دیا ۔
سب کچھ الیکو دُور سے دیکھے گیا خموش
دینے لگے جب آخری مٹی تو اس نے سر
آہستہ سے جھکایا، گرا خود بھی خاک پر
نزدیک آکے بوڑھے نے تب اس سے یوں کہا:
پیچھا ہمارا چھوڑ دے، او خود پسند جا!
ہم لوگ جنگلوں میں پلے ہیں، ہمارے ہاں

قانون ہے، سزا ہے، نہ پھانسی، نہ سختیاں
آہیں نہ لیں، نہ خون کسی کا بہائیں ہم
پر خونیوں کے سائے سے دامن بچائیں ہم
آزاد زندگی کے نہیں ہیں یہ راستے
آزادی تجھ کو چاہیے صرف اپنے واسطے
تیرا خمیر اور ہے، راس آئے گی نہیں
یہ سادگی کہ جس میں بناوٹ کوئی نہیں
تو ساتھ ہوگا تو تری آواز آئے گی
گزرے گی ناگوار، بہت دل دکھائے گی
ہم دل کے صاف لوگ ہیں، ہم میں سہار ہے
تو بد مزاج شخص ہے، بے اعتبار ہے
تیرا ہمارا ساتھ نہیں، جا معاف کر
وہ تیرا راستہ ہے، مبارک تجھے سفر"
یہ کہہ چکا تو چلنے کو خیمے اٹھا لیے
وہ خوفناک رین بسیرا اُجاڑ کے
بنجارے سارے شور مچاتے ہوئے چلے
جب لاد کر وہ چل دیے، بستی اجڑ گئی
اُجڑی زمیں پہ اور بھی کچھ گرد پڑ گئی
میدان نامراد رہا، اس میں کیا بچا
چھکڑا اِک پھٹے پرانے سے قالین کا بچا
وہ حال جیسے بھور دھندلکے میں ہو کبھی
سردی شروع ہونے میں دو چار دن رہے
کھیتوں سے اُڑ کے جاتے ہیں سارس رہے سہے
کرتی ہے رُخ جنوب کو ان کی سفید ڈار
بازو ہوا میں، چیخ فضا میں، دلوں میں پیار

گولی لگے کسی کے تو گرتا ہے ٹوٹ کر
اپنے سفر نصیب رفیقوں سے چھوٹ کر
شہپر کا زخم پاؤں کی زنجیر ہے اُسے
تنہائی ایک موت کی تصویر ہے اُسے
اب رات آئی، رات کا اُجڑا سہاگ ہے
جھکڑے میں روشنی، نہ انگیٹھی میں آگ ہے
گزرے گی کیسے رات چڑھی چھت کے سائے میں
سونا کہاں کا، آنکھ بھی لگنے نہ پائے گی
تنہائی اس کو خون کے آنسو رُلائے گی

خاتمہ

جادو ہے کوئی شاید اس نغمہ سرائی کا
جس نے مری یادوں میں
بھولے ہوئے چتروں کو رہ رہ کے اُبھارا ہے
دُکھ سُکھ کے وہی منظر، وہ دُھند، وہ اُجیالے
آئے ہیں تصور میں، خوابوں نے پکارا ہے۔
اس ملک کی یاد آئی
جس ملک میں مدّت تک اُٹھے ہیں بہت فتنے،
گونجے ہیں بہت نعرے،
جس ملک میں طاقت سے مجبور ہوا ٹرکی،
روسی نے نئی سرحد منوا کے دکھادی ہے اک شان بہادر کی۔
سرکا وہی شاہیں کرتا ہے صدا اب بھی
گزری ہوئی عظمت کا دیتا ہے پتہ اب بھی
اُس ملک کے چٹیل سے میدان میں بنجارے
آثار قدیمہ کی سرحد سے گزرتے ہیں
دیکھے ہیں بہت میں نے

ان خانہ بدوشوں کے بے رنج و ضرر چھکڑے
بچوں کی طرح خوش خوش بھرتے ہیں یہ طرارے
کیا شوخیاں کرتے ہیں!
سنسان بیاباں میں اکثر یہ ہوا، مَیں بھی
اس بھیڑ میں جا پہنچا، کچھ دور چلا مَیں بھی:
جو رزق ملا کھایا،
جو آگ ملی تاپی،
ایسی بھی کٹیں راتیں،
تکیہ نہ کوئی بستر،
بس سو گئے کھا پی کر
وہ رینگنا چھکڑوں میں، جی کھول کے وہ گانا، مجھ کو بھی پسند آیا
سنگیت کی سرمستی، انداز وہ مستانہ، مجھ کو بھی پسند آیا
"مُریولا" کا نازک سا یہ نام سُنا میں نے
اور ایک زمانے تک یادوں میں چُنا میں نے
پر صاف کہوں تم سے
قدرت کے، غریبی میں پالے ہوئے، فرزندو!
آزاد منش بندو!
کہتے ہیں خوشی جس کو، تم نے بھی نہیں پائی
وہ راس نہیں آئی!
پیوند لگے ڈیرے راحت کو ترستے ہیں
اور سائے میں ان کے بھی پلتے ہیں بڑے موذی
وہ خواب جو ڈستے ہیں
ویران زمینوں پر یہ چلتی ہے چھتر چھایا
انسان نے اس میں بھی دکھ سے نہ مفر پایا!
ہر سمت رُکی راہیں، ہر سمت کھڑی ہیں یہ کم بخت تمنّائیں
تقدیر کے حملوں سے تدبیر نہیں بچتی، جائیں تو کہاں جائیں؟

سونے کا مرغا

سات اقلیم پار دور کہیں
اُس جگہ جس کا اور چھور نہیں
اِک بڑا زور دار راجہ تھا
نام "دادون" کام سب چوکھا
نوجوانی میں ایسے ٹھونکے خم
پاس والوں کا ناک میں تھا دم
پر بڑھاپا، بُری بلا، آیا
خود وہ لشکر کشی سے اُکتایا
جی میں آئی کہ کیجیے آرام
کچھ جو ہلکے ہوں راج پاٹ کے کام
تھے پڑوسی بھی تاک میں اُس کی
وہ جو رہتے تھے دھاک میں اُس کی
اب بوڑھاپے میں سر پہ چڑھنے لگے
موقع پایا تو حد سے بڑھنے لگے
سرحدیں دور دور تک پھیلی
تھیں، تو کرنے کو اُن کی نگرانی
اِک بڑی فوج رکھنی پڑتی تھی
رات بھر جاگتے سپہ سالار
پھر بھی پڑتا تھا دشمنوں کا وار
یوں بھی ہوتا کہ ان کو دشمن سے
ہے تو حملے کا خوف دکھن سے
اور وہ پورب میں آپڑا دن سے
اُس طرف سے ہٹاؤ تو بدذات
پھر سمندر سے بڑھ کے کرتے گھات
راجہ دادون مارے غصّے کے
ایسا لاچار ہو کہ رو رو دے
اور جو چاہے کہ آنکھ لگ جاتی،
ایسی ہلچل میں نیند کیا آتی!
آخر اِک جیوتشی کو بُلوایا
کوئی ہرکارہ اس نے دوڑایا
اور مانگی مدد کہ راج گورو
کچھ بتا، ہے بڑا گیانی تو،
اُس گیانی نے، مردِ دانا نے
تار بجتے ہی راگ پہچانے
ساتھ لایا تھا اپنے اِک تھیلا
اس سے مرغا نکالا سونے کا
اور بولا! "حضور یہ لیجیے!
تیلیوں پر اسے بٹھا دیجیے!
ہے تو سونے کا جانور لیکن
پہرہ داری کرے گا رات اور دن
ہے اگر شانتی تو یہ مرغا
چونچ پَر میں دبا کے بیٹھے گا
پر کسی سمت سے ہوئی گڑبڑ
دشمنوں نے جو کی کہیں تڑ پھڑ
ہوا چانک اگر کہیں دھاوا
یا کوئی اور آپڑے بپتا
میرا مرغا پلک جھپکتے ہی

چونک اٹھے گا، اٹھائے گا کلغی،
بانگ دے دے کے پھڑپھڑائے گا
اُس طرف جھٹ سے گھوم جائے گا"
سُن کے ترکیب خوش ہوا راجہ
"جیوتشی، تونے کی بڑی کرپا
تجھ کو سونے میں لاد دوں تو سہی
آج کی بات عمر بھر کو رہی
پہلے جو مانگے تو، وہ تیرا ہے
ٹل نہیں سکتا حُکم میرا ہے"
مرغ بیٹھا جو اونچے اڈّے پر
خوب رکھتا تھا سرحدوں پہ نظر
کھڑکے پتّہ، جو ہو ذرا آہٹ
جیسے اٹھتا ہے سنتری جھٹ پٹ
یونہی مرغا بھی پھڑپھڑانے لگے
گھوم کر اُس طرف بتانے لگے
سر اٹھا کر پکارے "ککڑوکوں،
چَین سے راج کر، میں پہرہ دوں"
تب پڑوسی بھی پڑ گئے ٹھنڈے
کون اٹھاتا لڑائی کے جھنڈے
ہر طرف سے لگائی ایسی چوٹ
پٹ گئی دشمنوں کی ایک اِک گوٹ
اک برس گزرا، دوسرا گزرا
چونچ ڈالے کھڑا رہا مرغا
(عیش کی راتیں، امن چین کے دن
چھوٹے ہوتے ہیں، کہہ گئے پوشکِن)

ایک دم ایسی ہاہا کار مچی
اٹھ گئے ہڑبڑا کے چھتر پتی
سینا نایک پکار کر بولا:
"راجہ، مالک ہمارے، ان داتا
اٹھ مصیبت سروں پہ آئی ہے
تیری پرجا پتی دہائی ہے"
راجہ دادون نے جماہی لی۔
پوچھا: "کیا ہے رے، ایسی کیا بیتی؟"
بولا سیناپتی "غضب سرکار
مرغ سونے کا کر رہا ہے پکار
راجدھانی میں غل غپاڑا ہے
بھیڑ بکری کا جیسے باڑا ہے"
جا کے کھڑکی کے پاس دیکھا تو
کوئی دورہ پڑا تھا مرغے کو
مارتا پر، کبھی اُٹھاتا موں
کر کے پورب کی اور ککڑوکوں
پھر تو راجہ نے دیکھا آؤ نہ تاؤ:
"ہاں، جوانو سوار ہو جاؤ!
دیر کیا ہے سنبھال لو گھوڑے
ہاں بڑھالو، نکال لو گھوڑے"
عمر میں جو بڑا تھا راجکمار
وہ بنایا گیا سپہ سالار
فوج پورب کے راستے ہو لی
مرغ کی بند ہو گئی بولی
راجہ پرجا نے بھی کمر کھولی

اب سنو آٹھ دن گزرنے پر
جب نہ لشکر کی آئی کوئی خبر
نہ یہ معلوم، رن پڑے کہ نہیں
جن کو بھیجا تھا وہ لڑے کہ نہیں
تب تو بے چین ہو گیا راجہ
اور اُدھر مرغ بانگ دینے لگا
پھر چُنا دوسرے رسالے کو
ایک للکار دی، کہا "جاؤ!"
چھوٹا بیٹا رسالدار کیا
اور بڑے کی کمک پہ بھیج دیا
مرغ چپ ہو گیا، رہا چُپ چپ
اِس طرف کا یہ حال، پھر گُپ چپ
پھر اسی طرح آٹھ دن گزرے
اور یہ بھی خبر کے بِن گزرے
اب کے راجہ بہت نراس ہوا
لوگ باگوں کو بھی ہراس ہوا
پھر وہ مرغا پکارا ککڑوکوں
تب تو راجہ نے دل میں ٹھانی یوں
خود ہی پورپ کی اور چلتا ہوں
لے لیا تیسرا رسالہ ساتھ
جانے کچھ آئے یا نہ آئے ہاتھ
رات دن فوج منزلیں مارے
چلتے چلتے نڈھال تھے سارے
نہ کہیں رن ملا نہ ہاہاکار
نہ لہو تھا، نہ لاش کے انبار

سوچے داداون اور دل دھڑکے
"ہائیں یہ کیا! کہاں گئے لڑکے؟"
(ڈگمگاتا، کبھی سنبھلتا جائے
سوچتا جائے اور چلتا جائے)
آٹھواں دن جو بیتنے آیا
اِک پہاڑی میں راستہ پایا
اونچے اونچے پہاڑ کا گھیرا
بیچ میں اس کے ریشمی ڈیرا
اور ڈیرے کے گرد کیا دیکھا:
ہو کا عالم، عجیب سنّاٹا
تنگ گھاٹی میں سب کی سب پلٹن
یوں پڑی، جیسے کٹ گیا ہو بَن
پاس ڈیرے کے جو نظر آیا
وہ سماں اور بھی بھیانک تھا
دونوں بیٹے پڑے تھے ننگے سر
اور تن پر نہ تھا زرہ بکتر
ان کی لاشوں میں تھی گڑی برچھی
ایک نے دوسرے کو گھونپی تھی
گھوڑے دونوں کے سبزہ زار کے پاس
چرتے پھرتے تھے روندی کچلی گھاس
گھاس کیسی، کہاں کی ہریالی!
تھی لہو کی جگہ جگہ لالی!
راجہ داداون بین کر کر کے
رو پڑا "ہائے رے مرے بچے!
ہائے دشمن نے جال میں پھانسا

میرے شکروں کو دے دیا جھانسا
چل بسے تم تو، چھوڑ کر مجھ کو
اب مری آخری گھڑی جانو!"
پھر تو سب روئے یوں گلے مل مل
درد سے پھٹ گیا پہاڑ کا دل،
گھاٹیوں کے لرز گئے سینے
زور سے آہ کھینچی وادی نے۔
اتنے میں ایک دم کھلا ڈیرا
جھانکا باہر کو چاند سا چہرا
تھی شماخان کی وہ شہزادی
چھب دکھائی شفق سی پھیلادی
یوں سواگت ادب کے ساتھ کیا
اس کو تکتا ہی رہ گیا راجہ
چار آنکھیں ہوئیں تو تھا گم سُم
جیسے سورج کے سامنے گلدم
دیکھ کر ایسا کھو گیا دادون
غم سے آزاد ہو گیا دادون
اور وہ راجہ کے سامنے جھک کر
مسکرانے لگی ذرا رُک کر
پھر بڑھی اور لے کے ہاتھ میں ہاتھ
لائی ڈیرے میں اس کو اپنے ساتھ
چن دیا اس کے آگے دسترخوان
میز پر اک سے ایک بڑھ کر خوان
کھا چکا تو اسے اٹھایا پھر
اِک چھپر کھٹ میں جا لٹایا پھر

رنگ رلیوں میں رات دن گزرے
اس طرح پورے سات دن گزرے
راجہ دادون ہو گیا لٹّو،
چل گیا اس پہ حُسن کا جادو
روز ڈیرے میں اک جھمیلا ہو
عیش ہو، دل لگی ہو، میلا ہو
گھر کو اب رخصتی کی بات چلی
پوری پلٹن لئے برات چلی
اور چلیں آگے آگے افواہیں
جتنے منھ اتنی باتیں لوگوں میں
راجدھانی کا تھا جو دروازہ
اس پہ لینے پہنچ گئی پرجا
جب براتی بڑھے نگر کی اور
ہر طرف تھا ہٹو بچو کا شور
رتھ میں راجہ تھا اور وہ ناری
پیچھے جنتا لگی ہوئی ساری
راجہ دادون نے کیا پرنام
اور پرجا کا جب لیا پرنام
ایک دم بھیڑ میں دکھائی دی
ہاتھ بھر کی سفید سی پگڑی
دور سے جیوتشی نظر آیا
اس کو بگلا بھگت بنا پایا
سر سے پاؤں تلک سفید لباس
دیکھتے ہی بلایا اپنے پاس
کر کے ڈنڈوت خیریت پوچھی:

"کہیے، اچھے تو ہیں سوامی جی؟
ہم کو سیوا کی آگیا دیجئے!
جو بھی کچھ حکم ہو بتا دیجئے!"
گیانی بولا کہ "سنیے ان داتا
آج بیباق کیجئے کھاتا
میں نے جب خوش کیا تھا، یاد ہے نا؟
آپ نے کیا کہا تھا، یاد ہے نا؟!
"پہلے جو مانگے تو، وہ تیرا ہے
ٹل نہیں سکتا حکم میرا ہے"
بس یہی پہلی مانگ ہے میری
جوشما خان کی ہے شہزادی
یہ مجھے بخش دیجئے سرکار!
وہ وچن یاد کیجئے سرکار!"
مانگ ایسی سُنی جو راجہ نے
سُن کے ہاتھوں کے اُڑ گئے طوطے
"کیا کہا؟" اس کو ڈانٹ کر پوچھا
عقل تو نے کہیں گنوائی کیا؟
تیرے بھیجے میں یہ سمائی کیا؟
اپنا وعدہ تو یاد ہے مجھ کو
پر ہر اک بات کی کوئی حد ہو
کیوں بھلا تجھ کو چاہیے لڑکی؟
(مجھ سے کرتا ہے ایسی گستاخی!)
کیا مجھے جانتا نہیں، ہوں کون؟
مہاراجہ، مہابلی دادون!
مانگنا ہے تو مانگ لے مجھ سے
سونے چاندی کی تھیلیاں بھر کے
کوئی منصب، کوئی بڑا عہدہ
شاہی اصطبل سے کوئی گھوڑا
اور تو اور، اپنا آدھا راج
تو جو مانگے تو بخش دوں گا آج
جیوتشی بولا "جی نہیں سرکار،
میں تو کھائے ہوں بس اِسی اُدھار
جوشما خان کی ہے شہزادی
آپ سے مانگتا ہے فریادی"
تھوکا راجہ نے، آگیا غصہ:
"ہِشت! ایسا کبھی نہیں ہوگا
تجھ کو ملتا بھی تھا تو اب نہ ملے
خیریت ہے اسی میں، لب نہ ہلے
ہاں خبردار، دیکھتے کیا ہو!
سامنے سے ہٹاؤ بڈھے کو!"
چاہتا تھا الجھ پڑے گیانی
پر الجھنا ہے ایسی نادانی
بعض اوقات مہنگی پڑتی ہے
(بات کرتے میں، ہاتھ جُڑتی ہے)
راجہ دادون نے اٹھایا گُرز
اس کے مستک پہ یوں جمایا گرز
وہ گرا جا کے چاروں شانے چِت
نہ رہا سانس، اور نہ سانس کا ہِت
راجدھانی تو ساری کانپ گئی
اور لڑکی ہنسے، ہاہا، ہی ہی۔

جانے والا گزر گیا جی سے
کوتی مرتا ہے، اُس کی جوتی سے
یوں تو خود ہی دَہل گیا راجہ
مسکرا کر بہل گیا راجہ
رتھ چلا پورے تام جھام کے ساتھ
شہر میں آئے دھوم دھام کے ساتھ
اتنے میں ایک دم ہوئی چھن چھن
سب کی آنکھوں کے سامنے فوراً
پَر پھیلاتا ہوا اڑا مُرغا
اُڑ کے اڈّے سے رتھ پہ جا پہنچا

ٹھونگ سر پر لگائی راجہ کے
اور مُکٹ پر جما لیے پنجے
جان لیوا تھی مرغ کی ہر ٹھونگ
رتھ سے راجہ گرا، ہوئی ہڑبونگ
اور ہڑبونگ میں وہ شہزادی
گم ہوئی، دے کے سب کو بربادی
ڈھونڈنے پر کہیں ملی ہی نہیں
ایسی غائب ہوئی کہ تھی ہی نہیں

من گھڑت ہو تو ہو کہانی میں!
پر نصیحت ہے نوجوانی میں۔

وہ دن آئے گا ہمدم

ترانے یہ محبت کے، یہ اُمیدوں کی شہنائی
یہ خاموشی سے بڑھتی شہرتوں کی جلوہ آرائی
یہ رنگیں دل ربا دھوکے ہمیں اپنا نہیں پائے
یہ بہلاوے بہت دن تک ہمیں بہلا نہیں پائے
کوئی دم میں جوانی کا فریبِ آرزو ٹوٹا
حقیقت جب کھلی، تو یوں طلسمِ رنگ و بو ٹوٹا
کہ جیسے انکھڑیوں سے خواب کوئی دور ہو جائے
دھندلکے چھٹ گئے آنکھوں سے جھوٹی آرزوؤں کے
ہمارے دل میں لیکن زندگی کی شمع روشن ہے
ہوا کیا وقت کے منحوس فولادی شکنجے میں

اگر اپنی تڑپتی روح کا خاموش مسکن ہے
ہماری روح پھر بھی گوش بر آواز رہتی ہے
کہ ہونٹوں پر وطن کے ہر گھڑی فریاد و شیون ہے
اُمیدیں مضمحل ہیں، پھر بھی آزادی کے لمحے کا
اسی بے تاب شدّت سے ہمیں ہے انتظار اب تک
جو خاصہ ہے فقط ایسے مچلتے نوجوانوں کا
جسے تڑپا رہا ہو وعدۂ دیدارِ یار اب تک
ابھی رگ رگ میں اپنی، زندگی کی آگ باقی ہے
ابھی تو آبرومندی کا دل میں راگ باقی ہے
تو آؤ دوست اس اپنی زمیں کو اک چمن کر دیں
ابلتے ولولوں کی زندگی نذرِ وطن کر دیں
یقیں رکھنا مرے ہمدم یقیں اس جہد پیہم کی
وہ تارا جو ہر اک دل کو خوشی سے گھیر لیتا ہے
وہ تارا زندگانی کے افق پر جلوہ گر ہوگا
ہمارا روس جو مدّت سے گہری نیند سوتا ہے
یکایک جاگ جائے گا جو اعلانِ سحر ہوگا
نظامِ کہنہ سے ٹوٹے ہوئے اک ایک ٹکڑے پر
ہمارا اور تمھارا نام ہی زیب نظر ہوگا

ترجمہ: جاں نثار اختر

جن کا اس کتاب میں خصوصیت سے ذکر آیا ہے

حکمراں

(۱) پیوتر اوّل (پیٹر اعظم) (۱۶۷۲ - ۱۷۲۵ء)

روسی تاریخ کی سب سے اہم، دلکش، قدآور اور صاحب جلال شخصیت "پیوتر (پیٹر، پیٹر، پیروی)"، جس نے روس کو موجودہ دنیا کی زبردست سلطنت بنانے میں اہم رول ادا کیا، دس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اورنگ زیب کے پوتوں کا یہ ہم عصر اکبر اعظم کی طرح باقاعدہ تعلیم سے محروم ہونے کے باوجود نئے تمدن کا حامی اور تہذیب کے رنگارنگ فروغ کا دلدادہ تھا۔

۱۶۹۶ء میں تخت کے دوسرے دعویداروں کا خاتمہ کر کے خود مطلق العنان فرماں روا بن گیا، جاگیردارانہ نظام کی جڑیں مضبوط کرنے میں اس نے ملک کی معاشی اور سیاسی مرکزیت کے لیے ہر ممکن تدبیر کی۔ روس میں یوروپی تمدن کی تحریک چلانے سے پہلے ۱۶۹۷ء میں بھیس بدل کر یورپ کا سفارتی سفر کیا۔ دو سال کی بظاہر سفارتی سیاحت میں جدید ساخت کی جہاز سازی سیکھی، فوجوں کی، تجارتی اسکیموں اور شہر سازی کی تنظیمی قابلیت حاصل کی۔ جب واپس آیا تو ڈاڑھی صاف تھی اور کپتان کی وردی نے شاہی ملبوس کی جگہ لے لی تھی۔ واپس آتے ہی اس نے نئے قوانین بناکر کسانوں اور ان کی املاک کو جاگیرداروں کے قبضے میں دے دیا اور خالصہ کی جاگیرداریاں قائم کردیں۔ تجارت اور صنعت کے فروغ کے لیے نہ صرف قانون جاری کیے بلکہ سڑکیں، شہر، کارواں سرائے اور گودام بنوائے۔

۱۷۰۳ میں سینٹ پیٹر سبورگ نام کا شہر دریائے نیوا کے دہانے عین سمندر پر قائم کیا تاکہ اسکینڈی نیویا اور شمالی یورپ کے ملکوں سے تجارت بڑھے اور روس قدیم ایشیائی لبادہ اتار کر یوروپی تجارت وصنعت کے میدان میں اترے۔

یورال میں صنعتی سرگرمی اسی کے اہتمام سے شروع ہوئی، ۲۰۰ کارخانے بنے، نہریں کاٹ کر دریا ملائے گئے۔ ۱۷۱۲ء میں پائے تخت ماسکو سے نئے شہر سینٹ پیٹر سبورگ منتقل کر دیا گیا۔ مذہبی اصلاحات نافذ کر کے

اسقف اعظم کی مرکزی حیثیت ختم کردی گئی۔ روس کو پچاس صوبوں (گوبرینا) میں تقسیم کیا گیا (۱۷۱۹ء) مرکزی نظام حکومت اور باقاعدہ تنخواہ دار فوج کی تنظیم کی بدولت روس کو شمال اور جنوب میں (سوئیڈن اور ترکی کے خلاف) جنگوں میں فتح نصیب ہوئی۔ خود پیٹر فوجوں کی سپہ سالاری کرتا رہا۔

پہلا روسی اخبار اسی کے حکم سے نکلا۔ جرمن اداکار اور ڈائرکٹر بلائے گئے کہ تھیٹر کی تنظیم کریں، اکادمی علوم قائم ہوئی۔ غیر ملکی ادب کے تراجم کا کام بڑھا۔ وہ خود ہر ایک علم سے دلچسپی رکھتا تھا اور اکبر کی طرح توپیں ڈھالنے، جہاز اور کارخانے بنوانے میں محو ہو جاتا تھا۔ وہ سلطنت کی توسیع میں فوج اور جدید سائنس دونوں کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔

پوشکن کے ہم عصر بیلنسکی نے لکھا ہے کہ پیٹر اعظم کے مجسّمے صرف پیٹروگراد کے ساحل پر نہیں، پورے ملک کے ایک ایک چوک میں نصب ہونے چاہئیں۔ روسی تاریخ میں وہی پوشکن کا ہیرو ہے۔

(۲) ایکاترینا دوم (۱۷۹۶ - ۱۷۲۹ء)

بڑی تعلیم یافتہ اور بیدار مغز سیاست داں زارینہ شمار ہوتی ہے۔ اول اول اس نے اہل قلم کی سرپرستی کی۔ رسالے نکلوائے، اسی کے دور میں اشاعتی ادارے، پریس، ترجمہ مرکز قائم ہوئے۔ تعلیم کا چرچا ہوا۔ نووی کوف نے روسی مصنفین کی پہلی تاریخی فرہنگ لکھی جس میں ۳۱۷ قلم کاروں کا تذکرہ تھا۔ اوپیرا اور ڈرامے کی تحریک چلی، اور اسی کے زمانے میں روشن خیال آزادی پسند مصنفین کو جینا دوبھر کر دیا گیا۔ نووی کوف جو خود ایک نہایت کامیاب طنز نگار، اڈیٹر، تذکرہ نویس، پبلشر، ماہر تعلیم اور سماجی مصلح کی حیثیت سے ابھرا تھا، بار بار ضبطیوں اور جرمانوں کی سزا پانے کے بعد آخر قید بامشقت کا شکار ہوا۔ اس کی ساری املاک ضبط کر لی گئی۔

ایکاترینا دوم نے انقلاب فرانس کے مخالفین کی مدد کی۔ پولینڈ کی تحریک آزادی کو مسلح دخل اندازی سے دبا دیا۔ پولینڈ کا بٹوارہ کرایا جس کے نتیجے میں مغربی یوکرین، بیلوروس، استھونیا اور بالٹک کے ساحلی علاقے روس نے قبضا لیے۔ پولینڈ کا جداگانہ ریاستی وجود ختم ہو گیا۔ اس کی دورخی، مکاری، عیاشی اور سیاست کے افسانے آج تک مشہور ہیں۔

(۳) پاویل اوّل (۱۸۰۱ - ۱۷۵۴ء)

ایکاترینا دوم کا بیٹا اور ولی عہد ماں کی موت ۱۷۹۶ء کے بعد تخت پر بیٹھا۔ تخت نشینی کے فوراً بعد اس نے مصنف نووی کوف کو قید سے رہائی دی۔ بظاہر وہ ایک ہوشیار حکمراں تھا۔ اس نے فرانس سے تعلقات بڑھائے، فوجی طاقت بڑھائی۔ جارجیا (گرجستان) کا مشرقی علاقہ ایران سے چھین کر روس میں ملا دیا۔ اٹلی اور سوئٹزرلینڈ پر فوجی مہم بھیجی، اس کے دور میں کسانوں پر مظالم اور بڑھ گئے۔ ۶ لاکھ لاکھ کمیرے جاگیرداروں کو بانٹے گئے۔ روسی

زبان کے واحد خبرنامے "روسکوئے ویدمستی" میں اس مفہوم کے اشتہار چھپتے تھے کہ جوان ملازم اور اس کی عورت ۵۰۰ / ۴۰۰ روبل میں فروخت کرنے ہیں۔ چودہ پندرہ سال کی تین لڑکیاں بکاؤ ہیں، جو گھریلو خدمت اور سارنگی بجانا جانتی ہیں۔ ذیل کے پتے پر سودا کیا جائے۔ بعض اوقات گھوڑا مع ساز کی قیمت ان عورتوں کی قیمت سے کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ اشرافیہ طبقہ قانونی طاقت استعمال کر کے من مانی کرتا تھا۔

روس ایک زرعی ملک کی حیثیت سے برطانیہ کو مال بیچنا چاہتا تھا، جونہی پاویل نے برطانیہ سے تعلقات بگاڑے، امیروں نے سازش کر کے ۱۲ مارچ ۱۸۰۱ء کی رات میں اسے قتل کر دیا۔ اور فوراً اس کے بیٹے الیکساندر کی تخت نشینی کا اعلان ہو گیا جو ۲۵ سال تک حکومت کرتا رہا۔

ایسی افواہیں معاصر ادب میں داخل ہو گئی ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ باپ کے قتل میں بیٹے کا ہاتھ تھا۔ پوشکن کی ایک نظم میں بھی یہ اشارہ ملتا ہے۔

(۴) ارک چیئیف (۱۷۶۹ - ۱۸۳۴ء)

مشہور زمانہ ابن الوقت وزیر جنگ اور وزیر داخلہ۔ پاویل اوّل کے زمانے میں توپ خانے کی انسپکٹری سے ترقی کرتے کرتے ۱۸۰۸ء میں وزیر جنگ کے عہدے پر پہنچ گیا۔ بادشاہ کو اس کی جلّادی اور ہوشیاری پر اتنا بھروسہ تھا کہ الیکساندر اول نے ایک کے بعد ایک اہم خدمت اسے سونپی اور وہ اس بے درد شہنشاہ کی ناک کا بال بن گیا۔ ملکی سیاست و حکومت کی باگ ڈور کم و بیش ۲۰ برس اسی کے ہاتھ میں رہی۔ جہاں کہیں بغاوت کی چنگاری اٹھتی، وہ خود فوجی وردی کسے ہوئے پہنچ جاتا اور سرکشی کے شبہ میں چن چن کر پھانسی کی سزا دیتا۔ کسان اُسکے نام سے نفرت کرتے تھے۔ ارک چیئیف پر، جو اپنے دورِ اقتدار میں "آدم خور" کہلانے لگا تھا، پوشکن اور ریلیئف دونوں نے پھبتیاں اور ہجویں لکھی اور پھیلائی ہیں۔

وہ اپنے دستخط کرنے سے پہلے اوپر لکھ دیا کرتا تھا۔

شہنشاہ کا سچا جاں نثار، نمکخوار۔

پوشکن نے اس ہجو میں وہی اشارہ رکھا ہے۔

(۵) بینکن دورف (۱۷۸۳ - ۱۸۴۴ء)

نپولین کے خلاف جنگ میں شریک ہو کر نام کما چکا تھا۔ طبیعت سے خفیہ پولیس کا اور لباس سے فوجی افسر ثابت ہوتا تھا۔ اس نے ۱۸۲۱ء میں ہی زار الیکساندر کو خفیہ سیاسی سرگرمیوں اور سازشوں کی خبر دے دی تھی؛ اور دسمبری بغاوت کے دن بادشاہ کی طرف سے پلٹن لے کر نکلا۔ بعد میں پھانسی کی سزائیں دلوانے اور جلاوطن کرانے میں اس کے مشوروں کا دخل تھا۔

شہنشاہ نکولائی کا معتمد خاص بن گیا۔ پولیس اور خفیہ کے محکمے ہاتھ میں لے کر اس نے روسی دانشوروں اور آزاد خیالوں کی زندگی عذاب کر دی۔ ایک ایک حرکت پر نظر رکھتا، پریس، ادب اور سیاست میں تنخواہ دار ایجنٹوں کو آگے بڑھاتا۔

کہتے ہیں کہ پوشکن اور ریلیئف کو ڈوئل میں قتل کرانے کا ذمہ دار یہی شخص تھا۔

(۶) وُرنتسوف (۱۸۵۶ - ۱۷۸۵)

اس خاندانی نام کے کئی منصبدار گزرے ہیں۔ یہ منصبدار انگلستان میں روسی سفیر رہا اور اپنی عادات و آداب سے "لارڈ" کہلانے لگا ۲۱ سال تک جنوبی روس کے "ممالک محروسہ" میں گورنر جنرل رہا۔ اس کا شاندار محل اب تک یالٹا میں بستی سے دور سمندر کنارے قائم اور سنسان پڑا ہے۔ پوشکن نے اس کی کئی ہجویں لکھیں۔ ایک خط میں (جو ڈاک والوں نے کھولا) لکھا تھا: میں اس افسر یا اس افسر کے ہاضمے کی خوبی یا خرابی کے سہارے جینے سے تنگ آ گیا ہوں۔

(۷) یرمولوف، جنرل (۱۷۷۲ - ۱۸۶۱)

روسی توپخانے اور پیدل فوج کا مشہور کمانڈر جو نپولین کے مقابل معرکوں میں نام کما چکا تھا۔ عمر کا بیشتر حصہ (۱۸۱۶ء سے) جنوب میں گزرا۔ قفقاز میں جابجا اس نے قلعے بنوائے، چوکی پہرہ بٹھایا اور شورہ پشتوں کو طاقت سے، ورنہ رسم و راہ بڑھا کر رام کیا۔ ایران میں روس کا سفیر بھی رہا اور ایرانی فوج کو قفقاز میں بڑھنے نہیں دیا۔ وہ اپنے جوانوں میں ہر دل عزیز تھا۔

جنوبی دسمبریوں کا در پردہ ارادہ تھا کہ سازش کامیاب ہو گئی تو حکومت کی باگ ڈور اسی کو دی جائے۔ اسی شبہ میں اتنے بڑے جنرل کو بادشاہ نے معزول کر دیا۔ پوشکن نے نثر و نظم میں اس کا کئی جگہ شان سے ذکر کیا ہے۔

غیر ملکی فنکار، دانشور

(۸) رفائیل (۱۴۸۳ - ۱۵۲۰ء)

اطالوی مصور سانتی رفائیل پوشکن کی طرح عمر کی صرف ۳۷ بہاریں دیکھ سکا لیکن ذاتی مشاہدے یا لمحاتی کیفیت کو ایسی عمومی تصویر کے سانچے میں ڈھال گیا کہ مصوری کے علاوہ خود شاعری اس سے متاثر ہوتی رہی ہے اور عالمی تہذیب نے یوروپی نشاۃ ثانیہ میں انجیلی علامتوں کی تصویر کشی کے ساتھ رفائیل کو ہمیشہ کے لیے اپنا لیا ہے۔ نوعمر بی بی مریم کا تصور اس نے ایسے نازک اور پاکیزہ نقوش میں اتارا کہ دنیا کے مختلف نگار خانوں میں سجی ہوئی "میدونا" کی مختلف تصویریں کنوارپن کی لطافت، حسن کی نفاست اور ماہتا کی نورانی مسرت کا ایک نادر نمونہ

بن گئی ہیں، ان سے رفائیل کا نام اور اس کے فنکارانہ تصور کی رفعت ونزاکت اُبھرتی ہے۔ پوشکن نے چار تحریروں میں رفائیل کی عظمت کا اعتراف اور اس کی "میدونا" کے تاثر کا اعلان کیا ہے۔

(۹) **شکسپیئر** (۱۶۱۶ - ۱۵۶۴ء)

پوشکن نے کم ازکم ۴۱ مقامات پر شکسپیر کا ذکر کیا ہے، کرداروں کی تہہ میں اُترنے اور انہیں پھیلانے میں وہ شکسپیر کو بے مثل شمار کرتا ہے۔ اس نے اوّل فرانسیسی ترجموں میں، پھر اصل انگریزی میں شکسپیر کا مطالعہ کیا۔ شکسپیر ۱۸ ویں صدی کے وسط میں روس پہنچا۔ "ہیملٹ" کا پہلا روسی ترجمہ ۱۷۴۸ء میں ہوا تھا۔ ٹھیک چار سال بعد کرامزین نے شکسپیر کے "جولیس سیزر" کا لفظ بلفظ ترجمہ کر کے زباندانی کا سکہ بھی بٹھادیا اور ادبی روسی کو وسعت بھی بخشی۔ اسی دور میں شکسپیر کے اہم ڈرامے براہ راست انگریزی سے روسی میں منتقل ہو رہے تھے۔ ۲۰ ویں صدی میں بوریس پسترناک نے شکسپیر کے ایسے اعلا اور شاعرانہ ترجمے شائع کیے کہ وہ روسی ادبیات کا جزوِ بدن بن گئے۔ جو کام پسترناک نے چھوڑا تھا، وہ مرشاک نے انجام دیا۔

(۱۰) **ملٹن** (۷۴ - ۱۶۰۸ء)

سورداس کی طرح وہ بھی پیدائشی نابینا نہیں تھا۔ ۴۴ برس کی عمر میں کثرت مطالعہ اور بیماری نے آنکھوں کی روشنی چھین لی اور اپنی بہترین، طویل، بیانیہ، فلسفیانہ نظمیں زبانی بول کر لکھوانی پڑیں گی۔ "گم شدہ جنت" اور "بازیافتہ جنت" عالمی شاہکار (۱۶۶۷ - ۷۱ کے) چار سال میں مکمل کیے۔ خانگی زندگی دکھی گزری۔ ۳ بار شادی کی مگر اس تعلق سے خوش نہ رہا۔ بچپن میں فقہ کی تعلیم پائی تھی۔ پھر فقہ کے بجائے فلسفے، تاریخ اور سیاست سے دل لگایا۔ ۱۶۴۸ء کے انقلاب انگلستان میں عملی شرکت کی۔ کراموبل کا حامی تھا۔ علمی مضامین، سانیٹ اور نظموں کے علاوہ کتابچے بھی لکھے۔ شہری اور مذہبی آزادی کے لیے لڑا، آخر میں مسیحی اخلاقیات وتصوف کا قائل ہوگیا اور اپنے شاہکاروں کے لیے انجیل کی ہی اصطلاحوں سے کام لیا۔ پوشکن نے دنیا کے چار بڑے شعرا میں ملٹن کو شامل کیا ہے۔ جا بجا ملٹن کا ذکر اس کی تحریروں میں ملتا ہے۔

(۱۱) **والٹر سکاٹ** (۱۸۳۲ - ۱۷۷۱ء)

اسکاٹ لینڈ کا مشہور انگریزی شاعر جس نے بحیثیت تاریخی ناول نگار شہرت پائی۔ ناول نگاروں کی سوانح حیات تنقیدی حاشیوں کے ساتھ سلسلہ وار شائع کی، سخت محنت، تلاش اور مناظر قدرت سے وابستگی اور اس کے دلکش بیان میں عمر بسر کی، ۴۸ برس کو پہنچتے پہنچتے سر والٹر اسکاٹ کا نام انگریزی اور فرنچ جاننے والی تمام دنیا دنیا میں پھیل چکا تھا۔

پوشکن کے بچپن میں اس کا نام اور کام روس پہنچا۔ زار نکولائی نے پوشکن میں شاعری اور تاریخ د

افسانہ کی لگن کو نظر میں رکھ کر یہ چاہا تھا کہ وہ روسی شہنشاہوں کا والٹر اسکاٹ بن جائے۔ پوشکن نے جی لگا کر اسکاٹ کا مطالعہ کیا لیکن اس کی رنگین، شاعرانہ منظر کشی کے مقابلے میں وہ دیسی اور اصلی منظر کو مختصر سیدھے صاف طریقے سے لکھنا بہتر سمجھتا تھا۔

(۱۲) مولئیر (۷۳ - ۱۶۲۲ء)

ژاں باپتست مولئیر فرانسیسی ڈرامہ نگار، جسے دنیا کے صف اول کے ڈرامہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی تھیٹر کا شوق تھا، وکالت کے بجائے اسی کو اپنا فن ٹھیرایا۔ تھیٹریکل کمپنی قائم کی، ناکام رہا، اطالوی داستانوں اور ان کی مزاحیہ نقلوں کو اسٹیج تک لایا۔ ملک بھر میں گھومتا رہا، بالآخر ڈیوک آف آرلین کی مدد لے کر اس نے پیرس کے سب سے اہم تھیٹروں، خصوصاً پیلے رایال - Palace Royal میں ڈرامے پیش کیے۔ فرانس میں اور باہر اس کا شہرہ ہوگیا۔ وہ بیک وقت ایکٹر، منیجر، ڈرامہ نگار، طنز نگار اور درباردار تھا، شب و روز تھیٹر کے کاموں میں منہمک رہتا تھا۔ تھیٹر کی ایک کارکن سے اس نے غیر سرکاری شادی کی، بدنام ہوگیا۔ کئی بدنامیوں اور سرگرمیوں کے نرغے میں آپ نے ایک لافانی ڈرامے Le Malade Imaginaire میں "آگاں" کا رول کرتے ہی تھک کر گرا اور ختم ہوگیا۔

پوشکن اس کا بڑا مداح تھا۔

(۱۳) اندرے شینئے (۹۴ - ۱۷۶۲ء)

اپنے وقت کا نہایت خوش رو، خوش گلو اور خوش گو فرانسیسی شاعر، جس نے شاعری اور مصوری کا شوق اپنی ماں کے دیوان خانے سے پایا۔ غیر معمولی ذہانت اور قابلیت نے ۲۵ برس کی عمر میں اسے ہمعصروں میں ممتاز کر دیا۔ لندن کے فرنچ سفارت خانے میں سکریٹری رہا۔ کلاسیکی یونانی ولاطینی ادبیات پر گہری نظر رکھتا تھا۔

اول انقلابی خیالات کی حرارت جذب کی؛ پہلے کسانوں کی بدحالی کے خلاف قلم اٹھایا اور پھر کسانوں کے لیڈروں کی بے رحمی کے خلاف۔ مرات اور رابس پیری کے اندھا دھند تشدد کی مخالفت میں اس پر برائے نام مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا پائی۔ شینئے، جس پر پوشکن نے (۱۸۲۵ء) میں ایک نظم بھی لکھی تھی (...... مگر تو، آزادی کی دیوی تو بہرحال پاک پاکیزہ، تیرے دامن پر (خون کا) کوئی داغ نہیں ....) ۲۰ - ۱۸۱۹ء میں روس کے رومانی انقلابیوں میں باغیانہ شاعری اور آزادانہ قربانی کا ایک نشان سمجھا جانے لگا۔ اس کے طرز بیان میں بے قراری اور شیفتگی کے ساتھ جور جادو، لوچ اور سوز پایا جاتا ہے، اس نے پوشکن سمیت ہمعصروں کو متاثر کیا اور خود فرانس میں وہ کلاسیکی اور رومانی شعرا کے درمیان کی نہایت حساس کڑی شمار ہونے لگا۔

(۱۴) والٹیئر (۱۶۹۴-۱۷۷۸ء)

فرانسیسی ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار، مفکر، جس نے ۲۲ برس کی عمر میں پیرس کی بیسٹیل جیل میں رہ کر اپنا پہلا المیہ ڈرامہ Oedipe لکھا جو سال بھر بعد اسٹیج پر نہایت کامیاب رہا۔ دوبارہ اپنے ایک شاہکار Heuriade سے شہرت وقبول عام بھی پایا اور سزائے قید بھی۔ جیل سے نکل کر انگلینڈ چلا آیا۔ کئی سال وہیں رہا۔ ۱۷۴۵ء میں اسے فرانس میں وہی دو عہدے پیش کیے گئے جو ۱۹۲۸ء میں پوشکن کو نصیب ہوئے تھے۔ شاہی مورخ اور دربار کا حاضر باش، پانچ سال بعد شاہ پروشیا کے بُلاوے پر برلن چلا آیا۔ یہیں اس نے اپنا زبردست علمی کارنامہ "فلسفے کی فرہنگ" شروع کیا۔ یہاں بھی اہل اقتدار سے رنجش ہو گئی تو برخاست کر دیا گیا۔ جنیوا میں رہنے کا ٹھکانا کر لیا۔ یہیں اپنا ادبی کارنامہ Candide لکھا۔ ۱۷۵۹ء انتھک علمی و ادبی سرگرمیوں میں اور خوش حالی و رسوخ کی زندگی بسر کرنے والے والٹیئر نے اپنے آزادی پسند ذہن اور کٹیلے طنز کے سبب جابجا جھگڑے مول لیے اور بالآخر معاصرین کے خیالات میں ہلچل ڈال دی۔ پوشکن نے کئی جگہ والٹیئر کا نام لیا ہے...... اس کے چودہ ہزار چٹیلے خطوط اور دو ہزار کتابوں، کتابچوں کی ہیبت پوشکن پر بھی طاری ہوئی تھی، لیکن آخری برسوں میں وہ والٹیئر کی گہری تشکیک اور طنزیہ مزاحیہ رنگ میں فلسفہ طرازی کا قائل نہیں رہا۔ سیاست، فلسفہ، مذہب اور آرٹ پر والٹیئر کی تحریریں بہرحال انقلابی ذہن کی تربیت کرنے اور ملک کی ذہنی فضا بدلنے میں کارگر ثابت ہوئیں۔

(۱۵) وکٹر ہیوگو (۱۸۰۲-۱۸۸۵ء)

فرانسیسی ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار اور سماجی اصلاح کا علم بردار، مشرقی شاعری کی لہر میں وہ بھی گوئٹے کا شریک تھا۔ خاندانی وجاہت اور تعلیم کا تقاضا تھا کہ فوجی افسر بنے لیکن ۱۸ برس کو پہنچتے ہی شاعری اختیار کر لی۔ ۲۱ سال کی عمر میں تین شعری مجموعے نکل چکے تھے کہ ناول میں مصروف ہو گیا اور فوراً "کرامویل" نام کا نہایت کامیاب اسٹیج ڈرامہ دیا۔ عالمی ادب میں اس کا ایک کارنامہ تاریخی ناول Note demede Paris ۱۸۳۱ ہے۔ آزاد تھیٹر میں تن من دھن سے لگا رہا اور کئی معرکے سر کیے۔ پوشکن کو اس کا "کرامویل" نہیں جچا۔ البتہ مشرقی رنگ کے دیوان میں بیان کی نرمی اور سوز اسے جی جان سے پسند تھا۔

وکٹر ہیوگو اپنی اصلاحی تحریکوں اور تحریروں کی بدولت، پھانسی کی سزا کے خلاف ایجی ٹیشن پھیلانے کے سبب عوام میں بہت مقبول تھا۔ پیرس سے پارلیمنٹ کے لیے چنا گیا۔ انقلاب حکومت ہوا تو جان بچا کر ملک سے نکل گیا۔ جلاوطنی میں پھر شاعری طاری ہونے لگی اور شاعر کو اس نے حق گوئی و بے باکی کا پیمبرانہ منصب سونپا یہاں تک کہ نوجوان روسی دانش وروں پر اس خیال کا اثر پڑا۔ ہیوگو نے شاعری میں اتنے تجربے کیے کہ بعد کے جدت پسند

شعرا کا خضرِ راہ شمار ہونے لگا، خود پوشکن نے اس کی تصانیف کا گہرا مطالعہ ضروری سمجھا۔ ہندوستان میں اس کے تین اہم ناولوں میں سے ایک Les Miserables مطبوعہ ۱۸۶۲ء کو شامل نصاب کیا جاتا ہے۔

وکٹر ہیوگو، جو فرانسیسی قاموسیوں میں آخری باوقار شخصیت تھا، پیرس واپس آنے پر کھویا ہوا وقار بڑھانے اور اہل قلم کا سماجی مرتبہ منوانے میں کامیاب ہوا۔ کہتے ہیں کہ پیرس میں جس دھوم سے اس کا جنازہ اٹھا کسی دانش وَر کا نہیں اٹھا تھا۔

(۱۶) گوئٹے (۱۸۳۲-۱۷۴۹ء)

شعرا میں بے تاج بادشاہ اور بادشاہوں میں جرمنی کا عظیم شاعر۔ جس نے قانون کی تعلیم بھی پائی، وکالت اختیار بھی کی لیکن عشق اور شعر دونوں جذبوں سے بے اختیار ہو کر بالآخر شاعری اور تھیٹر کو اپنا لیا اس نے نہایت مصروف انتظامی، سائنسی اور فنّی زندگی بسر کی۔ ایک نواب نے اسے ویمر کی چھوٹی سی ریاست کا اہم عہدہ سپرد کر دیا اور وہیں سپرد خاک ہوا۔

اطالیہ کے سفر نے اس کے خیالات کو بہت متاثر کیا۔ اس نے سائنس کی ہر ایک شاخ میں گہری نظر ڈالی، اور اپنے ڈراموں، خطوط، مضامین، گفتگوؤں میں (جن کا ریکارڈ موجود ہے)۔ یہاں تک کہ شاعری میں اس کی شعاعیں ڈالیں ۔ وہ ایک آفاقی نظر، عالمی شخصیت اور ہمہ گیر شہرت کا ایسا شاعر گزرا ہے جس نے یہ اصول دریافت کیا کہ عالم موجودات کے مظہر میں ایک ایسی تکمیلی روح جاری وساری ہے جو تمام علوم و فنون کو ایک ہی لڑی میں پرو دیتی ہے۔ پوشکن اپنے اس ہم عصر کا بڑا عقیدت مند تھا۔ وہ دانتے، شکسپیر، ملٹن اور گوئٹے کو صف اول کے تہذیبی رہنماؤں میں گنتا ہے۔ "فاؤسٹ" کے کردار اور گوئٹے کی بصیرت نے پوشکن کے تخیل میں بھی رنگ گھولا تھا۔

(۱۷) ژاں ژاک روسو (۱۷۷۸-۱۷۱۲ء)

۱۸ ویں صدی نے عالمی تہذیب کو جو نادر روزگار شخصیتیں دی ہیں، ان میں فرانس کا یہ ادیب، عالم اور فلسفی بھی ہے جس نے مفلسی، لاوارثی آوارہ گردی سے سبق لیا، زندگی بھر ناجائز تعلقات یا بے جوڑ شادی بدزبانی اور خانماں بربادی کے تیر سہے، چالیس سال کو پہنچ کر اسے نام اور مقام نصیب ہوا۔ والتیر کی طرح وہ بھی تھیٹر کی تحریک کا متوالا اور با اثر تھا، لیکن والتیئر کے خیالات کا مخالف۔

اس نے تہذیب کے پردۂ شکنجوں کے خلاف "انسانی فطرت مبنی بر خیر" کا وہی نعرہ نئے استدلال کے ساتھ بلند کیا جو قدیم مذاہب بلند کر چکے تھے۔ نئی طرزِ تحریر و طرزِ فکر کے نقیب روسو کی تصنیف Du Contrast Social (معاہدۂ عمرانی) کا لُبِّ لباب خود اسی کتاب کا یہ جملہ بیان کر دیتا ہے۔

انسان آزاد پیدا ہوا لیکن ہر جگہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے اور پھر آزادی کا ورثہ جیت سکتا ہے - یہ اُن دو تصنیفوں میں شامل تھی جس کے کارن روسو کو وطن سے فرار ہونا پڑا۔ پہلے سوئٹزر لینڈ، پھر انگلینڈ گیا اور ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ مگر توازن کھونے سے پہلے اپنے اور بعد کے دَور کو متاثر کرنے والی کتاب اعترافات Confessions لکھ لی تھی۔ پوشکن نے کوئی دس بار روسو کا نام لیا اور اسے بائرن سے بلند مرتبہ ادیب شمار کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

> ماؤیش یوجین کے ہاں اپنی صدی کا تمام فرانسیسی فلسفہ جھلک رہا ہے۔ والتیئر کی تشکیک Scepticism روسو کی خدمتِ خلق ....

(۱۸) **بائرن** (۱۷۸۸ - ۱۸۲۴ء)

لارڈ جارج نوئیل بائرن - عالی خاندان، خوش شکل، جامہ زیب، اعلا تعلیم یافتہ اور سرکش۔ ۲۳ برس کی عمر میں اس نے اپنی شہرۂ آفاق نظم چائلڈ ہیرالڈ کا سفر The Journey of Child Herald کے دو کینٹو شائع کیے تو دھوم مچ گئی۔ یکے بعد دیگرے درجنوں معاشقے، ناکامیاں، رسوائیاں، بے باکانہ لب ولہجہ غیر معمولی وضع قطع اس کی شخصیت کا ہالہ بنتے چلے گئے۔ مشرقی قصے Oriental Tale اور ڈون جوآن Don Juan نے (جس میں الٰہیات، مسائل حاضرہ اور اخلاقیات سے بحث کی گئی ہے) اس کی مقبولیت اور بداخلاقی دونوں پر ایک ساتھ مہر لگا دی۔ پہلے ہی انگلینڈ سے بیزار ہو کر اطالیہ چلا آیا تھا۔ جب یونانیوں نے ۱۸۲۲ میں ترکوں کے خلاف بغاوت کی تو وہ اس آگ میں کود پڑا۔ دو سال بعد عین بخار اور بحران کی حالت میں ایک پہاڑی پر گھر کر ہلاک ہو گیا۔ لاش لندن لائی گئی لیکن بدچلنی کا جو داغ لگ چکا تھا، اس کے کارن ویسٹ منسٹر کے شاہی قبرستان میں نہ دفنائی جا سکی۔

پوشکن تین سمتوں سے متاثر ہوا تھا: سرفروشی کی تمنا، آزادی کا جنوں۔ تمنائی اور بیانیہ انداز، انفرادی وجود کی عظمت و برتری کا احساس۔ مگر پوشکن نے بہت جلد بائرن کی ڈرامائی نظموں کی خامی پکڑ لی اور اس کے اثر سے مُنکر ہو گیا۔ خطوں میں جا بجا بائرن کا ذکر، اس سے اپنی ابتدائی محبت اور بعد کی بے نیازی کا چرچا کیا ہے۔

۱۸۲۵ء اپریل میں جب بائرن کے انتقال کو سال پورا ہوا، پوشکن نے اپنی تمام غیر مذہبی زندگی کے باوجود، میخائیلوفسکوئے کے پادری کو بلا کر بائرن کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے فاتحہ دلوائی، برسی منائی اور دوستوں کو اپنی اس عجوبہ حرکت کی اطلاع بھیجی۔

(۱۹) قرآن کی نقل میں (۱۸۲۹ - ۱۸۲۱ء)

باضابطہ روسی گرامر شائع ہوئے صرف ۳۳ سال ہوئے تھے کہ وِیردکین نے کلاسیکی روسی میں قرآن کا ترجمہ پیش کر دیا ۱۷۹۰ء ، ۱۹ ویں صدی کے آغاز میں اُن نوجوانوں نے جو دَرپردہ بات کہنے کے لیے کلاسیکی "بلاغت" سے کام لینا چاہتے تھے، یہ رنگ بہت مقبول ہوا، گویا اس نے انجیل کے انداز بیان میں ایک رنگ کا اور اضافہ کر دیا۔

۱۸۲۲ء میں کوخیل بیکر نے اسی مشرقی الوہی انداز میں ایک نظم لکھی "پیغمبری" (Пророчество)

پوشکن نے اپنی زندگی کے سب سے کڑے دنوں (ستمبر، نومبر ۱۸۲۴ء) میں قرآنی سورتوں کا مطالعہ کیا اور اُنہیں اپنایا مسلسل کئی نظموں کو اس نے 'برنگ قرآن' قرار دیا ہے۔ مثلاً ایک نظم پیغمبریوں شروع ہوتی ہے۔

کیا ہم نے تجھے عین تشنگی کے عالم میں
ریگ زار کے پانی سے سیراب نہیں کیا؟

دوستوں کے نام بعض خطوط میں بھی یہی طرز بیان اختیار کیا گیا ہے یوں گویا سنجیدگی پر مزاح کا ہلکا سا نقاب ڈالنے کی کوشش ہے۔

پوشکن کی نظم "پیغمبر" انجیل کے باب عیسائیہ Isaiah اور قرآنی سورۃ السرح؛ آیۃ ۹۴ کا مرکب معلوم ہوتی ہے۔

دوسرے بعض مقامات پر بھی اس رنگ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

روسی شخصیات

(۲۰) بوریس گودونوف (اندازاً ۱۶۰۵ - ۱۵۵۱ء)

روسی تاریخ میں شیر شاہ سوری کی سی ہیبت، تدبیر، حوصلہ اور ناکامی کی ملی جلی شخصیت بوریس ایک جاگیردار کے منصب سے بڑھ کر شاہی تخت و تاج کا مالک ہوا (۱۶۰۵ - ۱۵۹۵ء) نہایت تعلیم یافتہ، باخبر اور دور اندیش سپہ سالار، جس نے چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں اور منصب داروں کا زور توڑ کر روس کو ایک مرکزی سلطنت بنانے، اس کی معیشت کو ترقی دینے، سڑکیں بنوانے، دور دور نئی بستیاں آباد اور سلطنت کے حدود سے مخالفانہ طاقتوں کا توڑ کرنے میں عمر صرف کر دی۔ سرحدی قلعے بنوائے۔ بادشاہ کی بیٹی سے شادی کی، پورے ملک کی زمین نپوا کر لگان بندی کی۔ کمیرے کسانوں پر بندشیں لگائیں۔ سوئیڈن سے لڑ کر شمالی سرحدیں طے کرائیں اور کرامیا کے تاتاری خانوں کے حملے بند کیے۔ اس کے آخری دور میں قحط پڑا، کسان بغاوتیں ہونے لگیں۔ اور پولینڈ سے ایک سپہ سالار

دیمتری نے تاج وتخت کی وراثت کا دعوا کرکے ماسکو پر چڑھائی کی۔ بوریس گودونوف عین اسی ہنگامے میں مرگیا اور ماسکو پر پولینڈ کی فوج کا قبضہ ہوگیا۔ پوشکن نے اسی کی ٹریجیڈی کو اپنے ڈرامے کا موضوع بنایا ہے۔

(۲۱) استیپان رازین

یہ روسی تاریخ کے اُن تین بڑے سرغنہ باغیوں میں سے ہے جو کسانوں کے غم وغصّے کو براہ راست صف آرائی تک پہنچانے کی بدولت انقلابی دانش وروں کی توجہ کا مرکز بنتے رہے ہیں۔ دریائے دون کے کنارے ایک قزاق گاؤں میں پیدا ہوا جہاں سے ایک صدی بعد باغی پگاچیوف اٹھا۔ قزاقوں اور ترکوں میں اکثر جنگ رہتی تھی۔ اس نے کرامیائی "تاتاریوں کے خلاف قلماقوں سے معاہدہ کیا، پھر سفارت کے فرائض انجام دیتا رہا، شہرت پائی۔ ماسکو کے سفر میں اس نے روسی آقاؤں کے ہاتھوں قزاق سپاہیوں کی دُرگت بنتی دیکھی اور اس کے بھائی کو پھانسی دی گئی تو واپسی پر اس نے جنگجو، سرکش قزاقوں کی گروہ بندی کرلی اور کمال دانشمندی کے ساتھ دریائے دون اور وولگا کے شاداب علاقوں میں ہولناک بغاوت پھیلادی (۷۰ - ۱۶۶۷ء) - ایک بڑے معرکے میں شکست کھانے کے بعد دوبارہ صف بندی کرکے اپنے دیہات میں آیا تو خوشحال زمینداروں نے دھوکے سے گرفتار کرادیا۔ ۶ / جون ۱۶۷۱ء کو ماسکو کے چوک میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ یادگار باقی ہے۔

(۲۲) لومونوسف (۶۵ - ۱۷۱۱ء)

میخائیل واسیلی ویچ لومونوسف۔ سائنس داں، مصنّف، نحوی، عروضی، شاعر، اور جدید روس کی عظیم الشان سماجی شخصیت، جس کی کوشش سے بقول پوشکن "ہماری پہلی یونی ورسٹی ۱۷۵۵ء میں) قائم ہوئی، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ بذات خود ہماری پہلی یونی ورسٹی تھا۔"

مچھیرے کے گھر میں جنم لیا، بچپن افلاس میں گزرا۔ جرمنی میں یونی ورسٹی کی تعلیم لینے گیا، وہاں جبری فوجی بھرتی میں آگیا، فرار کرکے روس آیا۔ یہاں اکادمی علوم کا ممبر چنا گیا۔ پیٹر اعظم پر ایک طویل نظم جو ناتمام رہ گئی، اس کا شاعرانہ کارنامہ شمار ہوتی ہے۔ روسی زبان کو انجیل اور مذہبی قصّوں کے اسٹائل سے آزاد کرکے ایک شاندار اور پُراثر طرز دینے میں اس کا بڑا دخل ہے۔ نقاد بیلنسکی نے اس کی واجب قدروقیمت جتائی ہے یہ کہہ کر کہ "ہمارا ادب لومونوسف سے شروع ہوتا ہے؛ وہ اس کا باپ بھی تھا، پالنے والا بھی؛ وہی روسی ادب کا پیٹر اعظم تھا۔" عمر وفا کرتی تو تمام علمی دنیا میں والتیئر اور ردسو کے درجے کا آدمی شمار ہوتا۔ موجودہ ماسکو یونی ورسٹی اسی کے نام سے منسوب ہے۔

(۲۳) رادیشِ چیف (۴۹ - ۱۸۰۲ء)

انقلابی ذہن کا ایک ذی علم، اہل قلم - جاگیردار خاندان میں پلا بڑھا۔ لائپزگ یونی ورسٹی (جرمنی) میں

قانون کی تعلیم پائی۔ تاریخ، فلسفہ، قدرتی سائنسوں اور ادبیات کے پاکیزہ ذوق نے نگاہ کو وسعت بخشی، والیتر، روسو اور دیدرو جیسے فرانسیسی روشن خیالوں نے طبیعت کو صیقل کیا اور جب اپنے وطن واپس آیا۔ ۱۷۷۱ء تو سماجی حالات کی بے دردی نے غور و فکر اور قوت اظہار میں چنگاری ڈال دی۔

سرکاری محکموں میں اونچے درجے کی ملازمت ملی تھی۔ جو وقت دفتر سے بچتا، فرانسیسی سماجی ادب کے ترجمے پر صرف کرتا۔ بعض الفاظ، مثلاً "شخصی حکومت (آٹوکریسی) کی وضاحت کرنے میں اس کے قلم نے دل کی لگی ظاہر کر دی۔ وزارت مالیات میں بھیجا گیا، وہاں اس نے کسانوں کی تباہ حالی، ان کے پورے پورے خاندان کی خرید و فروخت اور فوج میں جبری بھرتی دیکھی، رنگروٹ جوانوں کو میدان جنگ سے فرار کرتے اور پھر اس کی ہولناک سزائیں پاتے دیکھا، کسان بغاوتوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا تو رگِ حمیت پھڑکی اور اس نے اصلاحی اور انقلابی حلقوں سے اندرونی تعلق اور قلمی رشتہ قائم کر لیا۔

کئی سال متواتر لکھنے کے بعد رادیشچیف نے ۱۷۸۹ء میں اپنا شاہکار "پیترسبورگ سے ماسکو کا سفر" لکھا اور گھر کے پریس میں نجی طور پر ۶۵۰ کاپیاں چھاپ کر بانٹ دیں۔ ایکاترینا کو خبر پہنچی۔ باغیانہ تحریر کے جرم میں مصنف گرفتار ہوا۔ سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ عوامی لہر سے خائف ہو کر ملکہ نے موت کو دس سال قید بامشقت اور جلاوطنی سے بدل دیا۔ وہاں بھی مصنف کا قلم تیزی سے چلتا رہا۔ ملکہ کی موت کے بعد اسے رہائی ملی اور قانون ساز کمیشن کی ممبری بھی لیکن اس دور میں ہر وقت سر پر تلوار لٹکی رہتی تھی۔ تنگ آ کر اس نے (۱۸۰۲ء میں) خودکشی کر لی اور روسی انقلابی ادب کے پہلے شہید کی حیثیت سے لافانی ہو گیا۔

(۲۴) فان ویزن (فون وی زن) (۱۷۴۵ - ۹۲ء)

روس کا دوسرا روشن خیال ڈرامہ نگار جس نے فرانسیسی ڈرامہ نگار مولیئر کے طرز (آداب معاشرت اور رسوم کی مضحکہ خیزی) کو اپنا کر اپنا پہلا ڈرامائی کارنامہ "بریگیڈیر" (سرپنچ) لکھا اور اسٹیج کرایا۔ پھر "نابالغ" لکھا اور پیش کیا اور یوں پوشکن کے خیال میں فان ویزن کی کامیڈی نے روسی اسٹیج کو فرانسیسی معاملہ بندی، نزاکت اور اس کے بندھنوں سے آزاد کرا دیا۔ بلکہ ایکاترینا دوم اس کی صلاحیتوں سے خوش لیکن طنزیات سے برہم تھی۔ آخری سال مصیبت میں گزار کر، خطوط، نامکمل ڈراموں اور ڈائریوں کا ایک قابل قدر ذخیرہ اور نشانِ راہ چھوڑ گیا۔

پوشکن نے فان ویزن کی سوانح حیات مرتب کرنے پر اپنے دوست ویازیمسکی کو اکسایا بھی، مدد بھی کی۔

(۲۵) ہیرتسن (گیرتسن) (۱۸۱۲ - ۷۰ء)

ماسکو کے ایک دولتمند زمیندار خاندان میں پیدا ہوا۔ ماسکو یونی ورسٹی میں داخل ہوتے ہی اس کے جوہر

کھُلے اور انقلابی خیالات رکھنے والے نوجوانوں کا حلقہ بن گیا، سن گُن ہوئی تو اسے شمال کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ ۱۸۳۹ء میں ماسکو واپس آیا، قلم سنبھالا اور سنسر کے ہاتھوں تنگ آ کر ۸ سال بعد ہمیشہ کے لیے سرزمین روس سے نکل گیا۔ باہر جا کر اس نے اپنے فلسفیانہ، سیاسی، تاریخی اور ادبی نظریات کو بے روک ٹوک روسی زبان میں پھیلانا شروع کیا۔ آزاد منش اہل قلم کے جائے پناہ لندن میں ہیرتسن نے اپنا پریس قائم کیا اور رسالہ نکالا؛ "Kolokol" (گھنٹی) جو غیر قانونی طور پر روس میں لایا جاتا تھا۔ مارکس کے ساتھ جیسے اینگلس کا نام جڑا ہوا ہے۔ یوں ہی ہیرتسن سے اس کے دوست اور ہم قلم شاعر اگاریوف کی وابستگی ہے۔ اس رسالے نے روس میں کسانوں کی غلامی قانوناً ختم کرانے کا ایجی ٹیشن کامیابی سے چلایا اور ۱۸۶۱ء میں قانون پاس ہو جانے کے بعد اثر کم ہو گیا۔ اپنے دوست اور مفرور، جلا وطن انقلابی باکونین کے نراجی اور دہشت پسند فلسفے سے اور مغرب میں سرمایہ داری کے عام رجحان سے اُکتا کر اس نے زرعی قسم کی اشتراکیت کا خیال پھیلایا اور وقت کے بہترین انقلابی دماغوں اور رہنماؤں سے مناظرے کیے۔ مناظروں کے مضامین کے مجموعے شائع ہوتے رہے، روسی ذہنوں میں اشتراکی خیالات کی لہر دوڑاتے رہے۔

ہیرتسن کو ایک انقلابی (غیر مارکسی) دانشور شمار کیا جاتا ہے جس کی مفکرّانہ سوانح حیات "ماضی اور افکار" روسی ادب و سیاست کا ایک سُبجل ستون ہے۔ آجکل ہیرتسن کے نام کی یادگاریں روس کے بڑے بڑے شہروں میں قائم کی گئی ہیں۔

(۲۶) دِرژاوِن (جرژاوین) (۱۸۱۶ - ۱۷۴۳ء)

تاتاری نسل کا یہ روسی شاعر ایک ایسا مُجدّد ہے جسے اپنے ہم عصر میر تقی میر کی طرح خدائے سخن کا درجہ حاصل ہے۔ باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کے باوجود اس نے ادب کے کلاسیکی سرچشموں سے سیرابی حاصل کی۔ کم و بیش پندرہ سال فوج میں رہا۔ تمغے پائے، موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار رہ کر شاعری میں اپنے دور کی نئی آواز دریافت کی اور یوں شدید جذباتی کیفیت کے اظہار کے لیے شاعری کو انجیل کے شاندار تقدس سے بے نیاز کر کے زندہ زبان کے قریب لایا، غنائی آہنگ بخشا، آدمی اور خدا کے رشتے پر عمر بھر کے فکر و فن کا حاصل پیش کیا۔ بلکہ ایکاترینا دوم (جو اس کی بڑی قدرداں تھی) کا ایک طویل طنزیہ قصیدہ لکھا جس میں ہجو ملیح پائی جاتی ہے "فی لیت سا" عنوان کا یہ قصیدہ اور "آبشار" نام کا مجموعہ کلام شائع کر کے اس نے ادب کو مستقل پیشے کا اور بے تکلف روسی زبان کو ادبی زبان کا وقار بخشا۔

(۲۷) کرامزین (۱۸۲۶ - ۱۷۶۶ء)

اگر نکولائی کرامزین نے ۱۲ جلدوں میں سرزمین روس کی پہلی مستند تاریخ نہ لکھی ہوتی تب بھی وہ ایک مُصلح

زبان ، بہترین ادبی مترجم ، سیاح ، انشا پرداز ، ماسکو اخبار کے بانی ، باوقار علمی شخصیت اور اپنے دور کے ادبی رہنما کی حیثیت سے زندہ رہتے ۔ کرامزین کی پہلودار اور وزنی خدمات میں درژادین اور ژوکوفسکی کی سرگرمیوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹ ویں صدی کی آخری دہائی میں روسی زبان و ادب نے صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا اور اپنے فرانسیسی ہمعصروں کی صف میں جگہ بنالی ۔ شاعری ، مختصر افسانہ ، کرداروں کا گہرا مطالعہ ، مغربی ادبیات کا شائستہ لب و لہجہ ، سفرنامہ ، قواعد کی اصلاح و ترقی اور زبان کی وسعت کے لحاظ سے کرامزین کی دین اپنے ہمعصر سید انشا سے کہیں زیادہ اور سنجیدہ ہے ؛ ذہانت ، جدت پسندی اور وسعتِ نظر میں انہی کی طرح شاہ پسندی کے باوجود بے باک اور کارگر ۔

(۲۸) کری لوف (۱۸۴۴ - ۱۷۶۸ء)

۱۸۰۹ء میں ایوان کری لوف نے " قصوں " کا مجموعہ " باسنی " شائع کیا تو سارے روس میں دھوم ہو گئی کیوں کہ اس میں طنز ، مزاح ، کلاسیکی الفاظ ، عوامی قصے کہانی کی سادگی ، بیان کی سلاست ، محاوروں کی گھلاوٹ اور کرداروں کی تصویر سب کچھ یکجا ہو گیا تھا ۔ کری لوف کے قلم نے " باسنی " یا قصے کو ادبی چاشنی دیکر روسی ادب کی حقیقت پسندی اور سادگی میں ایک مستقل صنفِ سخن کا اضافہ کر دیا اور اس کے جملے زبان زد ہو گئے ۔ فرانسیسی " لافون تین " اور سعدی کی " گلستاں " دونوں کے رنگ کو کری لوف نے روسی کرداروں کی جیتی جاگتی تصویروں ، حماقتوں بدعنوانیوں کے تمثیلی بیان کے لیے کامیابی سے استعمال کیا ہے ۔

(۲۹) ژوکوفسکی (۱۸۵۲ - ۱۷۸۳ء)

شاعری کرامزین نے بھی کی ، درژادین نے بھی ، لیکن دونوں کے بہترین تجربوں اور جدید عناصر کو یکجا کر کے آگے بڑھایا ژوکوفسکی نے ، جو کئی زبانوں کا عالم ، ادبی مترجم ، ادیبوں کا سرپرست اور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا ۔ وہ اپنی طبیعت سے صلح پسند ، صلاحیت سے ایک غنائی شاعر ، انتہائی جذباتی مگر متوازن شخصیت اور روسی ادبیات کو جرمن ، انگریزی ، فرانسیسی اور فارسی کے شہپاروں سے مالامال کرنے والا ، ایثار پیشہ ہر فن باکمال اہل قلم تھا ۔ پوشکن جیسا خود نگر خود گو ۔ بڑے فخر سے " ژوکوفسکی کا شاگرد " کہتا رہا اور اس پر کفِ افسوس ملتا رہا کہ ژوکوفسکی ، جس نے بائرن کی بعض نظموں کا (مثلاً شائلون کا قیدی) ترجمہ کر کے انہیں اصل سے زیادہ دلآویز بنا دیا ، اوریجنل لکھنے کے بجائے ترجمے پر کیوں وقت ضائع کرتا ہے ۔

(۳۰) تورگینف (۱۸۴۵ - ۱۷۸۴ء)

اس خاندانی نام کی تین ہستیوں نے شہرت پائی ؛ ایک نکولائی ، دسمبری جو سزایاب ہوا ، دوسرے ایکساندر ، جو پوشکن کے باپ اور چچا کا دوست ، اسے شاہی لیزیم میں داخلہ دلانے والا اور عمر بھر اس کا خیال رکھنے والا ترقی پسند

اہل قلم، جسے شاعر کے کفن دفن کی ذمہ داری سونپی گئی ـــ یہاں اسی کا ذکر آتا ہے۔ اور تیسرا روس کا شہرۂ آفاق افسانہ خواں، ناول نگار ـــ ایوان سرگے یچ تورگنیف جو دستوئیفسکی کا ہم عصر اور حریف تھا، جس نے سفرناموں، افسانوں اور ناولوں کے ذریعے روسی زبان کو ایک رسیلا انداز بیان دیا۔

(۳۱) **ارزماس** (۱۷ - ۱۸۱۵ء)

دریائے اوکا کی ایک شاخ "تیشا" کے کنارے روس کی قدیم بستی کا نام ہے جو فطرتی حسن اور مصوروں کے پسندیدہ مقام کی حیثیت سے مشہور ہے ترقی پسندوں کی روسی تحریک نے اپنے ادبی حلقے کا نام "ارزماس" یہیں سے لیا۔ میکسم گورکی کو ۱۹۰۱ء میں یہیں نظر بند یا جلاوطن کیا گیا تھا، اس نسبت سے اب اس کا نام گورکی ضلع رکھ دیا گیا ہے۔

(۳۲) **ویازیمسکی** (۱۸۷۸ - ۱۷۹۲ء)

عالی خاندان، جاگیردار، با اثر اور صاحب نظر اہل قلم، جو بیک وقت اوپر تلے کی دو نسلوں اور دو مخالف حلقوں کے درمیان ایک پُل تھا۔ کرامزین کی قرابت داری اور امارت نے اس کی سماجی حیثیت کو، انقلابی خیالات والوں سے میل جول نے روشن خیالی کو اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ وسیع معلومات نے اہل علم میں ادبی مرتبے کو ایسی ایک مستند پوزیشن دے دی تھی جیسی غالب کے دور میں نواب شیفتہ کو حاصل تھی۔ پرنس ویازیمسکی خستہ حال اہل قلم کا مددگار، پوشکن کا پشت پناہ، رئیسوں کا رقیب اور ہونہاروں کی ہمت افزائی کرنے والا ایک بانکا شاعر تھا جس کی شاعری کا ستارہ پوشکن کی دمک نے اور علمی سنجیدگی نے دھندلا دیا۔ مگر اس کے تنقیدی اور علمی مضامین کی ساکھ اپنے دور میں اور اس دور کے بعد آج تک قائم ہے۔

پوشکن نے اپنی زندگی، فکر اور فن کے ہر مرحلے میں اسے رازدار بنایا۔ ان دونوں کی خط و کتابت اس دور کی ادبی تاریخ کا ایک معتبر ماخذ بن گئی ہے۔ جس میں تمام مسائل پر بے تکلفانہ بحث اور اطلاع ملتی ہے۔

(۳۳) **بستوژوف** (۱۸۳۷ - ۱۷۹۷ء)

پوشکن کا ہم عمر، ہم عصر اور ہم خیال الیکساندر بستوژوف (اسی نام کا ایک اور دسمبری سرفروش ریومن بستوژوف تھا جسے باغی رجمنٹ کا سرغنہ ہونے کے جرم میں پھانسی دی گئی)۔ الیکساندر بستوژوف دسمبریوں کی در پردہ ترجمانی کے لیے ۲۵ - ۱۸۲۳ء میں ریلئیف سے مل کر "قطبی ستارہ" نکالتا تھا جس کی پہلی ہی اشاعت نے وہ اہمیت حاصل کی جو ہمارے ہاں کرشن چندر کے "نئے زاویے" کو ملی۔ گرم مضامین اور سازشی ہونے کے جرم میں جلاوطن ہوا، پھر سائبیریا سے قفقاز بھیج دیا گیا۔ جہاں اس نے رومانی داستانیں لکھیں۔ اس کے طویل، لچھے دار افسانوں میں "امالت بیگ" بہت مشہور ہے۔ نظم کے بجائے نثر کی ترقی پر زور دیتا رہا اور خود نئے قسم کی علمی انشا پردازی کے نمونے چھوڑے۔

(۳۴) برا تینسکی (۱۸۰۰ - ۴۴)

دورِ پوشکن کا سب سے اہم اور نازک خیال شاعر؛ اس کی نسبت پوشکن سے وہی ہے جو مومن کی غالب سے۔ فطرت کے حسن کا، ارضی لذتوں کا اور زندگی کی رومانی اداسی کا ترجمان۔ اگرچہ بعد میں اس کے نغمے گائے جانے لگے، تاہم محفلوں کے بجائے وہ خلوت کا، مفکرانہ دردمندی اور وجدانی کیفیت کا ایسا شاعر ہے جس نے کلاسیکی اور ہم عصرہ کر بھی اپنا لب و لہجہ، انتخاب الفاظ اور آہنگ اوروں سے الگ کر لیا۔ براتینسکی کا کلام غیر ملکی زبانوں میں منتقل نہیں ہوا البتہ ۲۰ ویں صدی کی جدید روسی شاعری نے اپنا شجرۂ نسب تیری کوف اور براتینسکی سے جوڑا ہے۔

(۳۵) باتیوشکوف (۱۸۵۵ - ۱۷۸۷ء)

پوشکن کے پیش رو شعرا اور بزرگ دوستوں میں ژوکوفسکی کے بعد اسی کا نام آتا ہے۔ بیان کے لوچ، تصویر کی دلکش تراش خراش اور آوازوں کی نرمی و سوز میں اس نے یونانی اور اطالوی فنکاروں کو اس قدر اپنایا کہ بالآخر روسی زبان کا "تنہا اطالوی شاعر" کہلایا۔ پوشکن کے اولین کلام میں باتیوشکوف کا اثر نمایاں ہے۔ زندگی سے ہر قسم کا رس نچوڑ لینے کی تمنا اس کے ہاں پوشکن سے بھی زیادہ شدید اور بیقرار ہے۔ ۱۸۲۱ء میں، جب اس کی شاعری شباب پر تھی، دیوانہ ہو گیا، باقی عمر جنون میں گزاری۔ پوشکن نے کئی نظموں میں اس کا ذکر کیا۔ یا اس سے خطاب۔

(۳۶) کوخیل بیکر (۱۸۴۶ — ۱۷۹۹ء)

ڈلوگ اور چادائیف کی طرح یہ بھی پوشکن کے لڑکپن کے ان دوستوں میں تھا جو اس کی ذہنی تربیت میں شریک تھے۔ پوشکن اس کی شاعری کا نہیں تنقیدی نظر اور قابلیت کا بڑا قائل تھا۔ یہ روسی تہذیب میں رچے جرمن اجداد کی نسل سے تھا اور مغربی ادبیات در رجحانات پر گہری نظر رکھتا تھا۔ "بورس گودونوف" پر کوخیل بیکر کا دیباچہ ایک اہم دستاویز ہے جس نے بعد میں نوخیز ذہنوں کی تربیت کی۔

پوشکن اور کوخیل بیکر میں اکثر مناظرے کی نوبت آجاتی تھی، تاہم شاعر کو وہ بہت عزیز رہا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۵ء کو لیزیم کی سال گرہ والی یادگار نظم میں "بھائی، تصنیف اور تقدیر کا شریک" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ اس نے تنقیدی مضامین بھی لکھے، ڈرامے بھی، رومانی نظمیں بھی۔ مگر اس کی تحریروں کا کوئی مجموعہ ۱۹ ویں صدی میں شائع نہ ہو سکا اور بعد میں صرف پوشکن کے تعلق سے اسے شہرت ملی۔ اور کئی جلدیں شائع ہوئیں۔

(۳۷) پلیتنیئیف (۱۸۶۵ - ۱۷۹۲ء)

پوشکن کے ان قریبی دوستوں میں سے، نہایت ذی علم شاعر، بااثر اور عالی مرتبہ شخص تھا جو ہر مشکل میں اس کے کام آئے۔ پہلے ادبیات کا پروفیسر تھا، پھر پیتر سبورگ یونی ورسٹی کا وائس چانسلر مقرر ہوا۔ پوشکن کے

موت پراسی نے رسالہ "سوورمینیک" (معاصر) ۸ سال جاری رکھا۔ شاعر نے اس کے نام بڑے بے تکلف خط لکھے ہیں، لیکن تنقیدی تحریروں میں وہ ہم عصر انقلابیوں، خصوصاً بیلینسکی کے خلاف کمربستہ ہوگیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ روسی زبان بگاڑے دے رہے ہیں۔

(۳۸) گلینکا (۱۷۷۶ - ۱۸۸۰ء)

شاعر، مضمون نگار، مذہبی اور مزاحیہ نظمیں لکھنے والا، پوشکن کا ہمدرد فیودر نکولائی وِچ جسکی نظم "ترئکا" (تین گھوڑوں کی گاڑی) چلی" آج تک مقبول خاص وعام ہے۔ پوشکن اس کی شگفتہ طبیعت کا قدرشناس تھا لیکن افسردہ شاعری پر بری رائے رکھتا تھا' دوستی بہرحال برقرار رہی

اسی خاندانی نام کے تین آدمی ۱۹ ویں صدی میں مشہور ہوئے، تیسری شخصیت میخائیل گلینکا کی ہے جو اپنی صدی کا عظیم نغمہ نگار اور پوشکن نواز گزرا ہے، گلینکا کو پوشکن سے وہی نسبت ہے جو کندن لال سہگل کو غالب سے۔

(۳۹) بیلینسکی (۱۸۱۱ - ۱۸۴۸ء)

روسی ادب کا پہلا تنقید نگار، جس نے ادبی تنقید کو سماجی سائنس کا درجہ اور جداگانہ فنی رتبہ دیا۔ بچپن سے ہی مفلسی کا شکار رہا۔ ۱۸ برس کی عمر میں ماسکو یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور فلسفیانہ، سماجی سیاسی مباحث کے ایک حلقے کا مرکز بن گیا تیسرے سال یونی ورسٹی نے اس کا نام خارج کر دیا۔ یونیورسٹی سے نکل کر اس نے تنقیدیں، فنی تبصرے، تخلیقی جائزے لکھنے شروع کیے۔ شروع میں پوشکن کا مداح تھا، پھر سخت نکتہ چینی کی، اور اس کی موت کے بعد اس کی زبردست حمایت کرنے لگا۔

نئی صلاحیتوں کو ابھارنے اور تنگ نظری کے خیالات کا دنداں شکن جواب دینے میں وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے آگے اور قابل قدر شمار ہوتا تھا۔ کسانوں کی نیم غلامی کے خلاف، سنسر کے خلاف، ادیبوں کی ہیئت پرستی کے خلاف اس نے بہت کڑے مضامین لکھے۔ تنقیدی زبان کھردری مگر پُراثر ہے۔

نوعمر دستوئیفسکی، گوگول اور گنچراسوف کی ادبی حیثیت منوانے میں اس کے اولین مضامین اور ریڈیوڑیل نوٹ فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ پوشکن نے شروع سے اس کے قلم کی بے باکی، نکتہ رسی اور بصیرت کا خیرمقدم کیا اور چاہا کہ جو رسالہ "سوورمینک" نکالا ہے اس میں بیلنسکی شریک ہوجائے۔ اخبارات و رسائل سے بیلینسکی کے تراشے نکال کر پوشکن نے محفوظ کیے تھے۔ موت سے سال بھر پہلے خرابی صحت کی بنا پر وہ روس سے باہر نکل گیا، ورنہ گرفتار ہو جاتا۔ باہر سے ہی اس نے گوگول کے نام ایک خط لکھا جس میں گوگول کے آرٹ اور تصوف پر تنقید کرتے ہوئے گویا ایک ادبی وصیت نامہ مرتب کر دیا۔ بیلینسکی کے تنقیدی جائزوں نے نوجوان اہل قلم کا سماجی

اور فنی شعور بیدار کرنے میں ایسا انقلابی کارنامہ انجام دیا کہ مغربی ناقدوں نے اسے فنی حیثیت سے بے درد اور بے لوچ قرار دیا ہے۔ پرنس میرسکی نے تو اس کی نثر کو ہی مبالغہ آمیز، واہیات اور بے ڈھنگی ۔ یہاں تک کہ قطعی غیر علمی، غیر ادبی روسی نثر کہا ہے۔ اس کے مضامین اور خطوط کے مجموعے ماسکو سے گیارہ جلدوں میں چھپ چکے ہیں۔

(۴۰) **چادائیف** (۱۸۵۶ - ۱۷۹۴ء)

عہد پوشکن کی ایک اہم شخصیت، اہل قلم، مُفکّر، جس نے اپنے مطالعے اور بصیرت سے پوشکن کے ناپختہ ذہن کو فکری غذا مہیا کی اور شاعر اسے بڑے بھائی کی جگہ شمار کرتا تھا، کئی خطوں کے علاوہ تین نظمیں اسی کے نام ہیں۔ زارسکوئے سیلو میں جو خاص شاہی دستے کی رجمنٹ مقیم تھی، چادائیف اس میں افسر تھا۔ ترقی کر کے بعد میں کرنل ہو گیا۔ اپنے ادب، آداب، مطالعے، ذہانت، سرفروشی اور عمدہ چال چلن کی بدولت جنگ روس و فرانس کے بعد بادشاہ کی نظر میں چڑھا۔ ایک طرف اس کا تعلق انقلابی حلقوں سے تھا، دوسری طرف امرائے دربار سے گہری سوچ اور بے باک بیانی کے باوجود وہ قید و بند سے محفوظ رہا۔ اس کا اہم مضمون "ایک فلسفیانہ خط" شائع ہوتے ہی روس کی دنیائے ادب میں ہلچل مچ گئی۔ جس رسالے میں چھپا وہ حکماً بند کر دیا گیا۔ اڈیٹر جلاوطن ہوا اور مضمون نگار کو (جو ایک عالی نسب اور بااثر خاندان کا ہونہار فرزند تھا) خبطی قرار دے کر قابل معافی سمجھا گیا۔ کچھ دنوں وہ اپنی رجمنٹ سے معطل اور نظر بند رہا، پھر پابندی ہٹی تو اس نے قلم سنبھالا۔

۴۰ برس کی عمر کو پہنچ کر اس نے اول مغربی تہذیب و ترقی کی تبلیغ شروع کی اور پھر مسیحی تصوّف کی تلقین۔ انجام مسیحی تصوف پر ہوا۔

(۴۱) **لیرمنتوف** (۱۸۱۴ - ۴۱ء)

ماں کے سائے اور باپ کی شفقت سے محروم، بے پناہ ذہین اور تیز طبع لڑکا شروع سے خود رائے، ضدی اور خود پسند اٹھا۔ ۱۳ برس کی عمر سے شاعری شروع کی، ماسکو یونی ورسٹی میں تعلیم تمام کرنے سے پہلے ہی فوج میں کمیشن مل گیا۔ نوجوانی کی اٹھان اور موت کے بہانے، دونوں میں پوشکن کا ہم رنگ۔ ۲۱ برس کی عمر میں ایک رومانی مثنوی "حاجی ابرک" لکھ کر شہرت پائی۔ لیکن پوشکن کی موت پر اس کی شہرۂ آفاق نظم نے راتوں رات اسے جدید روسی شاعری کی امیدگاہ بنا دیا۔ لیرمنتوف اسی نظم کی پاداش میں تفقاز کے دور افتادہ مقام پر تقریباً جلاوطن کر دیا گیا۔ معافی ملی تو پیٹرسبورگ واپس آتے ہی پھر ایک ڈوئیل لڑ لیا۔ سزا میں پھر جنوب بھیج دیا گیا۔ وہاں پیاتی گورسک کے پہاڑی مقام پر ایک اور رقیبانہ ڈوئیل میں مارا گیا۔ آخری چار سال نہایت تیز رفتار اور شدید گزرے۔

(۴۲) **یزی کوف** (۱۸۰۳ - ۴۶ء)

یہ بھی دورِ پوشکن کا تیسرا اہم اور نمائندہ شاعر ہے (لیرمنتوف اور براتینسکی کے بعد)، اس کی موت پر

روسی شاعری کی سنہری کہکشاں (۱۸۰۳ء - ۴۳) بکھر گئی اور ایک دور تمام ہوا۔ پوشکن سے جدا اپنی روش بنانے والا یہ فطرت پرست رومانی شاعر پہلی بار دورپٹ کی جرمن یونیورسٹی میں طالبِ علمی کے دنوں میں پوشکن سے تری گورسکوئے والوں کے بنگلے میں ملا تھا۔ میرسکی نے لکھا ہے: "یزی کوف کی اوّلین نظموں کو، ہر اچھی شاعری کے سرپرست و قدرداں ژوکوگ سے داد مل چکی تھی۔ پوشکن اور اس میں دوستی کا رشتہ تو استوار نہ ہوا، تاہم پوشکن کو اس کی حیرت انگیز طباعی اور جدت پسند ذہانت نے بڑا قائل کیا۔ ۱۹ ویں صدی کی تیسری دہائی میں انقلابی چنگاریاں اُڑاتا اٹھا، بعد میں مسلک بدل دیا اور عیش پسندی، بیزاری اور جذباتی ہماہمی کا ترجمان بن کر رہ گیا۔ روسی شاعری میں اس کا الگ مقام ہے۔

(۴۳) گریبائیڈف (۱۷۹۵ء - ۱۸۲۹)

دُنیائے ادب میں کبھی کسی کو محض ایک مختصر سے منظوم ڈرامے پر ایسی پائیدار شہرت نہیں ملی۔ جیسی غیر معمولی ذہانت و ظرافت کے اس عالی خاندان ڈپلومیٹ کو۔ جس نے ۲۸ برس کی عمر میں اپنا بہترین کارنامہ "عقل کی بپتا" Горе от ума پیش کیا تو وہ قلمی نسخوں کی صورت میں شہر شہر پھیل گیا اور مصنف کی نا وقت موت کے چند سال بعد ہی سنسر نے اشاعت کی اجازت دی۔ وزارتِ خارجہ میں افسر کے عہدے پر رہتے ہوئے دسمبری نوجوانوں سے بھی اختلاط رکھتا تھا۔ لیکن فوجی گروہوں کے بل بوتے بغاوت کی کامیابی پر اس کا ایمان نہیں تھا۔ ۲۵ء کی بغاوت ہوئی تو سازباز کے شبہ میں گرفتار کر کے پائے تخت لایا گیا۔ ثبوت نہ ملنے پر رہائی ملی اور پھر کونسل جنرل بنا کر ترکی اور ایران کی سرحد پر بھیجا گیا، جہاں اس نے روسی اقتدار کا دائرہ بڑھاتے ہوئے ایران سے وہ صلحنامہ کیا جو تاریخ میں "ترکمان چائی" کا معاہدہ کہلاتا ہے۔ ایران میں بحیثیت مختار عام ریزیڈنٹ تعینات کر دیا گیا۔ ۱۸۲۷ء کہتے ہیں کہ کسی وزیر (ایران) کی بیٹی سے اس کی خفیہ تعلقات کی افواہ اُڑی، لوگوں میں اس معاہدے کا غصہ تھا ہی، عین محرم کے دنوں میں عزاداروں کے مشتعل جلوس نے روسی سفارتی مشن پر حملہ بول دیا اور گریبائیڈف مارا گیا۔ لاش تفقاز لائی گئی، وہیں دفن ہوا، یادگاریں پورے ملک میں ہیں۔

(۴۴) گوگول - نکولائی - (۱۸۰۹ء - ۵۲)

یوکرین کے قصباتی ماحول میں بسے ہوئے ایک روسی زمین دار خاندان کا چشم و چراغ، جس نے کم عمری میں ہی اہلِ نظر، خصوصاً دسمبری خیال کے دانش وروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسکول کی تعلیم تمام کر کے ٹیچر ہو گیا۔ لیکن چونکہ بچپن سے ہی یوکرینی قصباتی زندگی سے اس کے حسن اور درد سے نغمے اور ناہمواری سے گہری واقفیت رکھتا تھا، شعر گوئی سے شروعات کی، شاعری میں نہ پنپ سکا۔ پیٹرسبورگ میں ۲۱ برس کی عمر میں پوشکن سے تعارف حاصل کیا اور اسی نے طنز و مزاح لکھنے میں ہمت افزائی کی جس کی بدولت گوگول نے آگے چل کر نام و مقام

پایا۔ ۱۸۳۳ء میں پوشکن اور ہونہار گوگول کے تعلقات یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ وہ قدم قدم پر شاعر سے مشورے اور رہنمائی طلب کرتا۔ اصلاح کا اُمیدوار ہوتا۔ "انسپکٹر" اور "مُردہ روحیں" جیسے سماجی طنزیہ افسانے، جو آج تک زندہ اور تازہ دم ہیں، پوشکن کے ہی سُجھاؤ پر لکھے گئے تھے۔ ایک طویل افسانہ "ناک" جسے بعض لائق ہم عصر اڈیٹروں نے اشاعت کے قابل نہ جانا، پوشکن نے اپنے رسالے "سوویمینک" (معاصر) میں بڑی تعریفوں کے ساتھ شائع کیا اور اسے ایک اچھوتا ادبی کارنامہ قرار دیا۔

جس روز پوشکن ڈوئیل لڑنے کے لئے نکل رہا تھا، گوگول کے ڈرامے پر اس نے ادارتی نوٹ لکھا۔ گوگول دو سال پیٹرسبورگ یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر بھی رہا، مگر قدامت پرستوں کی تنقید سے تنگ آکر روس چلا گیا، بارہ برس یوروپ میں، خصوصاً روم میں گزارے، ۱۸۴۸ء میں یروشلم (فلسطین) کا سفر کیا جو عجب نہیں کہ روحانی تشنگی پر صیقل کر گیا ہو کیونکہ تبھی فرضی دوستوں کے نام اپنے "خطوط کے مجموعے" میں اس نے مذہبی صداقت، پاکبازی اور اخلاقیات کا پرچار کیا اور کیٹلی نکتہ چینی کا شکار بنا۔

"انسپکٹر"، "گرم کوٹ"، "مُردہ روحیں"، "خطوط" جیسے زندہ جاوید طنزیات کے علاوہ گوگول نے ایک ایسی رنگا رنگ، حقیقت پسند، شگفتہ، نوکیلی، اور تلخ ادبی کائنات تخلیق کی جس کا ہر ایک کردار اپنے تاریخی دور کے کریہ روسی ماحول اور مصنف کے بیباک قلم کی نشاندہی کرتا ہے مگر وہ اپنے کارناموں سے خود مطمئن نہ تھا۔ "مُردہ روحیں" کا حصہ دوم کا پہلا مسودہ لکھ کر چاک کر دیا، اور چھ سال بعد جب دوبارہ لکھا تو اسے جلا ڈالا۔ کچھ دِن بعد ۴۳ برس کی عمر میں خود بھی جان دے دی۔ کہتے ہیں کہ آخری دنوں میں اس پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ بیلینسکی جیسے مدّاحوں کی نکتہ چینی اور معاصرین کی مجرمانہ خاموشی نے بھی اس کے چڑچڑے پن کو بڑھا دیا تھا۔ آنکھ بند ہوتے ہی جدید روسی اہلِ قلم، خصوصاً دستوئیفسکی نے اس کی عظمت کا لوہا منوایا۔ اور اگلی نسل اس کے اثرات کے سائے میں پروان چڑھی۔

(۴۵) بلہارین (۱۸۵۹-۱۷۸۹ء)

پولش نسل کا روسی جرنلسٹ اور مُصنف۔ اپنے زمانے میں اہلِ قلم پر دہشت بٹھائے رکھنے، مقبول یا مردود بنانے والا یہ اجارہ دار جنگجو اہلِ قلم، آج صِرف پوشکن کا مُخبر، جانی دشمن یا بقول خود "حریف"، ہونے کی بدولت تاریخ ادب میں زندہ بچا ہے۔ بلہارین (دراصل "بلگارین") نے دو اور صاحبِ اثر جرنلسٹوں گریخ اور سنکوفسکی کے ساتھ گُٹ بنا کر ادب اور صحافت پر غلبہ پا لیا تھا، حکومت بھی دَر پردہ ان کی مالی اور انتظامی مدد کرتی رہتی تھی اس کے زنبورِ شمال۔ (سیویرنایا پچیلا) روزنامے کو ہی غیر ملکی سیاسی خبریں اور تبصرے چھاپنے کی اجازت تھی۔ طنزیہ ڈنک مارنے اور ادبی صحافت پھیلانے میں اس نے بڑا نام پیدا کیا،

BIBLIOGRAPHY

I	А С ПУШКИН	Полное собрание сочинение в десяти томах. Из-во Академии Наук СССР. Москва-Ленинград 1949.
2	П О МОРОЗОВА	Сочнеnія и Письма А С Пушкина. Томъ седьмой. С. Петербургъ. 1896
3	Д Д БЛАГОЙ В Я Кирпотина	Пушкин родоначальник новой русской литературы. Из-во Академии Наук СССР. 1941
4	АГГ ГРИБЕРГ	Библиография прозведений А С Пушкина и Литературы о нём. Из-во Академии Наук СССР 1951 Москва-Ленинград.
5	В П ВОЛГИН В В Виноградов итд.	А С Пушкин 1799-1949. Материалы Юбилейных Торжеств. Из-во Академии Наук СССР Москва-Ленинград 1951
6	Н С [illegible]КИН	Рассказы о Прижизненных изданиях Пушкина. Из-во Всесоюзно" книжно" палаты. Москва 1962.
7	Д Д БЛОГОЙ	Пушкин в портретах и иллюстрациах. Учебпед Из-во Ленинград 1954.
8	И ФЕЙНБЕРГ	Незавершенные работы Пушкина. Из-во Художественной Литературы. Москва 1958
9	С М ПЕТРОВ	Исторический Роман А С Пушкина. Из-во Академии Наук СССР. Москва 1958
10	Н В БОГОСЛО- -ВСКИЙ	Пушкинкритик. Из-во Художественной Литературы Москва 1950.
11	Д Д БЛОГОЙ	Творческий Путь Пушкина. /1818-1826/ Из-во Академии Наук СССР. Москво-Ленинград 1950
12	Д Д БЛОГОЙ	Творческий Путь Пушкина. /1826-1830/ [illegible] Советский Писатель. Москва 1967
13	В ЗЕЛИНСКІЙ	Русская Критическая Литература о Произведе-ніяхъ А С Пушкина. Часть Первая. Типографія Вильде, Малая Кисловка, Собственный домъ. Москва 1911.
14	А СЛОНИМСКИЙ	МастерствоПушкина. Из-во Художественной литературы. Москва 1959
15	Б П ГОРОДО- -ЦКИЙ	Лирика Пушкина. Из-во Академии Наук СССР Москва-Ленинград 1962
16	А Г ЦЕЙТЛИН	Пушкин. Сборник Критических Статей. Учпедгиз: Учпедгиз. Москва 1937
17	Л И Тимофеев	Основы Теории Литературы. Часть Первая

		Глава Вторая. Из-во Просвещение 1966
18	А СЛОНИМКСИЙ	Детство Пушкина. Из-во Детиив. Москва
19	М П АЛЕКСЕЕВ	Пушкин. Из-во "Наука". Ленинград 1972.
20	Б МЕЙЛАХ	А С Пушкин. Из-воАкадемии Наук СССР. Москва.- Ленинград 1949
21	К Н БЕРКОВА	Алексаидр Сергевич Пушкин. Из-во Художественной литературы. Мосвка 1937
22	Л ГРОССМАН	Пушкин. Из-воЦК ВЛКСМ "Молодая Гвардия" Москва 1960
24	Н Л БРОДСКИЙ В В Голубкова	Пушкин в школе. Из-во АКадемии Педагогических Наук РСФСР Москва 1951.
24	И СЕРГИЕВСКИЙ	А С Пушкин. Из-во Художественной Литера- -туры. Москва 1955.
25	В Д ЛЕВИН	Поэтическая Фразеология Пушкина. Из-во "Наука" 1969.
26 И	ИВАН НОВИКОВ	Пушкин в Изгнании. Из-во "КАРТЯ МОЛДОВ- -ЕНЯСКЭ". Кишинев 1959.
27	Б МЕЙЛАХ	Пушкин и Его Эпоха. Из-во ~~"Наука" 1969~~ Художественной литературы Москва 1958.
28	М М КАЛАУШИН ИТД	Пушкин и Его Время. Из-во государственного эрмитажа. Ленинград 1962.
29	М БАСИНА	Там где шумят михайловские рощи. Из-во Детской Литературы. РСФСР. Ленинград 1962
30	Н Л БРОДСКИЙ	Евгении Онегин роман А С Пушкина. Учебно-Педагогическое Из-Во. РСФСР. Москва 1950
31	А С ПУШКИН	Евгении Онегин. Из-во Десткой литературы РСФСР. Москва. 1957
32	Н Л БРОДСКИЙ	Евгении Онегин роман А С Пушкина. Из-во "Просвещение" Москва 1964.
33	В П КУЛЕШОВА	Белинский. Том 3. 1843-1848. Из-во Художественной Литературы. Москва 1948
34		Большая Русская Энциклопедия. Том 31-33 Из-во "Советская Энциклопедия". Москва
35--	Prof. M.R. Beckwuth	Pushkin the man and the artist The paisley Press, New York 1937.
36--	Iydia Lamberi	Pushkin Poet and Lover Francis Aldor Publisher(Aldus Publication Ltd)
37--	John Fennell	Pushkin. PENGUIN BOOKS 1964.
38-	D.S.Mirsky	Pushkin. Coerge Rourleuge and Sons,Ltd. New York EP Dutton and Co.1926.